سویرا

www.taemeernews.com

جدید فن کاروں کے خیالات کا سلسلہ

سویرا

(۱)

۱۹۴۶ء

ترتیب دینے والے :

- احمد ندیم قاسمی
- نذیر چودھری
- فکر تونسوی

دیال داس

لاہور

www.taemeernews.com

ترتیب

جان پہچان	ادارہ	۵
بات چیت	ادارہ	۷
مجھے بھی کچھ کہنا ہے		

مقالات:

ہندوستان کا مغربی ساحل	باری	۹
وطن پرست	پال رچرڈ	۳۰
ادب کا مادی نظریہ	ظہیر کاشمیری	۳۱
فکر کی شاعری	کنھیا لال کپور	۳۶
سوویٹ تمدن - ایک نیا تمدن	طفیل احمد	۴۱
افسانہ نگار اور جنسی مسائل	سعادت حسن منٹو	۵۳
اصلی اور بناوٹی ہندی	عندلیب شادانی	۵۷

منظومات:

روپ	فراق گورکھپوری	۷۲
تفاوت	احمد ندیم قاسمی	۷۳
مراجعت	منیب الرحمٰن	۷۵
رسموں کی محافظ	کیفی اعظمی	۷۸
امروز	مجید امجد	۷۹
جنبش	فکر تونسوی	۸۱
عورت	ظہیر کاشمیری	۸۳
سہرا گلزار ہے	اختر الایمان	۸۴
فلمی محبت	شاد عارفی	۸۵

دوہے	جمیل الدین عالی	۸۶
جاگیر	ساحر لدھیانوی	۸۷
تسلسل	مخمور جالندھری	۸۹
خیالات	علی سردار جعفری	۹۱
تجدید	قتیل شفائی	۹۲
چکورا اور چاند	مقبول حسین احمد پوری	۹۴
تمثیلِ حیات	عبدالمتین عارف	۹۵
شیطان کی موت	گوپال متل	۹۶
غزل	ظہیر کاشمیری	۹۷
غزل	اثر لکھنوی	۹۸
غزل	حفیظ ہوشیارپوری	۱۰۰
سنگریزے	عبدالحمید عدم	۱۰۱
غزل	آفتاب احمد	۱۰۲
نیرنگیاں	جاں نثار اختر	۱۰۳

افسانے اور ڈرامے:

قیدِ حیات	اوپندر ناتھ اشک	۱۰۴
آگ	راجندر سنگھ بیدی	۱۴۳
چیک	جاوید اقبال	۱۵۳
پتھر کی مورت	اختر حسین رائپوری	۱۵۸
پچھتاوے	شفیق الرحمٰن	۱۶۷
معظم پور	ممتاز مفتی	۱۸۸
سورما	بشیر رومانی	۱۹۷

جائزے:

امریکہ کی تجارتی تجویزیں اور ہندوستان	طفیل احمد
روس کا پنج سالہ پلین	باری
فلموں میں نفسیاتی زاویہ	ممتاز مفتی
دو ناول	فکر تونسوی

پبلشر: ایم فرمان علی لاہور نے کوآپریٹو کیپیٹل پرنٹنگ پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا۔

www.taemeernews.com

ادارہ

جان پہچان

اختر حسین رائے پوری

ترقی پسند ادب کا سنگِ بنیاد رکھنے والوں میں ان کی شخصیت ایک اہلِ نظر مجتہد کی سی ہے۔ رائپوری کا نام سنتے ہی قارئین کی ذہنی فضا پر محبت اور نفرت کی گہری، رومانیت اور مشاقانہ گرفت مسلط چھا جاتی ہے ــــ بعد میں انقلابی تصورات کی شدت تنقید سے گذر کر افسانوں میں بھی ہلچل مچانے لگی۔ سنسکرت کے ممتاز عالم ہیں، بنگالی پر عبور حاصل ہے۔ کالی داس کے ناٹک "شکنتلا" اور باغی شاعر نذر الاسلام کے پیامِ شباب کا علی الترتیب سنسکرت اور بنگالی سے ترجمہ کر چکے ہیں۔ مختصر افسانہ میں گہرائی اور پہنائی کو ان کے فن کارانہ اختصار کا جامہ پہنا کر اپنے حسنِ انفرادیت کی چھاپ لگا دیتے ہیں۔

آجکل گورنمنٹ آف انڈیا کے تعلیمی شعبہ کے نگران ہیں۔

ممتاز مفتی

جنس (SEX) ان کا خاص موضوع ہے۔ جنسی مدرسۂ فکر کے بعض صحت مند اور بنیادی عناصر کے قائل ہیں، اور انہیں پر اپنے افسانوں کے جال بنتے ہیں۔ ہندوستان کی مسلم معاشرت میں سے کردار چن کر اپنے فن کی تجربہ گاہ میں لے آتے ہیں ــــ افسانوں کے علاوہ نفسیاتی اور منطقی مضامین بھی لکھتے ہیں۔ آج کل آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہیں۔

شفیق الرحمٰن

سماج کا خوشحال متوسط طبقہ ان کے فنی آئینہ میں جھلکتا ہے۔ مسکراتا اور چہچہاتا ہے لیکن ان مسکراہٹوں اور چہچہوں میں شفیق کی ہلکی سی، رومانی چاشنی کا نامحسوس سا زہر بھی شامل ہوتا ہے۔ ایک چالاک فن کار کی طرح وہ اس زہر کا احساس پیدا نہیں ہونے دیتا ــــ لوگ اس کی ہنسی کو تفریحی سمجھتے ہیں، لیکن یہ ہنسی بڑی پُراسرار افادیت رکھتی ہے۔ آج کل فوج میں ڈاکٹری کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔

www.taemeernews.com

باری

باری نے تصنیف و تالیف کی ابتدا اس دور میں کی جب ہندوستانی سماج، سامراجی دہشت کا شکار تھی۔ اور انقلابی تصورات پیدا کرنا جرم ناسزا سمجھا جاتا تھا۔ تب باری نے انقلاب فرانس، کارل مارکس، سوشلزم اور کمپنی کی حکومت لکھی۔ اور اس کے بعد تاریخ کے جدید اور نکھرے ستھرے اصولوں پر اپنے افکار پیش کرتے رہے۔ نہایت سنجیدگی، متانت اور سچائی کے ساتھ کام کرنے کے قائل ہیں۔ علمی، سائنسی، تاریخی اور اقتصادی مسائل پر بڑی صفائی اور صحت کے ساتھ بحث کرتے ہیں۔ "کمپنی کی حکومت" ان کا ایک اہم تاریخی کارنامہ ہے۔

اُپندر ناتھ اشک

اشک افسانے بھی لکھتے ہیں اور ڈرامے بھی۔ اور ایک حساس فن کار کی طرح دونوں میں کامیاب ہیں۔ انہوں نے متوسط ہندو معاشرت کے بہت سے گھناؤنے پہلوؤں کے تجزیے کئے ہیں۔ ان تجزیوں میں ایک مخصوص انفرادیت، بیباکانہ تحقیق اور فنکارانہ خلوص پایا جاتا ہے۔ اپنے فن کے بناؤ سنگار پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ ایڈیٹری سے شروع ہوکر ریڈیو سے ہوتے ہوئے فلمی صنعت میں جا پہنچے۔ لیکن کون جانے کہ وہاں سے بھی..... ع

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

ساحر لدھیانوی

ہم سب انہیں آوارہ کہتے ہیں۔ اس کی یہ آوارگی، اضطرابی بلند مزاجی کی حامل ہے۔ ورنہ اس کا ایک مخصوص نقطۂ نگاہ ہے۔ جو زمین اور آسمان کا مستقل اتصال ہے۔ ساحر کا کسی فلسفے کو جب شعری قالب بخشتا ہے تو اس کا وہ مخصوص نقطہ اتنا نمایاں، واضح، انفرادی اور نکھر ہو جاتا ہے کہ بڑے بڑے قائل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس کے فن میں عوام کی طرف براہ راست اپیل ہوتی ہے۔ ایک آوارہ گرد کا "بیٹا" "جاگیر" پر لکھتا ہے تو اس میں بھی اپنی مکمل تجاہلی کیسا ابھاری ہے۔

فراق گورکھپوری

نئے دور کے ادب کی تاریخ میں فراق ایک اجتہادی حیثیت رکھتے ہیں۔ صنفِ غزل کو جس کے ملبے پر جدید نظمیہ عناصر کی نئی بنیادیں اپنا صنم کدہ تعمیر کر رہی تھیں، فراق نے مجاہدانہ بیداری سے نئے سرے سے ابھارا اور روح و قار کے ساتھ ابھارا کہ نئے پرانے سبھی عش عش کر اٹھے۔ غزل کے علاوہ پیاری پیاری تنقید بھی لکھتے ہیں۔ آجکل "روپ" کی جمالیاتی رباعیات اور اردو ہندی کے جدید سنگم کی تاریخ تعمیر کر رہے ہیں۔

www.taemeernews.com

اداریہ

بات چیت

اُردو کے کسی نوجوان مگر مسلّمہ فنکار سے اگر پوچھا جائے، کہ اُس کے نظریات و احساسات کی آخری منزل کونسی ہے، تو وہ افق کو تکنے لگے گا، افق جو کہیں ختم نہیں ہوتا، افق جو ایک غیر مختتم دائرہ ہے، افق جو ایک نئے افق کا امتداد ہے۔ "سویرا" ہندوستان کے نوجوان فنکاروں کے معجزات کا ایک دو ماہی انتخاب ہے، اس لئے یہ کسی معیّن منزل کی طرف اشارہ نہیں کرتا، بلکہ زندگی اور کائنات کی بیکراں وسعتوں کے نشیب و فراز اس کی جولانگاہ ہیں، ہر سویرا ایک نئے سویرے کا پیامی ہے، اس لئے ہمارے عزائم اور مقاصد صرف ان الفاظ میں پوشیدہ ہیں، کہ "سویرا" اردو کے نئے ادب کی ایک میزان ہوگا اور چھوٹے بڑے یک سالہ یا دو سالہ منتخب مجموعوں کے سیلاب کا ایک حسین و لطیف ردِ عمل ہوگا، اس کی روح اور جسم کی خوبصورتی، طباعت، اور صباحت اردو کی کتابی دنیا میں مبارزہ یا مقابلہ کی بجائے ایک نئے پیغام ــــ ایک تعبیری اجتہاد ــــ ایک بادی حرکت کی پیشرو ہوگی، اور سال بھر میں اس نوع کی چھ کتابیں اردو ادب کی تاریخ میں چھ روشن اور ٹھوس واقعات کی حیثیت اختیار کرکے اپنے عقب میں ایک نئی کہکشاں کی تعمیر کرتی چلی آئیں گی۔

"سویرا" ادیبوں کے کسی خاص گروہ کا نمائندہ نہیں، یہ ہندوستان بھر کے اُن شاعروں کی تخلیقات کو اپنے دل میں جگہ دیگا، جو نئے تقاضوں سے شناسا ہیں اور اپنے شاعر کی زبردست ذمہ داریوں کا احساس رکھتے ہیں، یہ ہندوستان کے اُن تمام ادیبوں اور نقادوں کی نگارشات کو مسرت اور فخر سے پیش کریگا، جو ایشیائی زندگی کے عکاس اور نباض ہیں، اور جنہیں گذشتہ عقائد سے بوکھلائی ہوئی اس صدی کی جملہ بلندیوں اور گہرائیوں کا علم ہے۔ "سویرا" ہر اُس نئے اور پرانے جدّت اور تجربہ کار اردو دان کو دعوت دیتا ہے جسے ایشیا کی نشاۃ الثانیہ پر اعتماد ہے، جسے معلوم ہے کہ ہندوستان کے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب سے بڑی قوتوں کے پیچھے لپکے چلے آ رہے ہیں، اور جسے اس امر کا بھی احساس ہے کہ ہماری زمین پر سائبیریا کے علاوہ سوئٹزرلینڈ بھی ہے، کشمیر کے علاوہ صحرائے اعظم بھی ہے، اور زندگی لامحدود ہے اور کائنات بیکراں ہے، اور ان سب کا منبع حسن ہے!

"سویرا" ایک ادبی ڈکٹیٹر کی طرح پڑھنے والوں پر اپنے نظریات کو نہیں ٹھونسے گا، بلکہ چند مشورے پیش کر دینے کے بعد ان کے اثرات کا مطالعہ کریگا، اس کی پالیسی نئے ادب کے رجحانات سے ہم آہنگ ہوگی، اس کے مندرجات ادیبوں کی جگہ ادبیات سے عبارت ہونگے، اور یہ بڑے بڑے مضامین کے متعلق ریاکارانہ انداز میں گرجتی اور گونجتی ہوئی تعریف کرکے ریت کے محل نہیں کھڑے کریگا۔ "سویرا" کے ادارے کے ان گنت خصائص میں اولین مقام اس عزم کو حاصل ہے، کہ "سویرا" میں چھپنے والی ہر چیز ایک ایسے امتیاز کی مالک ہو، جو خواص کو جھنجھوڑ دے اور عوام کو چونکا دے!

www.taemeernews.com

مجھے بھی کچھ کہنا ہے!

دوستوں نے سُنا۔ تو انگشت بدنداں رہ گئے۔ بات بھی تو حیرت کی تھی۔ لیکن محنت و سرمایہ کے اس تصادم دور میں اس نوعیت کے تحیر بذاتہ خود تحیر خیز نہیں ہیں۔ اصولوں کی خاطر لڑنے والے ہمیشہ اس قسم کے تعجب سے دوچار ہو جاتے ہیں اور سر جھٹک کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

"ادبِ لطیف" کو میں نے رگِ جاں سمجھ رکھا تھا۔ اور اس کے لئے فن اور ادب کی نت نئی دنیائیں، نت نئے چراغ اور نت نئی منزلیں پیدا کرتا، روشن کرتا اور طے کرتا چلا گیا۔ ہماری ان راتوں کی تعمیری کوششوں اور ترقی پسند ادیب ساتھیوں کی معاونت سے "ادبِ لطیف" کی شعل روشنی سے روشن تر بنتی چلی گئی۔ قانون کی خداوندانہ گرفتیں، ادب کے رجعتی نمائندوں کا طوفانِ مخالفت، اور اپنے سرمایہ دار شریکِ کار کا مسلسل عدم تعاون ــ سبھی کچھ برداشت کیا۔ لیکن اگر برداشت نہ ہو سکا تو صرف وہ وقت جب میرے شریکِ کار نے میرے بڑھتے ہوئے نظریاتی حوصلوں میں سدِ راہ بننے کی کوشش کی اور میرے سامنے اپنے آمرانہ مطالبے پیش کئے کہ یا تو اس رسالے کی ادبی پالیسی بدل دو یا اس سے الگ ہو جاؤ۔ میرے دوست میرے اُس وقت کے تذبذب کا اندازہ لگا سکتے ہیں جب ایک طرف تو میرا بنیادی نصب العین تھا اور دوسری طرف اپنی "رگِ جاں" کی مفارقت۔ لیکن میں نے جی کڑا کر کے اپنے نصب العین پر اپنے ادبِ لطیف کو قربان کر دیا۔

یہ قربانی تاریخی قربانی ہے۔ تاریخ جو ارتقائی منازل کو آئینہ دکھاتی ہے۔

"سویرا" ــ میری نئی رگِ جاں ہے۔ اور میں ملک بھر کے ادب نواز اور ادب ساز حلقوں کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اسے فن کاروں کے جدید تر تجربوں، اور اشاعتی محاسن کی جدید تر قدروں کا دیا وگار اور مثالی مجلہ بنا دوں گا جس کے نقوش ایک مدت تک سرمایہ دارانہ دباؤ نے میرے ذہن کے نہاں خانوں میں بھینچ رکھے تھے ـــ اب میں زیادہ جرأت، زیادہ خوبصورتی اور زیادہ حوصلے کے ساتھ اپنی دبی گھٹی صلاحیتوں کو آپ کے سامنے پیش کر سکوں گا ـــ اب میں آپ کے اور زیادہ قریب آ گیا ہوں۔

نذیر چودھری

"سویرا" کی سالانہ ممبری

قبول فرمائیے۔ ہم آپ کو سال بھر میں "سویرا" کے سلسلہ کی چھ کتابیں دیں گے۔ ہر کتاب کی قیمت دو روپے ہوگی۔ لیکن مستقل ممبر کو سال بھر کے لئے دس روپے ادا کرنے پڑیں گے (منیجر)

www.taemeernews.com

باری

ہندوستان کا مغربی ساحل

جنوبی ہندوستان کا وہ ساحلی علاقہ جو ڈیلی پربت سے شروع ہو کر راس کماری تک چلا جاتا ہے مالابار کہلاتا ہے۔ ہندوستان کے مغربی ساحل کا یہ علاقہ مغربی گھاٹ کی وجہ سے صدیوں تک ہندوستان کے مشرقی ساحل کے باشندوں سے الگ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ آج سیاسی لحاظ سے مالابار اگرچہ مختلف ریاستوں اور ضلعوں میں بٹا ہوا ہے لیکن اس کی جغرافیائی اور نسلی وحدت صاف نمایاں ہے۔ جب جنوبی ہند کے اندرونی علاقوں کے لوگ چین اور یورپ کے شہروں کے نام تک نہیں جانتے تھے۔ تب مالاباری مشرق اور مغرب کے دور دراز شہروں سے تجارت کرتے تھے۔ مالاباریوں اور فونیقیوں کے تعلقات پر بھی حال ہی میں روشنی ڈالی جا چکی ہے بابل اور نینوا کے ساتھ بھی مالابار کے تعلقات کا پتہ چلتا ہے۔ یہودی اپنے سیاسی عروج کے زمانہ میں مالابار سے واقف تھے۔ ایک ہزار ق۔م میں مور کے لئے عبرانی زبان میں تامل زبان کا لفظ توکائی۔ توکی کی شکل میں رائج ہو چکا ہے۔ صدیوں تک بحر احمر، بحر عرب اور بحر ہند کی تجارت پر مصری اور مشرقی یونانی قابض رہے اس مدت میں مالابار کی تجارت نے بہت ترقی کی۔ پہلی صدی میں جب ایک یونانی نے موسمی ہواؤں کو دریافت کر لیا۔ تو اس سے ایک طرف سمندری سفر میں آسانی پیدا ہو گئی۔ اور دوسری طرف مالابار اور مغربی بندرگاہوں میں گہرا تجارتی تعلق قائم ہو گیا۔ رومیوں کے عروج میں بھی مالابار کی تجارتی حیثیت برقرار رہی۔ روم کے بہت سے سکّے مالابار کی زمین سے نکالے جا چکے ہیں۔ اس زمانہ میں مالابار کی سب سے مشہور بندرگاہ، موجیری (یونانیوں اور رومیوں نے اسے موزیرس لکھا ہے) تھی۔ اس بندرگاہ میں یہودی اور عیسائی بھی آباد تھے۔ عرب تاجر بھی مالابار کی بندرگاہوں میں آتے جاتے تھے۔ آٹھویں صدی کے شروع میں مالابار کی تجارت پر عربوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ مالابار کی بندرگاہوں کا قاہرہ، تونس، بصرہ اور دوسرے عرب شہروں کے ساتھ تعلق قائم ہو گیا۔ عربوں کی تاجرانہ سرگرمیوں نے مغربی ملکوں میں مالابار کی پیداوار کی مانگ کو بڑھا دیا۔

ازمنۂ وسطیٰ اور اس سے پہلے ہندوستان کا تجارتی مال خشکی کی راہ سے ایران سے ہوتا ہوا حلب تک پہنچتا تھا۔ حلب سے یہ مال اٹلی کی بندرگاہوں تک پہنچایا جاتا تھا۔ ان بندرگاہوں سے یہ مال ان قوموں اور

www.taemeernews.com

ملکوں تک پہنچا دیا جاتا جنہیں اس کی ضرورت ہوتی تھی۔ بعد میں بعد خلیج فارس کی راہ سے ہندوستان کا تجارتی مال حلب تک پہنچایا جانے لگا۔ بحر احمر کی راہ سے بھی یورپ کے ملکوں تک ہندوستان کا تجارتی مال پہنچنے لگا۔ سویز سے یہ تجارتی مال قاہرہ پہنچایا جاتا۔ اور وہاں سے تجارتی قافلے اسے اسکندریہ تک پہنچا دیتے۔ اس تمام کاروبار میں جہاں مشرق کے کئی ایک شہر فائدہ اٹھاتے تھے۔ وہاں اٹلی کی بندرگاہ وینس اس لین دین سے مالامال ہو گئی۔ تحریک احیا کے دنوں میں وینس یورپ کا سب سے بڑا مالدار شہر بن چکا تھا۔ اٹلی کے سوداگر ہندوستان اور دوسرے ایشیائی ملکوں کا مال مہنگے داموں پر فروخت کرتے تھے۔ اس اثنا میں یورپی ملک صدیوں کی بربریت سے رہائی حاصل کر کے تہذیب کے دائرے میں داخل ہو رہے تھے۔ تہذیب کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے یورپی ملکوں کو ایشیائی مصنوعات خریدنی پڑتی تھیں۔ یورپ کے تمام سیانے بادشاہ اس فکر میں لگے رہتے تھے۔ کہ کسی نہ کسی طرح سے ان کی رعایا کو مشرق کے ساتھ تجارت کرنے کا موقعہ مل جائے۔ چنانچہ پرتگال کے شہزادے ہنری نے اپنی ساری زندگی پرتگال سے براہ راست ہندوستان تک سمندری راستہ تلاش کرنے میں گذار دی۔ پرنس چند معمولی قسم کے جہازوں کا ایک بیڑہ لے کر شمالی افریقہ کے ساحل کی طرف چل نکلا پرتگیزوں نے نہایت آسانی سے قیوطہ پر قبضہ کر لیا۔ پرنس ہنری نہ صرف ایک بہادر سپاہی تھا۔ بلکہ ایک طالب علم بھی تھا۔ اس نے اپنے ذہن کو سائیرو۔ سینی کا اور پلینی کے مطالعہ سے روشن کر رکھا تھا۔ عرب جغرافیہ نگاروں کی کتابوں نے اس کے دل میں جہاں بینی کا شوق پیدا کر دیا تھا۔

پرنس ہنری کا قدم اب اس براعظم پر تھا۔ جس کی معدنی دولت اور جس کی صحرائی زندگی کے محبت بھرے افسانے وہ بچپن سے سنتا چلا آ رہا تھا۔ اس نے جنگی تبدیلیوں سے ملک کے اندرونی حصوں کے حالات پوچھے شہزادے کو بتایا گیا۔ کہ "مراکش کے شہروں میں دولت کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں۔ وہاں علم و فضل کے چرچے ہیں۔ صحرائے اعظم کے جنوب میں ایک بہت بڑا ملک ہے۔ جس میں حبشی رہتے ہیں جس میں بڑے بڑے دریا ہیں۔ اور جو مراکش سے خشکی کے ذریعہ سات دن کا سفر ہے۔ اور اگر اس ملک تک سمندر کے ذریعہ پہنچنا ہو۔ تو صحرائی ساحل کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف سفر کرنے سے اس ملک کے دریاؤں کے دہانوں تک پہنچ سکتے ہیں"

تبدیلیوں کی اس بات چیت کے بعد پرنس ہنری نے صحرا کے جنوب میں واقع ممالک کی تلاش کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔ اس نے ایک رصدخانہ تیار کیا۔ ایک بحری اسکول جاری کیا گیا۔ اس کے دریا کی رونق طوفانی تباہ کاریوں سے بچے ہوئے ملاحوں اور جہازرانوں سے تھی۔ مارکوپولو کا سفرنامہ اس کی بائیبل تھا۔ اپنے عرب دوستوں کی مدد سے اس نے دنیا کا نقشہ سنگِ مرمر پر کندہ کرا رکھا تھا۔ پرنس کے قبضہ میں بہت دولت تھی۔ دولت کی اس فراوانی نے ذوقِ سفر اور شوق جستجو کو آسان کر دیا۔

جب سارا سامانِ سفر تیار ہو گیا۔ تو شہزادے نے حکم سفر دیا۔ مہم پروانوں کے یہ جہاز افریقہ کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ روانہ ہوئے۔ ان کے دائیں طرف اوقیانوس کی تاریکیاں اور بائیں جانب صحرائی شعلے تھے

www.taemeernews.com

شہزادے کے ساتھیوں کو اس امر کا بہت کم یقین تھا۔ کہ ریت کے اس سمندر کے جنوب میں روئیدگی کے کوئی آثار دکھائی دے سکتے ہیں ـــــ چنانچہ تیزی سے آگے بڑھنے کی جگہ یہ بحری قافلہ ساحل پر جہاں کہیں دیسی باشندوں کو دیکھ لیتا۔ وہیں رک جاتا۔ پرتگال؛ پرتگال کہتے ہوئے باشندے اس قافلے پر حملہ کرتے۔ لیکن پرتگیزی ان میں سے چند ایک کو قید کر کے لے جاتے۔

پرنس ہنری اپنے قلعہ میں بیٹھا اس مہم کے نتائج پر غور کرتا۔ بحیرہ اوقیانوس کے کنارے پر کھڑا ہو کر وہ گھنٹوں موجوں کا رقص و سرود دیکھتا۔ ساحل اوقیانوس کا یہ محل بین الاقوامی تاریخ میں بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے لیکن اس زمانہ کے عوام اس قلعہ کو کسی جادوگر کا غار خیال کرتے ہونگے۔ جب مسافر ایک دراز قامت شخص کو کمبل میں لپٹا ہوا اور ٹوپی پہنے ہوئے دیکھتے۔ تو مارے خوف کے بھاگ جاتے۔ چاندنی راتوں میں یہی شخص اپنی رصدگاہ میں ایک عجیب و غریب آلہ ہاتھ میں لئے آسمان پر نظر دوڑاتا ہوا دکھائی دیتا۔ پرنس ہنری کئی جہاز روانہ کر چکا تھا۔ لیکن اسی اثنا میں لزبن میں شہزادے کے خلاف یہ جذبہ پیدا ہو گیا۔ کہ وہ مقدس کلیسا کی دولت کو محض تسکین جنون کے لئے خرچ کر رہا ہے۔ اس زمانہ میں یورپی لوگوں کا یہ خیال تھا۔ کہ صحرائے اعظم کے جنوب میں جہنم ہے۔ اور یہ پرنس پرتگیزوں کو دوزخ میں بھیج رہا ہے۔ لوگوں کے اس جغرافیائی عقیدے پر شہزادہ اپنے اوقیانوسی قلعہ میں بیٹھا مسکراتا ہوگا۔

ایک ایسا حادثہ ہوا۔ جس نے پرتگال میں پرنس ہنری کے متعلق رائے عامہ کو بدل دیا۔ صحرائی ساحل پر جن لوگوں کو قید کیا گیا تھا۔ انہوں نے سونے اور حبشی غلاموں کے بدلے اپنی رہائی حاصل کرنا چاہی۔ لزبن کے لوگوں کو معلوم ہوا۔ کہ جہنم میں سونے کی کثرت ہے۔ تو انہوں نے پرنس ہنری کی مخالفت ترک کر دی لزبن میں جہنم سے تجارت کرنے کے لئے تجارتی کمپنیاں قائم کی گئیں۔ شہزادہ کو اس امر کا یقین ہو گیا تھا۔ کہ افریقی ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرنے سے انسان ہندوستان کے ساحل تک پہنچ سکتا ہے۔ وینس والوں نے شہزادے کو جو مکتوب اور نقشے بھیجے۔ ان سے شہزادہ کا یقین مزید مستحکم ہو گیا۔ چنانچہ اس نے پوپ سے اس امر کا اجازت نامہ حاصل کر لیا۔ کہ ہندوستان تک پرتگیزی جن علاقوں کو دریافت کریں۔ وہ پرتگال کے ماتحت ہوں گے۔

پرتگیزوں نے گولڈ کوسٹ دریافت کر لیا تھا۔ المینہ میں ایک قلعہ اور ایک گرجا بنایا گیا۔ پرنس ہنری کے بعد شاہ جان ثانی نے ان مہموں کو جاری رکھا۔ لزبن میں ملاحوں، جہازیوں، تقدیر آزماؤں اور مہم پردازوں کا بہت بڑا اجتماع تھا۔ مختلف مقامات کے تقدیر آزما اپنی خدمات پیش کر رہے تھے ان تقدیر آزماؤں میں کولمبس بھی تھا۔ افریقی ساحل کی مہموں کی کامیابی کے پیش نظر شاہ پرتگال نے فیصلہ کر لیا کہ سمندر کے ذریعہ ہندوستان پہنچنے کی مہم کو بہت جلد روانہ کرنا چاہیئے۔ لزبن میں جشن منایا جا رہا ہے ہر جنیا پر پھریرے لہرا رہے ہیں۔ دیواروں پر قیمتی کپڑے لٹک رہے ہیں۔ گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ گولے چلائے جا رہے ہیں جھروکوں پر پرتگیزی لڑکیاں نیم مشرقی انداز میں جلوس کی منتظر ہیں۔ جلوس کے آگے ایک شخص قیمتی لباس پہنے ہوئے جا

www.taemeernews.com

رہا ہے اور اس کے پیچھے چند لنگ ملاحوں کا لباس پہنے ہوئے ننگے پاؤں جا رہے ہیں۔ واسکوڈے گاما اور اس کے ساتھی ہندوستان کی تلاش میں نکل چکے ہیں۔ دو سال آٹھ مہینے گزر گئے۔ لزبن میں پھر وہی رونق تھی شہر میں چراغاں کیا گیا۔ ملاحوں نے ایک عام جلسہ میں لزبن سے کالی کٹ تک کے سمندری سفر کے واقعات بیان کئے اسی دن وینس کے سفیر نے اپنی حکومت کو لکھا۔ کہ اس نے لزبن میں ہندوستانی مال سے لدے ہوئے جہازوں کو دیکھا ہے۔ اس نے اپنے دوسرے خط میں لکھا۔ کہ ایک بہت بڑا جنگی بیڑا تیار کیا جا رہا ہے کیونکہ واسکوڈے گاما ہندوستان فتح کرنا چاہتا ہے۔ جب وینس والوں نے دیکھا کہ ان کی تجارت تباہ ہونے والی ہے۔ تو انہوں نے سلطانِ مصر کو مداخلت کے لئے لکھا حکومتِ وینس نے سلطانِ مصر کو توپیں بھیجیں۔ تاکہ وہ انہیں ہندوستان کے شہزادوں تک پہنچا دے۔ انہوں نے سلطان سے درخواست کی۔ کہ انہیں نہر سویز کھودنے کی اجازت دی جائے۔ تاکہ ان کے تجارتی جہاز پرتگیزوں سے پہلے ہندوستان پہنچ سکیں۔ جب پرتگال کو وینس کے ان ارادوں کا پتہ چلا۔ تو البوکرک نے سلطانِ مصر کو ایک توہین آمیز خط لکھا۔ سلطان کمزور تھا۔ وہ وینس کی مدد نہ کر سکا۔ بحرِ ہند نے ایک پرتگیزی جھیل کی صورت اختیار کر لی۔ بحرِ ہند کے ساحل پر شاید ہی کوئی ایسا مقام تھا جہاں پرتگیزوں نے جم بدی نہ کی ہو۔ بحرِ ہند کے پانیوں میں کوئی جہاز حرکت نہیں کر سکتا تھا جب تک کہ اس کے پاس پرتگیزی پاسپورٹ نہ ہوتا۔ وینس والوں نے شاہ پرتگال سے درخواست کی۔ کہ انہیں ایک بڑی رقم کے عوض ہندوستان سے تجارت کرنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن شاہ پرتگال نے وینس کی درخواست کو مسترد کر دیا نتیجۃً اس استرداد کے بعد ہندوستان کی مصنوعات کی منڈی وینس کی جگہ لزبن بن گئی۔ دجلہ۔ فرات اور نیل کے شہروں پر تجارتی زوال شروع ہو گیا۔ وسط ایشیا کی کاروانی تجارت کو بہت نقصان پہنچا۔ بین الاقوامی تجارت کی مرکزیت بحیرہ روم کے ساحل سے ہٹ کر اوقیانوس کے ساحل پر چلی گئی۔

پرتگال کو حیرت انگیز کامیابی ہوئی۔ افریقہ کے مغربی ساحل، مشرقی ساحل (بحر احمر کے ساحل تک) خلیج فارس سے ساحل مالابار تک، کورومنڈل، مجمع الجزائر، سیام اور برما سے کینٹن اور شنگھائی تک قلعوں کی ایک زنجیر قائم ہو گئی۔ پرتگیزوں نے مٹھی بھر سپاہیوں سے بڑی بڑی فوجوں کو شکست دی۔ چھوٹے چھوٹے قلعوں کے ذریعہ بڑی بڑی سلطنتوں کا مقابلہ کیا۔ لیکن شروع سے آخر تک پرتگیزی وحشی، قاتل اور ڈاکو تھے۔ پرتگال کی حیرت انگیز کامیابی ہماری آنکھیں بند کر دیتی ہے۔ ہم اندھے ہو کر پرتگیزوں کی تباہ کاریاں اور ہولناکیوں کو نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن آہستہ آہستہ جب ہم آنکھیں کھولتے ہیں تو ہمارے سامنے پرتگیزی مظالم کی ایک لرزہ خیز تصویر ہوتی ہے۔

پرتگال اور ہسپانیہ کے وسیع مقبوضات کا الحاق فلپ دوم کے دورِ حکومت میں ہوا۔ اس نے لزبن کی بندرگاہ ہالینڈ کے "بے دین اور باغی" ولندیزیوں پر بند کر دیا۔ ولندیزی محض تسکینِ ذوق کے لئے طویل بحری سفروں کے حامی نہیں تھے۔ لیکن جب انہیں اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تو ان کے جہاز بھی تلاش اور دریافت

www.taemeernews.com

میں چل نکلے۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں نے بھی ان کا تتبع کیا۔ چنانچہ یہ قومیں منطقہ حارہ میں ایک دوسرے سے لڑنے لگیں۔

پندرھویں صدی کے آخری برسوں تک تقریباً ایک سو برس کی سمندری مہموں کے بعد پرتگالیوں نے افریقہ کے مغربی ساحل، راس امید اور کسی حد تک افریقہ کا جنوب مشرقی ساحل دریافت کر لیا تھا۔ افریقہ کے مشرقی ساحل کی بندرگاہوں پر پرتگالی جہازیوں نے عرب تاجروں اور جہازیوں سے بحرِ ہند کے تجارتی راستوں اور بندرگاہوں کے متعلق معلومات حاصل کر لی تھیں۔ اب پرتگیزی اس قابل ہو گئے تھے۔ کہ وہ ہندوستان کا سمندری راستہ دریافت کرنے کیلئے آخری کوشش کرتے۔

ہندوستان دریافت کرنے کی یہ مہم، ۲۸ برس کے ایک پرتگیزی جہازی واسکو دے گاما کے سپرد کی گئی واسکو دے گاما تین جہازوں کے ایک چھوٹے سے بیڑے کو لیکر ۸ جولائی ۱۴۹۷ء کو پرتگال سے چل پڑا۔ ان میں سب سے بڑے جہاز کا وزن ایک سو پچاس ٹن تھا۔ راس امید کا چکر کاٹنے کے بعد یہ بیڑہ افریقہ کے جنوب مشرقی ساحل تک جا پہنچا۔ واسکو دے گاما کو موزمبیق کے حکمران کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اپریل ۱۴۹۸ء میں وہ زنجبار سے دو سو میل شمال میں واقع ملندہ کی بندرگاہ میں پہنچا۔ ملندہ کے سردار نے گاما کی آؤ بھگت کی جنوب مشرقی افریقہ کے ساحلی علاقوں کے عرب جہازی اس سمندری راستے سے واقف تھے۔ جو ہندوستان تک لے جاتا تھا ہندوستان (مالابار) اور جنوب مشرقی افریقہ میں اسی راستے سے تجارت ہوتی تھی۔ چونکہ پرتگیزی جہازیوں کے لئے بحرِ ہند میں جہاز چلانا بہت مشکل تھا۔ اس لئے واسکو دے گاما نے عرب جہازران احمد بن ماجد کی خدمات حاصل کر لیں۔ جون ۱۴۹۸ء میں واسکو دے گاما نے کالی کٹ (مالابار) سے آٹھ میل شمال میں واقع ایک چھوٹی سی بستی کے قریب لنگر ڈال دیئے۔

پرتگیزی آخر اس ملک کے ساحل پر پہنچ گئے۔ جس کی دولت کے افسانے سکندر کے زمانے سے یورپ میں سنے جا رہے تھے۔ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے۔ یہ ملک اتنا بڑا ہے کہ اسے چھوٹا براعظم کہا جاتا ہے۔ اس کا ساحل پانچ ہزار میل ہے خشکی کی سرحد کوئی چھ ہزار میل ہوگی۔ شمال میں ہمالیہ پندرہ سو میل تک پھیلا ہوا ہے۔ بندھیاچل نے ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ہندوستان اپنی زرخیزی کی وجہ سے قوموں کو اپنی طرف مائل کرتا رہا۔ صدیوں تک جنوبی قوموں کے تمدن نے شمالی ہندوستان کو متاثر کیا۔ حملہ آور قوموں کی نسلیں آج بھی بندھیاچل کے اس پار شمالی ہندوستان کی نسبت بہت کم دکھائی دیتی ہیں۔ مختلف قوموں کے یہاں آنے سے ہندوستان میں مختلف تمدنوں کا ایک آمیزہ تیار ہو گیا۔ ہر تمدن ہندوستان کو متاثر کرنے کے بعد خود کسی دوسرے تمدن سے متاثر ہوتا رہا۔ پتھری عہد میں ہندوستان میں وہ قوم بستی تھی جس کی یادگار آج تک نیل گری کی پہاڑیوں میں باقی ہے۔ اس کے بعد کول اور بھیل اقوام نے ہندوستان کو اپنا گھر بنایا۔ صدیوں بعد دراوڑوں نے ان قوموں کو جنوب کی طرف دھکیل دیا۔ دراوڑ ابتدا میں شمالی ہندوستان میں آباد ہوئے۔ لیکن آریوں نے ان کے ساتھ وہی سلوک

www.taemeernews.com

کیا۔ جو وہ کولوں اور بھیلوں سے کر چکے تھے۔ آریوں نے دراوڑوں کو شمالی ہندوستان سے نکال دیا۔ وہ جنوبی ہندوستان میں چلے گئے۔ آج جنوبی ہندوستان میں دراوڑوں کی اکثریت ہے۔ ان کی زبانیں ہندی آریائی زبانوں سے مختلف ہیں۔ شمالی ہندوستان میں دراوڑ شہری تمدن کے مدارج تک پہنچ چکے تھے۔ ان کا تمدن سومیری تمدن سے ملتا جلتا تھا۔ ہڑپا اور موہنجودارو کی کھدائیوں نے ان کے تمدن کی عظمت کو ہمارے سامنے رکھ دیا ہے ان شہروں کا تمدن صدیوں کی آغوش میں پلا ہوگا۔ مصر، عراق اور ایران کی تہذیبوں کے پہلو بہ پہلو دراوڑی تہذیب بھی اپنی قدامت اور عظمت کا پھریرا لہراتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ موہنجودارو اور ہڑپا آریوں کے آنے سے صدیوں پہلے شہرت حاصل کر چکے تھے۔ سندھ اور پنجاب کا تمدن مصر اور عراق کے ہم عصر تمدن سے کسی طرح پیچھے نہیں تھا ان شہروں کے لوگ سوتی کپڑا بُننا جانتے تھے۔ گھروں میں غسل خانے تھے۔ شہروں کے مکان اونچے اور صاف ہوتے تھے۔ ان کا مذہب مصریوں اور سومیریوں سے ملتا جلتا تھا۔ شمال کی راہ سے آریوں کی آمد کے ساتھ ساتھ یا ان سے پہلے شمال مشرقی ہندوستان کے دروں سے منگولی قومیں بھی ہندوستان میں داخل ہوتی رہیں۔

آریہ شمال مغربی ہندوستان کی راہ سے ہندوستان میں داخل ہوئے۔ شمالی ہندوستان میں وہ صدیوں تک دراوڑوں سے لڑنے کے بعد پنجاب پر قابض ہوئے۔ پنجاب سے وہ گنگا کی وادی میں پہنچے۔ جہاں آریوں کی سیاست اور تہذیب اپنے عروج پر پہنچی۔ مگدھ میں ایک عظیم الشان آریہ سلطنت کی بنیاد پڑی۔ مگدھ کی سلطنت کے زمانہ میں گوتم بدھ کا ظہور ہوا۔ بدھ نے اپنے زمانہ کی تمام مجلسی برائیوں کے خلاف بغاوت کی۔ اس کا مذہب عوام کی زبان میں عوام کے لئے تھا۔ ایران نے سندھ اور پنجاب کے کچھ علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ سکندر نے بھی ہندوستان کا رُخ کیا۔ پورس نے اس کا مقابلہ کیا۔ یونانی فوجیں بیاس کے کناروں سے واپس ہوئیں۔ پاٹلی پترا فتح کرنے کی ہوس لئے سکندر کو واپس جانا پڑا۔ یونانی تہذیب نے شمالی ہندوستان کو متاثر کیا۔ سکندر کے جانے کے بعد پنجاب سے چندر گپت موریا اٹھا۔ اس کے وزیر چانکیہ نے اسے آئین جہانبانی بتائے۔ چانکیہ کی ارتھ شاستر سیاسیات پر غالباً پہلی کتاب ہے۔ موریا خاندان کے شہنشاہ اشوک کا عہد حکومت رفاہِ عامہ کے کاموں سے بھرا پڑا ہے۔ موریا سلطنت کی تباہی کے بعد پانسو سال تک ہندوستان میں کوئی مرکزی حکومت دکھائی نہیں دیتی۔ اس زمانہ میں ساکا اور یوچی قوموں نے ہندوستان پر دھاوا بولا۔ ساکا قوم کا سب سے مشہور بادشاہ کنشک تھا۔ اسی زمانہ میں بودھ مت اور برہمن مت میں کش مکش ہوئی۔ [illegible] بھی اسی زمانہ کی یادگار ہیں چوتھی صدی عیسوی میں گپت سلطنت قائم ہوئی۔ اب پاٹلی پترا کی جگہ اجین کو ہندوستان کی مرکزیت حاصل ہوئی یہ زمانہ برہمن مت کے انتہائی عروج کا زمانہ ہے۔ بکرماجیت اسی خاندان کا ایک حکمران تھا۔ گپت خاندان کے عہد حکومت میں ہندوستانی علوم و فنون اور صنعت و حرفت نے خوب ترقی کی۔ ہندوستان اور روم میں تجارتی تعلقات قائم ہو گئے۔ جنوبی ہندوستان کے لوگوں نے جاوا اور سماٹرا میں اپنی نو آبادیاں قائم کیں۔ گپت خاندان کے زوال کے بعد ہندوستان پھر بیرونی حملہ آوروں کا شکار ہوا۔ اب کے ہن قوم نے شمالی ہندوستان کو تاخت

www.taemeernews.com

وتاراج کیا۔ راجپوت اور گوجر (گرجر) اسی قوم کے مشہور قبائل تھے۔ مہرگل ہن قوم کا مشہور بادشاہ تھا جو ہاتھیوں کو پہاڑوں سے گرا کر ان کے مرنے کا تماشا کرتا اور خوش ہوتا۔ ساتویں صدی میں ہرشہ نے ہندوستان کو متحد کرنے کی کوشش کی۔ اس کے نظم و نسق کو ہیون سانگ ہم تک پہنچاتا ہے۔ ہرشہ اگرچہ بدھ مت کا پیرو تھا لیکن اس کے عہد میں شمالی ہندوستان میں برہمن مت نے سر پکڑ لیا تھا۔ ہرشہ کی موت کے بعد ہندوستان کی سیاسی مرکزیت ختم ہو گئی۔

اسی زمانہ میں عرب میں ایک بہت بڑا انقلاب ہوا۔ ایسا انقلاب جس نے انسانی تہذیب کو بدل دیا۔ عرب صدیوں سے آزاد چلے آتے تھے۔ یمن، شام اور عراق بیرونی حکمرانوں کے ماتحت رہ چکے تھے۔ لیکن اندرونِ عرب ان سے بچا رہا۔ اسلام کا ظہور حجاز میں ہوا۔ اسلام صرف بت پرستی اور شرک کے خلاف توحید و وحدت کا ایک عقیدہ ہی نہیں تھا۔ بلکہ وہ ایک معاشی اور اجتماعی تحریک تھی۔ مکہ میں جہاں دولت مند تاجروں کا ایک طبقہ تھا۔ وہاں حبشی غلاموں کی تعداد بھی کافی تھی۔ مکہ کا تاجر سود خوری میں کسی یہودی سے کم نہیں تھا۔ دولت کی کثرت نے ان تاجروں کو عشرت پسند بنا دیا تھا۔ لیکن مکہ کی غالب آبادی افلاس اور بدحالی کا شکار تھی۔ اسلام نے اس عشرت پسندی، بیکاری، سود خوری اور لوٹ کھسوٹ کے ختم کر دینے کا حکم دیا۔ اسلام کی مخالفت میں مکہ کے تاجر متحد ہو گئے۔ لیکن ان کا اتحاد بیکار ثابت ہوا۔ مدینہ میں اسلام قبول ہو چکا تھا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلافتِ راشدہ کے عہد میں عربی فتوحات کا دور شروع ہوا۔ بازنطین اور ایران کی سلطنتوں اور فوجوں کا تازہ دم عرب مجاہدوں سے مقابلہ کرنا محال تھا۔ ان کے پاس ساز و سامان تو تھا لیکن ان کی روح مردہ ہو چکی تھی۔ عربوں نے آس پاس کے مفتوحہ ملکوں کی گری ہوئی آبادی کو سنبھالا۔ انہیں ذلت اور غلامی سے نکال کر انسانیت کے دائرہ میں شامل کیا۔ ان کی روحانی اصلاح کی۔ ان کی معاشی حالت کو بہتر بنایا۔ عربوں کی یہ انقلاب آفریں فوجیں بہت جلد بنو امیہ کے اشرافیہ کے زیرِ نگیں ہو گئیں۔ بنو امیہ کے عہد میں عرب فتوحات معراج کمال تک پہنچ گئیں۔ لیکن اسلامی روح بدل چکی تھی۔ .....

..... بنو امیہ کے عہد میں بعض ایسے قبائل کو اسلام قبول کرنے سے صرف اس لئے روک دیا گیا تھا۔ کہ ان کے مسلمان ہو جانے سے شاہی خزانہ میں کمی ہو جائیگی۔ اسی عہد میں کئی ایک ایرانی قبائل کو مسلمان ہوتے ہوئے بھی جزیہ دینا پڑتا تھا۔ بنو امیہ کے عہد میں غیر عرب مسلمانوں کو اعلیٰ عہدوں سے محروم رکھا جاتا تھا۔ اسی عہد میں اندرونی کش مکش اور طبقاتی بے چینی کے آثار پیدا ہوئے جو عباس نے اسی بے چینی اور نچلے طبقہ کی مدد سے امویوں کی سلطنت کو پارہ پارہ کر دیا۔ امویوں کا دمشق خالص عربی شہر تھا۔ عباسیوں کا بغداد عربوں اور ایرانیوں دونوں کا شہر تھا۔ عباسیوں کے عہد میں معاشی بے چینی عام رہی۔ بابک خرمی کی تحریک کو عباسیوں نے بڑی مشکل سے دبایا۔ اس تحریک کے دب جانے کے بعد اسماعیلی تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک کو ہر اس اسلامی ملک میں کامیابی ہوئی۔ جہاں کے عوام زبوں حال

www.taemeernews.com

تھے۔ یہ تحریک معاشی اسباب کا نتیجہ تھی۔ یہ نئی تحریک پرانے جاگیردارانہ نظام کے خلاف بغاوت تھی۔ اسماعیلی زمین کو صرف کسانوں میں تقسیم کرنے کے مدعی تھے۔ یہ تحریک خواص کے خلاف عوام کی تحریک تھی۔ عباسیوں نے ترکوں کی مدد سے اس تحریک کو کچل دیا۔ اسماعیلیوں کی ایک جماعت قرامطہ نے اتنی طاقت حاصل کرلی تھی کہ بغداد کا شاہی جاہ و حشم ان کے نام سے لرزتا تھا۔ دسویں صدی میں ملتان قرامطہ کا بہت بڑا مرکز تھا۔ محمود چونکہ ترک تھا۔ اور اس زمانہ میں ترک عباسیوں کے محافظ تھے۔ اس لئے اس نے ملتان پر حملہ کرکے قرامطہ کی قوت کو ختم کیا موجودہ زمانہ کی اصطلاح میں ہم قرامطہ کو اشتراکی جمہوریت کے حامی کہہ سکتے ہیں۔ معاشی بے چینی اور طبقاتی کش مکش نے عباسیوں کی وسیع سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا۔ مرکز کے کمزور ہوتے ہی سلطنت میں کئی ایک آزاد ریاستیں قائم ہوگئیں۔ ان میں سے غزنی بھی ایک ریاست تھی۔ اس ریاست کے حکمران سبکتگین کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے محمود کے عہد میں شمال کی طرف سے ہندوستان پر پھر حملہ ہوا۔ پرانے حملہ آوروں کی طرح نہیں بھی کامیابی ہوئی۔ یہ حملہ آور بھی ہنوں، ساکوں اور یوچیوں کی طرح ہندوستان میں آباد ہوگئے۔ لیکن اب کے یہ حملہ آور اپنے ساتھ ایسی خصوصیات اور ایسا تمدن لاتے تھے۔ کہ وہ ہندومت میں جذب نہ ہوسکے محمود کے حملوں سے تین سو سال پہلے عرب سندھ پر قبضہ کر چکے تھے۔

ہرشہ کی موت کے بعد ہندوستان بے شمار چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گیا۔ محمود کے سپاہیوں کے لئے ان ریاستوں کو شکست دینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ محمود غزنوی کے ڈیڑھ سو سال بعد محمد غوری نے ہندوستان پر حملے کئے ایبک نے دہلی پر قبضہ کر لیا۔ غلام بادشاہوں نے چنگیزی حملوں سے ہندوستان کو بچایا۔ خلجیوں نے جنوبی ہند کے اس پار فتوحات کا سلسلہ شروع کیا۔ تغلقوں نے رفاہ عام کی طرف توجہ کی۔ تیموری حملے نے تغلقوں کو ختم کردیا۔ ہندوستان کی سیاسی مرکزیت ختم ہوگئی۔ جا بجا آزاد ریاستیں قائم ہوگئیں۔ ان آزاد ریاستوں میں نیا ہندوستانی تمدن پھلا پھولا۔

قطب الدین ایبک کی تخت نشینی سے اس خاندان کا آغاز ہوتا ہے۔ جو ہندوستان کی تاریخ میں غلاموں کے نام سے مشہور ہے۔ اسی خاندان کے ایک حکمران بلبن نے ہندوستان کو منگولوں کے حملوں سے بچائے رکھا اس خاندان کی دہلی میں دو یادگاریں ہیں۔ قطب مینار اور مسجد قوت الاسلام۔ منگولوں نے عراق اور ایران کو تباہ کردیا تھا۔ ان ملکوں کے عالموں نے دہلی کا رخ کیا۔ ان کے آنے سے دہلی میں علم و حکمت کا چراغ روشن ہوا۔ امیر خسرو نے ہندی دوہے لکھ کر ایک نئی زبان کی بنیاد رکھی۔ خلجیوں نے سلطنت دہلی کو وسیع کیا۔ محمد تغلق کی اصلاحات اس کے زمانہ کے لئے ناموزوں تھیں۔ فیروز تغلق نے اپنی سلطنت میں ایسے شفاخانے کھولے جن میں مریضوں کو مفت دوا ملتی تھی۔ اس نے بہت سے نئے شہر آباد کئے۔ اس کے عہد میں سنسکرت کتابوں کے فارسی میں تراجم ہوئے۔ فقہ فیروز شاہی اسی عہد کی ایک مشہور کتاب ہے۔ ضیاء الدین برنی نے "تاریخ فیروز شاہی" لکھی۔ فیروز شاہ نے اپنے زمانہ کے حالات کو فتوحات فیروز شاہی میں پیش کیا۔ تیمور کے حملے نے

www.taemeernews.com

سلطنت دہلی کو تباہ و برباد کر دیا۔ اس حملے کے بعد ہندوستان میں بہت سی آزاد ریاستیں قائم ہو گئیں۔ ان ریاستوں میں علم و حکمت نے خوب ترقی کی۔ بنگال کے مسلمان حکمرانوں نے بنگالی کو اس وقت فروغ دیا۔ جب کہ سنسکرت کے حامی ہندو بنگالی زبان کی مخالفت کرتے تھے۔ ودیا پتی نے اپنی بہت سی کتابیں نصرت شاہ سے نام معنون کیں۔ بنگال کے ان آزاد حکمرانوں نے فن تعمیر کی طرف بھی خاصی توجہ کی۔ بنگال کی طرح جونپور، مالوہ، گجرات اور گلبرگہ نے بھی ادب اور آرٹ میں نمایاں ترقی کی۔ لودھیوں کے عہد حکومت میں ایک ایسی تحریک چلی جس کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کو مشترکہ عقائد کی بنا پر خوشگوار بنانا تھا۔ بھگت کبیر، شیخ بھیکا اور بابا نانک اس تحریک کے علمبردار تھے۔

پرتگالی پہلے لوگ نہیں تھے، جو سمندروں کے سینوں کو چیر کر ہندوستان کی تجارت کے لئے پہنچے تھے۔ پرتگالیوں سے صدیوں پہلے عرب ہندوستان کے ساحلوں سے ہوتے ہوئے چین کی بندرگاہوں تک آتے جاتے تھے۔ مصر اور شام کے شہروں سے تجارتی مال لے کر عربوں کے اونٹوں کی قطار حجاز کے ساحل کے ساتھ ساتھ ہوتی ہوئی یمن تک پہنچ جاتی۔ یمن کی بندرگاہوں پر عرب سوداگر کشتیوں میں سوار ہو کر افریقہ کے مشرقی ساحل کی طرف چل دیتے۔ اور کچھ سوداگر ہندوستان کے مغربی ساحلوں سے ہوتے ہوئے برما اور چین تک چلے جاتے۔ جب یونانیوں نے مصر پر قبضہ کیا۔ تو انہوں نے اس تجارتی شاہراہ کے ایک حصے پر قبضہ کر لیا۔ ہندوستان سے اسکندریہ تک کی تجارت پر یونانی قابض ہو گئے۔ لیکن اس کے باوجود عربوں کی جہاز رانی کسی نہ کسی صورت میں باقی رہی جب یونانیوں کی جہاز رانی کا بڑا زور تھا۔ تب بھی خلیج فارس کی راہ سے عرب تاجر اپنے پرانے راستے سے چین تک پہنچ جاتے تھے۔

اسلام نے جہاں عربوں کی زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ وہاں اس نے عربوں کی جہاز رانی میں ایک نئی روح پھونک دی۔ خلیفہ دوم کے عہد میں نیل اور قلزم کو ایک نہر کے ذریعہ ملا دیا گیا۔ اس عہد میں مصر کے حاکم عمرو بن العاص نے چاہا۔ کہ خاکنائے سویز میں سے ایک نہر کاٹ کر بحر قلزم کو بحر روم سے ملا دیا جائے لیکن اسے یہ نہر کھودنے کی اجازت نہ ملی۔ بہر حال بہت جلد عربوں کی جہاز رانی اپنے کمال تک پہنچ گئی۔ اس کے ساتھ ہی عربوں کا سمندری بیڑہ دنیا بھر کے ملکوں کے متحدہ بیڑے سے طاقتور بن گیا۔

عرب جہاز ران ہندوستان کے ساحلوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ عربی میں ہندوستان کی ساحلی زبانوں کے بہت سے الفاظ ان تعلقات کا کافی ثبوت ہیں۔ صندل، مسک، تنبول، کافور، قرنفل، نیلوفر، اطریفل، شیذت، نیلج، نارجیل اور کئی دوسرے عربی الفاظ اپنے ہندی ہونے کی خود بخود گواہی دے رہے ہیں۔ سندھ، گجرات، ملیبار اور کارومنڈل کی بندرگاہوں کی رونق ان عرب جہاز رانوں اور سوداگروں کے دم سے تھی۔ ہندوستان کے کئی ساحلی شہروں میں عربوں کی نو آبادیاں قائم ہو گئی تھیں۔ ہندوستان کی ساحلی ریاستوں کے حکمرانوں کو چونکہ عرب سوداگروں اور جہاز رانوں کے آنے جانے سے بہت سا مالی فائدہ پہنچتا تھا۔ اس لئے

وہ عربوں کی بہت عزت اور قدر کرتے تھے۔

سراندیپ اور مالدیپ ہندوستان میں عربوں کا تیسرا تجارتی مرکز مالابار تھا۔ مالابار (ملیبار) کا ساحل گجرات اور کولم کے درمیان پھیلا ہوا ہے۔ "تحفۃ المجاہدین" کے الفاظ میں "ہندوستان کے مغربی ساحل کی بندرگاہوں میں عرب تاجر بہت بڑی تعداد میں آتے ہیں۔ ان عرب تاجروں کی آمد و رفت نے کئی ایک ساحلی شہر آباد ہو گئے ہیں۔ جن میں عربوں کی کافی تعداد ہے۔ ان ریاستوں کے حکمران ان پر کسی قسم کی سختی نہیں کرتے۔ انہیں پوری پوری مذہبی آزادی حاصل ہے۔ مالابار کے راجاؤں کا عربوں اور مقامی مسلمانوں کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ ہے۔" ابن بطوطہ کہتا ہے۔ کہ مالابار کا ساحلی سفر دو مہینوں میں کٹتا ہے۔ اس ملک میں بارہ راجے ہیں۔ ہندوؤں کی حکومتیں ہونے کے باوجود ان ریاستوں میں مسلمانوں کی بڑی عزت کی جاتی ہے۔ اس پورے سفر میں جگہ جگہ مسلمانوں کی بستیاں دکھائی دیتی ہیں۔ "کالی کٹ کے بارے میں ابن بطوطہ لکھتا ہے۔ کہ یہ مالابار کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے۔ جہاں دنیا بھر کے ملکوں کے سوداگر جمع ہوتے ہیں۔ یہاں کا ہندو راجہ زیمورن کہلاتا ہے۔ ابراہیم شاہ بندر یہاں کے سوداگروں کا سردار ہے۔" یہی سیاح اپنے سفرنامہ میں کالی کٹ کے ایک ایسے عرب سوداگر کا ذکر کرتا ہے۔ جس کے اپنے جہاز ہیں۔ جو ہندوستان، یمن، چین اور فارس (ایران) سے تجارت کرتے ہیں۔" ابن بطوطہ سے بھی صدیوں پہلے کئی ایک عرب جغرافیہ نگاروں نے اپنی کتابوں اور عرب سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں ہندوستان کے مغربی ساحلوں کی بندرگاہوں اور وہاں کے باشندوں کا تذکرہ کیا ہے۔ تجارت کی سب سے بڑی سمندری سڑک پر صدیوں عربوں نے قبضہ کئے رکھا۔ عرب سوداگر ایک طرف اسکندریہ کی بندرگاہ تک اپنا مال پہنچا دیتے تھے اور دوسری طرف شام کی بندرگاہوں تک۔ ان بندرگاہوں سے وینس کے سوداگر مال خرید کر یورپی منڈیوں میں فروخت کرتے۔ جب اسپینیوں نے عربوں کو سپین سے نکال دیا۔ تو اس وقت ان کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوا۔ کہ بحیرۂ روم میں عربوں کے تجارتی تسلط کو ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ سپین اور پرتگال اس کوشش میں تھے کہ ترکوں نے بحیرۂ روم کو ترکی جھیل بنا لیا۔ اب سپین اور پرتگال نے اس راستے سے ہندوستان پہنچنا چاہا۔ جس سے اس زمانہ کے عرب جہازران واقف ہو چکے تھے۔ عرب جہازران طنجہ تک پہنچ کر افریقہ کے..... مغربی ساحل سے ہوتے ہوئے جنوبی افریقہ چلے جاتے۔ اور یہاں سے مشرقی افریقہ کی بندرگاہوں سے ہندوستان کے مغربی ساحل پر پہنچ جاتے تھے۔ دسویں صدی کا ایک عرب تاجر سلیمان لکھتا ہے۔ کہ ہمارے زمانہ میں ایک ایسا حادثہ ہوا ہے۔ جس کا پہلوں کو علم نہیں تھا۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ بحر ہند اور بحر روم آپس میں ملے ہوتے ہیں۔ ایک عرب جغرافیہ نگار کے الفاظ میں "طنجہ اور اسپین کے ساحلوں پر جو بحر محیط ہے۔ اسے یونانی اوقیانوس کہتے ہیں۔" گیارہویں صدی کا ایک عرب سیاح ابو حامد اوقیانوس کے متعلق لکھتا ہے۔ کہ اس سمندر میں زمین ایسی ہے جیسے تالاب میں گیند۔ تقریباً دو سو سال بعد ایک دوسرا عرب جغرافیہ نگار ابوالفدا لکھتا ہے

www.taemeernews.com

کہ اوقیانوس، مراکش کے ساحلوں کو چھوتا ہوا جنوب میں چلا جاتا ہے۔ اور پھر مشرق کی طرف گھوم کر افریقہ کی سمت ویران علاقوں کو پیچھے چھوڑ کر پھیلتا ہوا بحر ہند سے جا ملتا ہے۔ پرتگالیوں نے بھی اسی راستے سے ہندوستان پہنچنے کی کوشش کی۔

واسکوڈے گاما ابھی ملندہ ہی میں تھا۔ کہ عرب جہازیوں نے مالابار کے موپلا (عرب نسل کے مالابار مسلمان) تاجروں کو پرتگیزیوں کے ارادوں سے باخبر کر دیا۔ چونکہ ان تاجروں کو بیرونی ملکوں کے ساتھ تجارت کرنے میں بہت زیادہ فائدہ ہوتا تھا۔ اس لئے وہ نہیں چاہتے تھے۔ کہ پرتگیزی مغربی افریقہ کے ساحل کا چکر کاٹ کر ہندوستان کے تجارتی مال کو پرتگال کی بندرگاہوں تک لے جائیں۔ چنانچہ موپلا تاجروں نے کالی کٹ کے راجے کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہا۔ کہ وہ پرتگیزیوں کو اپنے ملک سے تجارت کرنے کی اجازت نہ دے۔

جب کالی کٹ کے راجہ زیمورن (سمدری) کو پرتگیزیوں کے آنے کا پتہ چلا۔ تو اس نے ان کے سردار کو اپنے ہاں بلا بھیجا۔ چنانچہ واسکوڈے گاما اپنے تیرہ ساتھیوں سمیت خشکی کے راستے سے کالی کٹ کی طرف چل پڑا۔ واسکوڈے گاما نے نہ معلوم کس بنا پر یہ فرض کر لیا تھا۔ کہ مسلمانوں کے علاوہ ہندوستان میں سب لوگ عیسائی ہیں چنانچہ واسکوڈے گاما اور اس کے ساتھیوں نے ایک مندر کو گرجا خیال کرتے ہوئے وہاں عبادت کی۔ واسکوڈے گاما کے پاس زیمورن کو پیش کرنے کے لئے کوئی تحائف نہیں تھے۔ اس پر زیمورن نے حیران ہو کر واسکو سے پوچھا کیا تم یہاں پتھر تلاش کرنے آئے ہو یا انسان؟ واسکو نے کالی کٹ سے تجارت کرنے کی اجازت مانگی۔ زیمورن نے مسکراتے ہوئے پرتگیزیوں کو اپنے ملک کے ساتھ تجارت کرنے کی اجازت دیدی۔

اس زمانہ میں کالی کٹ ہندوستان کے مغربی ساحل کا ایک مشہور تجارتی مرکز تھا۔ واسکوڈے گاما سے تقریباً ساٹھ سال پہلے عبدالرزاق کالی کٹ کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے "کہ اس شہر میں بہت سے مسلمان بھی بستے ہیں۔ شہر کی دو مسجدوں میں مسلمان نماز جمعہ ادا کرتے ہیں۔ کالی کٹ کے امن اور انصاف کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ یہاں کے تاجر سمندر پار کے دور دراز ملکوں سے تجارتی مال لاتے ہیں۔ چونگی کے افسر تجارتی مال کی دن رات حفاظت کرتے ہیں۔ کالی کٹ پہنچ کر ہر ملک کے تجارتی جہاز کو پناہ مل جاتی ہے" سولہویں صدی کے شروع میں ایک فرانسیسی سیاح پیرے دی لادال لکھتا ہے۔ "کہ ہندوستان بھر میں کالی کٹ سے بہتر کوئی دوسرا مقام نہیں۔ جہاں انسانوں کو اتنا اطمینان نصیب ہے...... یہاں ہر مذہب اور قوم کے سوداگروں کو پوری پوری شہری اور مذہبی آزادی حاصل ہے۔" سمرقندی، اطالوی اور فرانسیسی سیاحوں کے ملتے جلتے بیانوں کی سچائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کالی کٹ بلاشبہ ہندوستان کے مغربی ساحل کا ایک بہت بڑا تجارتی شہر تھا۔ جس میں دولت مند تاجروں کی کمی نہیں۔ لیکن اس میں چند ایسے بھوکے انسان بھی بستے تھے۔ جو پرتگیزی ملاحوں کو بسکٹ کھاتا دیکھ کر ان سے ایک آدھ بسکٹ کی بھیک بھی مانگ لیتے تھے۔

اسی اثنا میں کالی کٹ کے جہازی پرتگیزی جہازوں کو کالی کٹ کی بندرگاہ میں لے آئے تھے۔ واسکوڈے گاما

www.taemeernews.com

نے اپنے بیڑے پر پہنچ کر پانچ چھ دن تک موپلا سوداگروں کا انتظار کیا۔ تاکہ وہ اس مال کو خرید لیں۔ جسے وہ پرتگال سے لایا تھا۔ جب سوداگروں نے پرتگیزی مال خریدنے سے انکار کر دیا۔ تو واسکوڈے گاما نے زیمورن سے شکایت کی۔ زیمورن نے اس مال کو خرید کر اسے کالی کٹ کی منڈی میں بھیج دیا۔ واسکوڈے گاما پرتگال سے ایسا مال لے کر آیا تھا۔ جس کی کالی کٹ میں مانگ نہیں تھی۔ اس نے ایک تونسی عرب کی مدد سے جو ہسپانوی زبان جانتا تھا کالی کٹ کی منڈی کی مانگ کے بارے میں معلومات حاصل کر لیں۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ کالی کٹ کی بندرگاہ سے ایسی اشیا کے نمونے لے گیا۔ جو وہاں کثرت سے بیچی جاتی تھیں۔ اس تونسی عرب کو پرتگیزوں نے "مول شیدی" نام دے رکھا ہے۔ واسکوڈے گاما واپس جانا چاہتا تھا۔ کہ زیمورن کے ساتھ اس کا جھگڑا ہو گیا۔ واسکوڈے گاما پانچ مالاباریوں کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے گیا۔

دو سال کے بعد واسکوڈے گاما پرتگال پہنچا۔ اس کے تین جہازوں میں سے ایک تباہ ہو چکا تھا۔ اس کے ایک سو ستر ساتھیوں میں سے صرف پچپن زندہ تھے۔ اگر شاعروں اور مورخوں کی ان مبالغہ سے بھری ہوئی کہانیوں کو جو واسکو کے اس سفر کے ساتھ چمٹی ہوئی ہیں۔ نکال دیا جائے۔ تب بھی واسکوڈے گاما کے اس سفر کی دلچسپیوں میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہو سکتی۔ واسکوڈے گاما کا یہ سفر دنیا کی تاریخ کا ایک اہم ترین واقعہ ہے۔ ایک ایسا واقعہ جس سے نہ صرف ایک نیا سمندری راستہ دریافت ہوا۔ بلکہ جس نے آگے چل کر قوموں کی معاشی اور سیاسی تاریخ کو بدل دیا۔

واسکوڈے گاما نے جس سمندری راستے کو تلاش کر لیا تھا۔ اسے جاری رکھنے کے لئے تیرہ جہازوں کا ایک بیڑہ تیار کیا گیا۔ ۹ مارچ ۱۵۰۰ء کو الوریز کبرال کی کمان میں یہ بیڑہ ہندوستان کی طرف چل دیا۔ اسی اثناء میں جنوبی افریقہ کی سونے کی کانوں کی اطلاع پرتگال میں پہنچ چکی تھی۔ سونے کی ان کانوں کو دریافت کرنا بھی اس بیڑے کے ذمے تھا۔ راس ورڈے سے ہٹ کر ایک جہاز بیڑے سے الگ ہو گیا۔ ہوا کے رخ سے فائدہ اٹھانے کے لئے باقی جہاز اوقیانوس پر پھیل گئے۔ اس طرح پرتگیزوں نے برازیل دریافت کر لیا۔ ایک جہاز کو اس نئی دریافت کی اطلاع دینے کے لئے پرتگال جانا پڑا۔ باقی کے گیارہ جہاز برازیل کے ساحل سے راس امید کی طرف چل دیئے۔ راس امید کے قریب چار جہاز ڈوب گئے۔ سات جہاز راس امید کا چکر کاٹنے میں کامیاب ہو سکے۔ ان میں سے ایک جہاز مڈغاسکر کے ساحل کی طرف نکل گیا۔ اس جہاز کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بڑی مشکل سے یہ جہاز پرتگال پہنچ سکا۔ ۷ اگست ۱۵۰۰ء کو الوریز کبرال افریقی ساحل سے ہندوستان کی طرف چل پڑا۔ اب اس کے بیڑے میں صرف چھ جہاز تھے۔ ۱۳ ستمبر کو پرتگیزی بیڑہ کالی کٹ پہنچ گیا۔ الوریز اور زیمورن میں کئی ہفتوں تک جھگڑا ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ پرتگال اور مالابار میں سمجھوتہ ہو گیا۔ اس سمجھوتے کے سبب پرتگیزوں کو کالی کٹ میں ایک فیکٹری کھولنے اور اپنا پھریرا لہرانے کی اجازت مل گئی۔ تین مہینوں کی محنت میں پرتگیزی صرف دو جہازوں میں تجارتی مال لاد سکے۔ پرتگیزوں نے زیمورن سے کالی مرچ خریدنے

www.taemeernews.com

کا اجارہ لے لیا۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا۔ کہ عرب سوداگر اس جنس کو خرید رہے ہیں۔ تو انہوں نے زیمورن سے شکایت کی۔ زیمورن کا جواب آنے سے پہلے ہی پرتگیزوں نے عربوں کے ایک جہاز کو جو لنگر ڈالے ہوئے تھا۔ پکڑ لیا۔ پرتگیزوں کی اس حرکت کی خبر شہر میں پہنچ گئی۔ مالاباریوں کے ایک ہجوم نے پرتگیزی فیکٹری کو لوٹ لیا۔ ستر پرتگیزوں میں آدھے کے قریب مارے گئے۔ اور باقی بڑی مشکل سے جان بچا کر اپنے جہازوں تک پہنچے۔ کئی ایک زخمی پرتگیزوں کو کالی کٹ کے لوگوں نے اپنے ہاں پناہ دی۔ اس وقت تک الوریز کبرال اس ہنگامے کو فیکٹری کا معمولی جھگڑا سمجھ رہا تھا۔ لیکن اگلے دن اس نے غیر ملکی جہازوں کے چھ سو کے قریب کشتی چلانے والوں کو پکڑ کر قتل کروا دیا۔ کئی ایک ملاحوں کو ان کی کشتیوں میں زندہ جلا دیا گیا۔ الوریز کبرال دو دن تک کالی کٹ پر گولے برساتا رہا۔ اب پرتگیزوں کی پوزیشن بہت خراب ہو چکی تھی۔ مون سون شروع ہونے والی تھی۔ پرتگیزوں کو ہندوستان کی کسی دوسری بندرگاہ کا پتہ نہیں تھا۔ جب ان کو چین کی بندرگاہ کا علم ہوا تو وہ ۱۰ دسمبر کو کالی کٹ سے بھاگ نکلے۔ چودہ دنوں میں پرتگیزوں نے اپنے سارے جہاز تجارتی مال سے بھر لئے۔

پرتگیزی بیڑہ پرتگال کو روانہ ہونے والا تھا۔ کہ الوریز کبرال کو پتہ چلا۔ کہ کالی کٹ کا ایک بیڑہ اس پر حملہ کرنے کے لئے چلا آرہا ہے۔ کوچین کی پرتگیزی فیکٹری میں تیس پرتگیزوں کو چھوڑ کر الوریز رات کے اندھیرے میں کوچین سے کھسک گیا۔ پیچھے رہنے والے پرتگیزوں میں سے "دوآرتے باربوسا" بھی تھا۔ جس نے آگے چل کر افریقہ اور مالابار کے ساحلوں پر ایک کتاب لکھی۔ کنانور سے ہوتے ہوئے پانچ جہازوں کو صحیح سلامت لے کر پرتگال تک جا پہنچا۔ اسی اثنا میں پرتگیزوں کا ایک تجارتی بیڑہ ہندوستان کی طرف چل پڑا تھا جب یہ بیڑہ موزمبیق پہنچا۔ تو اسے الوریز کے حالات کا پتہ چلا۔ چنانچہ اس بیڑے نے کالی کٹ جانے سے گریز کیا۔ واپسی پر اس بیڑے نے سینٹ ہلینا کو دریافت کر لیا۔

الوریز کبرال کا یہ سمندری سفر اس لحاظ سے بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ کہ پرتگیزوں نے کوچین کی بندرگاہ کو دریافت کر لیا تھا۔ پرتگیزوں کے لئے یہ بندرگاہ کالی کٹ سے زیادہ مفید تھی۔

پرتگال کے بادشاہ نے مشرق میں پرتگیزی سلطنت قائم کرنے کے لئے بیس جہازوں کے ایک بیڑے کو واسکو دے گاما کی کمان میں فروری ۱۵۰۲ء کو ہندوستان روانہ کیا۔ جب یہ بیڑہ ہندوستان کے ساحل کے قریب پہنچا۔ تو واسکو دے گاما کو معلوم ہوا۔ کہ بحیرہ احمر سے ایک بہت بڑا تجارتی جہاز آرہا ہے۔ واسکو دے گاما نے اس تجارتی جہاز پر حملہ بول دیا۔ جہاز کے کپتان جوہر آفندی نے پرتگیزوں کی بہت منت سماجت کی۔ لیکن انہوں نے ایک نہ مانی۔ سات دن تک جوہر آفندی پرتگیزی بیڑے سے لڑتا رہا۔ پرتگیزوں نے اس جہاز کے تمام سواروں کو جن میں بچے اور عورتیں بھی تھیں قتل کر دیا۔

واسکو دے گاما نے کالی کٹ پہنچ کر (۲۹۔ اکتوبر ۱۵۰۲ء) زیمورن سے مطالبہ کیا۔ کہ وہ تمام موپلوں اور عربوں کو اپنی ریاست سے نکال دے۔ زیمورن نے یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ کالی کٹ ایک مدت سے

آزاد بندرگاہ چلی آرہی تھی۔ زیمورن نے واسکوڈے گاما سے کہہ دیا کہ اگر انہیں یہ شرط منظور نہیں۔ تو وہ کالی کٹ سے چلے جائیں۔ واسکوڈے گاما نے چاول لے جانے والے جہازوں کے آٹھ سو ملاحوں کو پکڑ کر ان سب کو قتل کروا دیا۔ ملاحوں کو قتل کرنے کے بعد اس نے دو دن تک کالی کٹ پر گولے برسائے۔ مالاباری فوج کے پاس دو توپیں تھیں۔ لیکن وہ ٹھیک نشانہ نہیں باندھ سکتے تھے۔ تیسرے دن واسکوڈے گاما کوچین کی طرف چل دیا۔ واسکو نے کوچین اور کنانور کی پرتگیزی فیکٹریوں کو مستحکم کرنے کے بعد یکم ستمبر ۱۵۰۲ء کو پرتگال کی راہ لی۔ مالابار کے ساحل میں پرتگیزوں کے تجارتی مفاد کی نگرانی کے لئے سودرے کی کمان میں ایک بیڑے کو پیچھے چھوڑ دیا گیا۔ واسکوڈے گاما کی واپسی کے بعد زیمورن نے کوچین کے راجے سے کہا۔ کہ وہ پرتگیزوں کو نکال دے۔ لیکن کوچین نے کالی کٹ کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ زیمورن نے کوچین پر حملہ کر دیا۔ ابتدائی کی لڑائی میں زیمورن نے کوچین کی فوج کو شکست دی۔ اس لڑائی میں کوچین کا راجکمار نارائن مارا گیا۔ اسی اثنا میں البوکرک پرتگال سے کمک لے کر پہنچ گیا۔ اس نے کوچین کے راجے اور پرتگیزوں کو ایک جزیرے سے مندر میں پناہ گزیں پایا۔ البوکرک نے زیمورن کو شکست دے اسے کوچین کے ساتھ سمجھوتہ کرنے پر مجبور کر دیا البوکرک تجارتی جہازوں کو لاد کر پرتگال چلا گیا۔ لیکن بہت جلد کوچین اور کالی کٹ کے تعلقات خراب ہو گئے۔ زیمورن کے بیڑے کے کمانڈر علی خواجہ نے کوچین پر حملہ کیا۔ لیکن اس نے شکست کھائی۔ اب پرتگیزی بیڑہ کالی کٹ کی طرف بڑھا۔ پرتگیزوں نے کالی کٹ پر پھر گولے برسائے۔

مشرق میں پرتگال کا مفاد اس حد تک پہنچ گیا تھا۔ کہ اب ہر سال نئے بیڑے کی روانگی ناکافی محسوس کی جانے لگی۔ چنانچہ تین سال کے لئے ایک وائسرائے مقرر کئے جانے کا فیصلہ کیا گیا۔ فرانسسکو دا المیدہ ہندوستان میں پرتگالیوں کا پہلا وائسرائے تھا۔ المیدہ ایک بہت بڑے بیڑے اور پندرہ سو سپاہیوں کو لیکر ہندوستان کی طرف چل دیا۔ چونکہ وہ کلوا، انجادیو، کنانور اور کوچین میں پرتگالی قلعے بنانا چاہتا تھا۔ اس لئے وہ بہت سے معماروں کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ کلوا میں ایک قلعہ بنانے اور مشرقی افریقہ کے بہت سے ساحلی شہروں کو لوٹنے کے بعد وہ ۱۳ ستمبر ۱۵۰۵ء کو انجادیو پہنچا۔ یہاں بھی ایک قلعہ کھڑا کرنے کے بعد المیدہ نے کنانور میں بھی ایک قلعہ بنوایا۔ اسی قلعہ میں المیدہ کے بیٹے لورینسو کو ایک اطالوی نے بتایا۔ کہ پرتگالیوں کی سمندری سرگرمیوں کو ختم کرنے کے لئے زیمورن ایک بہت بڑا جنگی بیڑہ تیار کر رہا ہے۔ مارچ ۱۵۰۶ء کو زیمورن کا یہ بیڑہ عبدالرحمٰن کی کمان میں مالابار کے ساحل سے روانہ ہوا۔ پرتگالیوں سے معمولی لڑائی کے بعد یہ بیڑہ کالی کٹ چلا گیا۔

پرتگالیوں کی ان سمندری سرگرمیوں اور پرتگال کے سمندری لٹیروں کی لوٹ مار نے مصری بندرگاہوں کی چنگی میں نمایاں کمی کر دی تھی۔ مصر کے مملوک سلطان قانصوہ نے پرتگالیوں سے لڑنے کے لئے ایک جنگی بیڑہ تیار کیا۔ یہ بیڑہ میر ہاشم کی کمان میں ۲۰ ستمبر ۱۵۰۷ء کو دیو پہنچا۔ دیو کے گورنر ملک ایاز نے میر ہاشم کی

www.taemeernews.com

پوری امداد کا وعدہ کیا۔ چنانچہ میر ہاشم اور ملک ایاز نے پرتگالیوں کے بیڑے کو شکست دی۔ اس سمندری لڑائی میں پرتگال کے وائسرائے کا بہادر بیٹا لورنیٹو مارا گیا۔ المیدہ اپنے بیٹے کا انتقام لینے کے لئے کوچین سے چل دیا۔ اس اثنا میں البوکرک سقوطرہ اور ہرمز سے ہوتا ہوا بحر ہند میں داخل ہو چکا تھا۔ ساحلی شہروں کو لوٹتا ہوا المیدہ دیو (گجرات کے جنوب میں ایک چھوٹا سا جزیرہ) کی طرف بڑھا۔ دیو کے پانیوں میں پرتگالیوں اور اتحادیوں میں ۲ فروری ۱۵۰۹ء کو لڑائی ہوئی۔ اس لڑائی میں اتحادیوں کو شکست ہوئی۔ پرتگالی بیڑہ جس طرح لوٹ مار کرتا ہوا آیا تھا۔ اسی طرح لوٹ مار کرتا ہوا کوچین پہنچ گیا۔ یکم دسمبر ۱۵۰۹ء کو المیدہ (۱۵۰۵ء - ۱۵۰۹ء) کوچین سے پرتگال روانہ ہوا۔

البوکرک (۱۵۰۹ء - ۱۵۱۵ء) کو پرتگال کے بادشاہ نے گجرات کے ساحل سے راس کماری کے ساحل تک کا گورنر مقرر کیا تھا۔ شاہِ پرتگال نے وائسرائے کا عہدہ اڑا دیا تھا۔ البوکرک نے مشرق میں پرتگالی سلطنت قائم کرنے کے لئے سب سے پہلے کالی کٹ پر حملہ کیا۔ لیکن شکست کھائی۔ اس لڑائی میں مالاباریوں نے پرتگالیوں کے سامان جنگ پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس شکست کے بعد البوکرک نے اپنی قوت کو منظم کرنے کے لئے پرتگال سے فوجی افسروں کو بلا بھیجا۔ اس نے اپنی مالی حالت کو بہتر بنانے کے لئے موپلا جہازوں کو تجارت کی اجازت دے دی۔ اگلے سال البوکرک نے گوا پر قبضہ کر لیا۔ پرتگالی ابھی گوا کی دولت کو لوٹنے میں مصروف تھے۔ کہ اسمٰعیل عادل شاہ نے گوا کو پرتگالیوں سے چھین لیا۔ جب پرتگال سے کمک پہنچ گئی۔ تو البوکرک گوا پر پھر حملہ کرنے کے لئے کنانور سے نکلا۔ کپتان رسول خان نے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا۔ لیکن شکست کھائی۔ پرتگالیوں نے گوا پر قابض ہوتے ہی ایک قلعہ، ایک ہسپتال اور ایک گرجا بنا ڈالا۔ اب اس نے ملاکا پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ فروری ۱۵۱۲ء میں وہ کوچین میں تھا۔ اس سال البوکرک کو پرتگال سے جو کمک آئی تھی۔ اس میں پہلی مرتبہ بندوق بھی آئی تھی۔ اب البوکرک نے گوا کو اپنی راجدھانی بنا لیا۔ پرتگالیوں کو بہت جلد گوا کی اہمیت کا اندازہ ہو گیا۔ البوکرک کے دربار میں ہرمز، سیام، پیگو، گجرات اور حبشہ کے سفیر دکھائی دینے لگے۔ ۱۵۱۵ء میں پرتگالیوں نے ہرمز پر بھی قبضہ کر لیا۔ ایک سال پہلے انہوں نے ملاکا پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ ہرمز سے واپسی پر البوکرک ۱۶ دسمبر ۱۵۱۵ء کو اس جہاز ہی میں مر گیا۔ جو گوا کے سامنے لنگر ڈالے ہوئے تھا۔ اگلے دن اسے گوا کے گرجا میں دفن کر دیا گیا۔ البوکرک اور شاہِ پرتگال کے اختلافات کی وجہ سے البوکرک اپنی سرگرمیوں کو تیز نہیں کر سکتا تھا۔ شاہ پرتگال نے البوکرک کی پالیسی کا اس وقت اندازہ لگایا۔ جب وہ اس دنیا سے جا چکا تھا۔ جب شاہ پرتگال کو البوکرک کی موت کی خبر سنائی گئی تو اس نے کہا۔ کہ جب تک اس کی ہڈیاں وہاں ہیں۔ ہندوستان محفوظ ہے۔" پچاس سال بعد البوکرک کی نعش لزبن پہنچائی گئی۔ البوکرک نے گوا کو پرتگالیوں کا صدر مقام بنا کر ہندوستان کے ایک قلعہ پر قبضہ کر لیا ہے" المیدہ کا مقصد اس سے زیادہ اور کچھ نہیں تھا۔ کہ مشرق و مغرب کی تجارت پرتگالیوں کے ہاتھ

www.taemeernews.com

میں چلی جائے۔ لیکن البوکرک مشرق میں ایک پرتگالی سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ اس سلطنت سے پرتگالیوں کے ہاتھ میں ساری دنیا کی تجارت آجائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے اس نے کئی ایک بندرگاہوں پر قبضہ کر کے وہاں پرتگالی قلعے کھڑے کئے۔ اور ان کی دیواروں پر پرتگالی پھریرے لہرائے۔ جب پرتگال کے بادشاہ نے البوکرک سے یہ کہا۔ کہ وہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ پالیسی اختیار کرے۔ تو اس نے اپنے بادشاہ کو یہ جواب دیا تھا کہ ہندوستان میں مختلف مذہبوں کے لوگ ایک دوسرے سے اس قدر قریب ہیں۔ کہ انہیں الگ الگ نہیں کیا جا سکتا" چھ سال کی مدت میں البوکرک نے ہندوستان کی سرزمین پر پرتگالیوں کے قدم مضبوط کر دیئے۔ گو ہند میں ان کی قوت بہت مضبوط ہو گئی۔ البوکرک نے گوا کی دیسی آبادی کے لئے اسکول کھولے۔ اس نے ستی کو قانوناً بند کر دیا۔ البوکرک نے ہندوستان میں پرتگالیوں کی نوآبادیاں قائم کرنے کیلئے پرتگالیوں کو دیسی عورتوں کے ساتھ شادی کرنے کی ترغیب دی۔

البوکرک کے بعد شاہ پرتگال نے لوپوسوریز (۱۵۱۵ - ۱۵۱۸) کو گورنر مقرر کیا۔ سوریز اپنے پیش رو کی خوبیوں سے خالی تھا۔ وہ بہت کمزور، بے ہمت اور بیکار سا انسان تھا۔ جنوری ۱۵۱۶ء میں پرتگال سے یہ اطلاع آئی۔ کہ مصریوں کا ایک بہت بڑا جنگی بیڑا پچھلی لڑائی کا بدلہ لینے کے لئے تیار ہو رہا ہے۔ چنانچہ ایک سال تک تیاری کرنے کے بعد سوریز اپنے بیڑے سمیت بحر احمر کی طرف چل دیا۔ یہ بیڑا گیارہ دن تک جدہ کی بندرگاہ کے قریب لنگر ڈالنے کے بعد واپس ہوا۔ کاران پہنچ کر پرتگالیوں کے پاس بہت کم خوراک رہ گئی کئی پرتگالی بھوکے مرنے لگے۔ زندوں میں اتنی طاقت نہیں رہی تھی۔ کہ وہ مُردوں کو دفن کر سکتے۔ یہ تباہ حال بیڑا بڑی مشکل سے ہرمز پہنچا۔ ہرمز سے پرتگالی گورنر نے ہندوستان کی راہ لی۔ ۱۵۱۸ء میں پرتگالیوں نے سیلون میں بھی ایک قلعہ بنایا۔

دیگو لوپیز (۱۵۱۸ سے ۱۵۲۱) نے ہرمز سے واپسی پر دیو کے گورنر ملک ایاز سے ملاقات کی۔ دیگو لوپیز دیو پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن دیو کی حفاظتی تیاریوں نے اسے اپنے ارادوں سے باز رکھا۔ دیگو لوپیز کے عہد میں گوا میونسپلٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ میونسپل دستور وہی تھا۔ جو لزبن میں رائج تھا۔ میونسپلٹی کے ممبروں کا ہر سال چناؤ ہوتا تھا۔ خاص خاص پیشوں کی نمائندگی کا بھی خیال رکھا گیا تھا۔ لوپیز کے جانشین دوریت (۱۵۲۱ - ۱۵۲۴) کے عہد میں پرتگالیوں کی حالت ابتر ہوتی چلی جا رہی تھی یہاں تک کہ پہلے پرتگالی وائسرائے واسکو دے گاما کو حالات پر قابو پانے کے لئے ہندوستان بھیجا گیا۔ وہ ستمبر ۱۵۲۴ء میں ہندوستان پہنچا لیکن تین مہینوں کے بعد وہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ واسکو دے گاما نے ہلکے جہازوں کا ایک بیڑہ تیار کرانا شروع کر دیا تھا۔ ۱۵۳۸ء میں اس کی ہڈیوں کو کوچین سے پرتگال پہنچا دیا گیا۔

اب گومی بیڑے کا کپتان ہنریک (۱۵۲۴ سے ۱۵۲۶) پرتگیزی مقبوضات کا گورنر مقرر ہوا۔ اس کے عہد میں مالابار کے ساحلوں پر لڑائیاں ہوتی رہیں اور کالی کٹ کے پرتگالی قلعہ کو زمورن کے سپاہیوں نے

www.taemeernews.com

مسمار کر دیا تھا۔ لوپو واز نے بھی گجرات کی بندرگاہ دیو پر قبضہ کرنا چاہا۔ لیکن ناکام رہا۔ بہرحال لوپو واز نے اپنے جانشین نونو (۱۵۲۹ - ۱۵۳۸) کے لئے ایک مضبوط بیڑا چھوڑا۔

نونو کے عہد میں دیو پرتگالیوں کی سرگرمیوں کا مرکز بنا رہا۔ چنانچہ اس مرکز سے قریب ہونے کے لئے کوچین کی جگہ گوا کو ہیڈ کوارٹر بنایا گیا۔ اب گوا پرتگالی ہندوستان کی راجدھانی تھا۔

جب پرتگالی پہلی مرتبہ ہندوستان پہنچے تھے۔ تو اس وقت سلطان محمود گجرات کا حکمران تھا۔ اب اس کا پوتا سلطان بہادر شاہ گجرات کا حکمران تھا۔ دیو اس کی مملکت کا ایک حصہ تھا۔ بہادر شاہ کی طرف سے ملک توغان دیو کا حاکم تھا۔ جونہی نونو کا بیڑا دیو کی طرف بڑھا، بحر روم کا مشہور جہازی مصطفیٰ اپنے بیڑے سمیت دیو میں لنگر انداز ہو چکا تھا۔ مصطفیٰ کے جنگی جہازوں نے پرتگالیوں پر گولے برسائے۔ پرتگالی بیڑہ شکست کھا کر دیو سے بھاگ نکلا۔ سلطان بہادر شاہ نے مصطفیٰ کو رومی خان کا خطاب دے کر اپنے بیڑے کا کپتان مقرر کر دیا۔ نونو نے لڑائی میں شکست کھانے کے بعد ڈپلومیسی سے دیو پر قبضہ کرنا چاہا۔ شمال سے ہمایوں بڑھ رہا تھا۔ اور جنوب میں پرتگالیوں نے دباؤ ڈال رکھا تھا۔ ان حالات کے ہوتے ہوئے بہادر شاہ نے پرتگالیوں سے پر امن رہنے کا وعدہ لے لیا۔ سلطان نے بسین کو پرتگالیوں کے سپرد کر دیا۔ ہمایوں سے شکست کھانے کے بعد بہادر شاہ نے دیو میں نونو سے ملاقات کی۔ اس ملاقات میں بہادر شاہ نے پرتگالیوں کو دیو میں قلعہ بنانے کی اجازت دے دی جب شمالی ہندوستان کے حالات نے ہمایوں کو واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ تب پرتگالیوں اور بہادر شاہ میں ایک لڑائی ہوئی جس میں بہادر شاہ مارا گیا۔ اس لڑائی کے بعد پرتگالیوں نے دیو پر قبضہ کر لیا۔ سلطان بہادر شاہ نے عثمانی سلطان سے امداد لینے کے لئے جو ایلچی بھیجا تھا۔ اس کے قسطنطنیہ پہنچنے سے پہلے سلطان بہادر شاہ کی موت کی خبر وہاں پہنچ چکی تھی ترکی بیڑہ ۲۲ جون ۱۵۳۸ء کو سویز سے روانہ ہوا۔ اس بیڑے میں ۷۲ جہاز اور ساڑھے چھ ہزار سپاہی تھے۔ سلیمان پاشا اس بیڑے کا کمانڈر تھا۔ عدن پر قبضہ کرنے کے بعد ۴ ستمبر کو یہ بیڑہ دیو پہنچا۔ پرتگالیوں کو اس بیڑے کے آنے کی خبر مل چکی تھی۔ چنانچہ انہوں نے بھی اپنی ساری سمندری طاقت کو جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ سلیمان پاشا نے دیو کا محاصرہ کر لیا

اسی اثنا میں نونو کی جگہ گارشیا ہندوستان کے پرتگالی مقبوضات کا وائسرائے مقرر ہو چکا تھا۔ جب وہ گوا پہنچا۔ تو پرتگالی بیڑہ دیو جانے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ ترکی اور پرتگالی بیڑوں میں لڑائی ہوئی۔ اس لڑائی میں دونوں طرف سے بہادری کے جوہر دکھائے گئے۔ پرتگالیوں کے حفاظتی دستے نے کئی ہفتوں تک محاصرین کا مقابلہ کیا۔ جس سے گجراتیوں اور ترکوں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ چنانچہ ۶ نومبر کی صبح کو سلیمان پاشا نے بحر روم کی راہ لی۔ ترکوں کے چلے جانے کے بعد گجراتی فوجیں دیو کے گرد و نواح سے ہٹ گئیں۔ ۲۰ نومبر کو گارشیا نوے جہازوں کا بیڑہ لے کر دیو کی طرف چل دیا۔ آدھا بیڑہ طوفان کی نذر کرنے کے بعد جنوری ۱۵۳۹ء میں گارشیا دیو پہنچا۔ ترکی توپوں کی گولا باری سے دیو کا قلعہ تباہ ہو چکا تھا۔ پرتگالی وائسرائے نے سب سے پہلے قلعہ کی مرمت کروا کر اسے پہلے سے زیادہ مضبوط بنا دیا گارشیا نے گجرات کے سلطان کے ساتھ صلح کی بات چیت شروع کی۔ چنانچہ ۱۱ مارچ ۱۵۳۹ء کو گجراتیوں اور پرتگالیوں میں معاہدہ ہو گیا۔ پرتگالیوں کا پلہ بھاری دیکھ کر کالی کٹ کے راجہ نے بھی پرتگالیوں کی تمام شرطیں مان

www.taemeernews.com

کر ان سے صلح کرلی۔

گارشیا کی موت کے بعد واسکو دے گاما کا بیٹا استاد لو دے گاما (۱۵۴۰ - ۱۵۴۲) پرتگالی مقبوضات کا گورنر مقرر کیا گیا۔ استاداؤ نے آتے ہی سویز پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ پہلی جنوری ۱۵۴۱ء کو پرتگالی بیڑہ بحر احمر کی طرف چل دیا۔ ۲۲ اپریل کو پرتگالی جہاز سویز کے سامنے تھے۔ ہندوستان میں پرتگالیوں کے پہنچ جانے کے بعد سویز کی تجارتی حیثیت گھٹتی چلی جا رہی تھی۔ سویز تیس یا چالیس جھونپڑیوں کی ایک بستی رہ گئی تھی۔ سویز میں چونکہ ترکوں کا ایک جنگی بیڑہ موجود تھا۔ پرتگالیوں نے ترکوں سے لڑے بغیر اپنا رخ بدل لیا۔ پرتگالی بیڑہ ۸ اگست کو گوا پہنچ گیا۔ استاداؤ کے جانشین مارتیم افانسو (۱۵۴۲ - ۱۵۴۵) نے جیا نگر کے ایک شہر کو لوٹ کر اپنے دوست کو دشمن بنا لیا۔ مارتیم نے پرتگالیوں کو لوٹ مار کی عام اجازت دے رکھی تھی یہی وجہ ہے۔ کہ اس کے جانشینوں کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

مارتیم افانسو کے بعد ژاؤ دے کاسترو (۱۵۴۵-۱۵۴۸) کا عہد حکومت قابل ذکر ہے۔ ژاؤ نے اپنے آپ کو دو مشکلوں میں گھرا ہوا پایا۔ بیجا پور کا سلطان ابراہیم عادل شاہ گوا پر چڑھائی کرنے کی تیاری کر رہا تھا اور گجرات کا سلطان دیو کا محاصرہ کئے ہوئے تھا۔ ایسا دکھائی دے رہا تھا۔ کہ مغربی ہندوستان کے تمام حکمران پرتگالیوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لئے متحدہ محاذ بنا رہے تھے۔ ان حالات کے باوجود ژاؤ نے میر علی خاں کو سلطان بیجا پور کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر بیجا پور کی فوج سالسٹ پر قبضہ کرنے کے لئے آگے بڑھی۔ لیکن پرتگالیوں نے اسے شکست دی۔

خواجہ ظفر (پرتگالیوں کا کوجی مسافر) نے دیو کے پرتگالی قلعہ کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ پرتگالی سپاہیوں نے اپنے قلعہ کی حفاظت میں ایک مرتبہ پھر غیر معمولی بہادری کا ثبوت دیا۔ خواجہ ظفر لڑائی ہی میں مارا گیا۔ اس کے مرنے پر رومی خاں نے پرتگالی قلعہ کے محاصرے کو جاری رکھا۔ ژاؤ دے کاسترو نے گجراتیوں کو شکست دی۔ اب پرتگالیوں نے بھڑوچ اور سورت کو لوٹا۔ ژاؤ نے بیجا پور کو بھی شکست دی۔

اس زمانہ میں حکومت کے پرتگالی ملازموں نے ذاتی کاروبار سے روپیہ پیدا کرنا شروع کر دیا تھا۔ ژاؤ نے افسروں کی تنخواہیں مقرر کر کے انہیں ذاتی کاروبار کرنے سے روک دیا۔ مشہور ہے۔ کہ جب دیو کے قلعہ کی حفاظت کے لئے اسے روپے کی ضرورت پڑی۔ تو اس نے اپنی داڑھی کے بال گرو رکھ کر گوا میونسپلٹی سے قرض لیا تھا۔

ژاؤ دے کاسترو کی موت کے تقریباً ۳۵ برس بعد پرتگال کی آزادی کا خاتمہ ہو گیا۔ ہسپانیہ کے فلپ دوم نے پرتگال پر قبضہ کر لیا تھا۔ پرتگال کی سیاسی آزادی کے ختم ہو جانے پر بھی پرتگالی اپنی تجارتی فتوحات سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ ۱۵۹۵ء تک مشرق کی تجارت پر پرتگالیوں ہی کا قبضہ رہا۔ یورپ کی مختلف قومیں ایشیائی اجناس کو اپنی اپنی ضرورت کے مطابق لزبن ہی سے خریدتی تھیں۔ لیکن بہت جلد ولندیزی اور انگریز مشرق

www.taemeernews.com

کی تجارت سے مالا مال ہونے کے لئے میدان میں نکل آئے۔

ژاؤ دے کاسترو کے بعد پرتگالی صرف دمن پر قبضہ کر سکے۔ سترہویں صدی کے شروع ہی میں ولندیزیوں اور انگریزوں نے پرتگالیوں کو ہندوستان کی کئی بندرگاہوں سے نکال دیا تھا۔ سترہویں صدی کے وسط تک ایشیائی تجارت پرتگالیوں کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔

پرتگالی جتنی جلدی ابھرے تھے۔ اتنی جلدی گرے۔ پرتگالیوں کے زوال کا سب سے بڑا سبب ہسپانیہ کے فلپ دوم کے عہد میں پرتگال اور ہسپانیہ کا الحاق ہے۔ جب ہسپانیہ ولندیزیوں اور انگریزوں سے لڑ رہا تھا تو اس وقت پرتگال کو بھی ان لڑائیوں میں حصہ لینا پڑا۔ پرتگال ایسے چھوٹے ملک کے لئے اپنے بیڑوں کے لئے سپاہی مہیا کرنا دشوار ہو گیا۔ چنانچہ جب ولندیزی اور انگریزی بیڑوں نے ہندوستان کا رخ کیا۔ تو پرتگالی ان کا مقابلہ نہ کر سکے۔ ولندیزیوں اور انگریزوں کے علاوہ مغل اعظم نے ۱۶۲۹ء میں ہگلی پر قبضہ کر کے ہندوستان میں پرتگالیوں کی بحری قوت پر بہت بڑی ضرب لگائی۔ سترہویں صدی کے شروع میں پرتگالیوں کا بحری اور تجارتی اقتدار مٹنا شروع ہوا۔ آج گوا، دمن اور دیو پرتگالیوں کی ان سرگرمیوں کی یاد ہیں جنہیں واسکو دے گاما البوکرک اور ژاؤ دے کاسترو نے جاری کیا تھا۔

ہندوستان کی سمندری تجارت پر پرتگالیوں کا ایک سو سال تک قبضہ رہا۔ لیکن یہ کہنا کہ اس مدت میں پرتگالیوں نے ہندوستان میں کوئی سلطنت قائم کر لی تھی۔ سراسر غلط ہے۔ ہندوستان میں نہ تو ان کی کوئی سلطنت تھی۔ اور نہ انہیں ہندوستان کے مغربی ساحلوں کی حکومتوں کی سیاست میں زیادہ دخل ہو سکا۔ انہوں نے چند ایک ساحلی بستیوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن ان کا اقتدار ان کے ساحلی بیڑوں سے چند میل آگے نہ بڑھ سکا۔ ان کے قبضے میں صرف گوا کا اہم علاقہ تھا۔ پرتگالی بڑی مشکل سے سو سال میں زمورن کی سمندری طاقت کو کمزور کر سکے۔ لیکن ٹھیک اس وقت ولندیزوں نے انہیں بحرہ ہند کے پانیوں سے نکال دیا۔ ادھر ادھر واقع چند پرتگالی قلعوں کو پرتگال کی سلطنت نہیں کہا جا سکتا۔

پرتگالیوں نے اتنی مدت تک بحر ہند کی تجارت پر اس لئے قبضہ جمائے رکھا۔ کہ عثمانی ترکوں نے مصر کو فتح کرنے کے بعد اپنی سمندری سرگرمیوں کو بحر ہند کی جگہ مغربی بحر روم میں جاری رکھا۔ اس اقدام کا یہ نتیجہ نکلا۔ کہ ٹھیک اس وقت جب عثمانیوں کا امیر البحر بحرہ روم کو ترکی جھیل بنائے ہوئے تھا۔ پرتگالیوں نے بحرہ ہند میں اپنی قوت کو مضبوط کر لیا تھا۔ ایک دو مرتبہ عثمانی سلاطین نے بحرہ ہند کی طرف توجہ کی۔ لیکن وہ یورپ کو فتح کرنے میں اتنے مصروف تھے۔ کہ پرتگالیوں سے کئی گنا زیادہ اور طاقت ور بیڑہ رکھنے کے باوجود انہوں نے بحر ہند کی طرف توجہ نہ کی۔ عثمانی ترکوں کی اس غفلت نے پرتگالیوں کو سمندری اقتدار کا موقعہ دیدیا۔ ہندوستان کی چھوٹی چھوٹی ساحلی ریاستوں کے مقابلے پر تو پورے اترتے تھے۔ لیکن جب انہیں ولندیزوں اور انگریزوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ تو ان کی سمندری قوت کا طلسم ٹوٹ گیا۔

www.taemeernews.com

پرتگالیوں کو مشرق کی تجارت سے نکال دیا گیا۔ اور یہی وہ واقعہ ہے۔ جسے پرتگال کے بعض مورخ ہندوستان میں پرتگالی سلطنت کا خاتمہ قرار دیتے ہیں۔ ہندوستان میں پرتگال کی نہ کوئی سلطنت تھی۔ اور نہ کبھی کسی نے اس سلطنت کو مٹایا۔ پرتگالیوں اور مالابار میں ایک سو پچاس سال تک تعلقات رہے۔ پرتگالیوں کے ان تعلقات نے مالابار کی سیاسی، معاشی اور سماجی زندگی پر یقیناً اثر کیا۔

جب پرتگالی مالابار کے ساحل پر پہنچے تھے۔ تو اس وقت مالابار کئی ایک چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ مالابار کے حکمرانوں میں جو کنا نور سے راس کماری تک پھیلے ہوئے تھے۔ کالی کٹ، کنا نور اور دنادر کے راجے بہت زیادہ سیاسی اہمیت رکھتے تھے۔ ان تینوں میں سے کالی کٹ کے زیمورن (راجہ) کی ریاست سب سے بڑی تھی۔ زیمورن کی یہ کوشش تھی۔ کہ وہ سارے مالابار کو متحد کر کے ایک مرکزی بادشاہت قائم کرے۔ لیکن پرتگالیوں کے آنے سے زیمورن اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ پرتگالیوں نے مالابار کے چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کی مدد کر کے زیمورن کے سیاسی اقتدار کو بڑھنے سے روک دیا۔ پرتگالیوں نے چھوٹے چھوٹے ساحلی سرداروں کے اقتدار کو اس لئے بڑھایا۔ کہ اس سے بڑے بڑے حکمرانوں کو نقصان پہنچایا جائے۔ ان چھوٹے چھوٹے سرداروں نے پرتگالیوں کی مدد کے بھروسے پر بڑے بڑے حکمرانوں سے لڑائیاں مول لیں۔ چنانچہ پرتگالیوں نے ڈیڑھ سو سال کی مدت میں ساحلی سرداروں کو ساحلی راجاؤں میں بدل دیا۔ پرتگالیوں کے بنائے ہوئے یہ نئے حکمران پرتگالیوں کے تجارتی مفاد کے رکھوالے تھے راجاؤں کے اس نئے طبقے نے زیمورن کی شاہی قوت کو کمزور کر دیا۔ اور مالابار ایک مرتبہ پھر چھوٹے چھوٹے راجاؤں میں بٹ گیا۔

پرتگالیوں نے جہاں زیمورن کے سیاسی اقتدار کو بڑھنے سے روک دیا۔ وہاں ان کی تجارتی سرگرمیوں نے مالابار کی اکانومی پر خوشگوار اثر ڈالا۔ ہندوستان میں پرتگالیوں کے آنے سے پہلے عربوں اور موپلوں کے ذریعہ مالابار کی خام پیداوار یورپی ملکوں تک پہنچائی جاتی تھی۔ تاجروں کو چونکہ بہت لمبا سفر کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے یہ اجناس یورپ کی منڈیوں میں سستے داموں فروخت نہیں ہو سکتی تھیں۔ لیکن جب پرتگالیوں نے ان اجناس کو براہ راست یورپ کی منڈیوں تک پہنچانا شروع کر دیا۔ تو ان اجناس کی قیمتوں میں کمی آنے سے ان کی مانگ زیادہ ہوتی چلی گئی جہاں عربوں کو ان اجناس کی کاشت میں رسائی نہیں ہوتی تھی۔ وہاں پرتگالیوں نے اپنے قلعوں کی بدولت مقامی لوگوں کو ان اجناس کی زیادہ سے زیادہ کاشت پر زور دیا۔ زمین کے ہر اس ٹکڑے میں جہاں کھیتی باڑی ہو سکتی تھی۔ کالی مرچ اور ادرک کی کاشت ہونے لگی۔ ان دو اجناس کی بڑھتی ہوئی تجارت سے کاشتکاروں کو بھی فائدہ ہونے لگا۔

پرتگالیوں نے مالابار میں جس نئے درخت کی کاشت کی تھی۔ وہ آج بھی وہاں "فرنگی درخت" کہلاتا ہے۔ وہ مالابار میں تمباکو لائے۔ اور وہاں اس کی کاشت کروائی۔ انہوں نے ناریل کی کاشت میں بہت سی مفید تبدیلیاں کیں۔ پرتگالیوں کی کوششوں سے مالابار میں ناریل کی کاشت بہت بڑھ گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ جب سولہویں

www.taemeernews.com

صدی کے شروع ہی میں انہیں پتہ چلا۔ کہ جہازوں کے رسّوں کے لئے ناریل بہت مفید ہے۔ تو اس سے مالابار میں ناریل کی کاشت وسادر کے لئے ہونے لگی۔ پرتگالیوں کے علاوہ دوسری یورپی قوموں کے جہازی بھی ناریل کے رسّے استعمال کرنے لگے۔ آج بھی مالابار سے ناریل کی بہت بڑی مقدار درساور کی جاتی ہے۔ مالابار میں ناریل کی کاشت کو بہتر بنانے کے لئے پرتگالیوں نے افریقی ناریل کے بیجوں کو مالابار کی زمین میں بویا۔ ناریل کی بڑھتی ہوئی مانگ نے مالابار کے ساحلی علاقوں میں ناریل کے درختوں کو قطار اندر قطار کھڑا کر دیا۔

پرتگالیوں کی تجارتی سرگرمیوں نے جہاں مالابار کی سیاست اور اکانومی کو متاثر کیا۔ وہاں انہوں نے مالاباریوں کی مجلسی زندگی پر بھی اثر کیا۔ کوچین۔ کالی کٹ اور دوسرے شہروں میں یورپی طرز کے مکان بننے لگے مالابار کے راجاؤں نے یورپی طرز کے توپ خانے قائم کئے۔ کئی ایک نئے شہر آباد ہو گئے۔ کوچین کی عمارتی رونق پرتگالیوں کے دم سے قائم ہوئی۔ انہوں نے وہاں سکول اور کالج قائم کئے۔ ان کالجوں میں لاطینی اور پرتگالی پڑھائی جاتی تھی کوچین کے راجے پرتگالی میں نہ صرف بات چیت کر سکتے تھے۔ بلکہ وہ اس زبان میں مراسلت بھی کرتے تھے کالی کٹ میں جب انگریزوں نے تجارتی کوٹھی بنائی۔ تو اس وقت زمورن اور انگریزی فیکٹری کے افسر میں پرتگالی ہی میں مراسلت ہوئی۔ پرتگالیوں نے بھی اپنی سیاسی اور تجارتی ضرورتوں کے لئے ملیالم سیکھی۔ ملیالم اور پرتگالی دونوں میں ایک دوسرے کے بہت سے لفظ گھل مل گئے۔ کالی کٹ اور کوچین سے بہت دور دلی اور لاہور کے بازاروں میں آج بھی پرتگالی کے چند الفاظ بولے جاتے ہیں۔ الماری، کمرہ، بالٹی، بوتل، پیپا، چابی، گرجا اور گودام کے الفاظ منہ سے نکالتے وقت کس کے ذہن میں آ سکتا ہے۔ کہ یہ لفظ پرتگال سے آئے ہوں گے۔ جس زمانہ میں بحر ہند کی تجارت پر پرتگالیوں کا قبضہ تھا۔ اسی زمانہ میں شمالی ہندوستان میں ایک نئی سلطنت قائم ہو رہی تھی۔ پرتگالیوں مالاباریوں اور گجراتیوں سے رخصت ہو کر اب ہم مغلوں کی سلطنت میں داخل ہوتے ہیں ⁂

جس دن ایک زبردست سیاسی لیڈر اور ایک سفاک انقلابی لیڈر دونوں کو جلاوطن کرنے کے لئے جہاز پر بٹھلایا گیا۔ تو اس دن باہمی گفتگو سے انہیں پتہ چلا۔ کہ ان دونوں کے اصول دراصل ایک ہی ہیں ⁂

(ایک فرانسیسی خطیب)

www.taemeernews.com

پال رچرڈ

وطن پرست

سب سے افضل "ماں" اپنا وطن ہے۔ لیکن کون چاہتا ہے کہ اس کی ماں وحشی ظالم اور چور ہو؟

اس کے باوجود ہر ملک میں ایسے وطن پرست موجود ہیں جو کبھی اس قدر مغرور نہیں ہوتے جب تک اُن کی ماں دوسروں کے دھن دولت پر قبضہ نہ جما لے اور بعض کمزور اور کم مسلح قوموں کو مارے پیٹے یا قتل نہ کرے اور بستی آبادیوں کو غلام نہ بنا دے۔ اُس وقت وطن پرستوں کی گردن تنی ہوئی دکھائی دیتی ہے جب ان کی ماں کوئی ایسی حرکت کر بیٹھے کہ اگر ان کے بیٹے اس کے مرتکب ہوتے تو شرم سے ڈوب مرتے ——

یہ وطن پرستی کی شان نہیں ہے۔ وطن پرستی ملک کو شکاری کتے کی طرح مسلسل شکار کرنے اور مارنے پر اُکساتے رہنا ہی نہیں ہے۔ اور نہ ہی اُس وقت قصیدے گاتا ہے جبکہ اُن کی ماں جنگلوں میں کوئی نیا شکار لیکر تعاقب سے واپس لوٹے۔

سچے وطن پرست وہ ہیں جو ان حرکتوں پر پسینہ پسینہ ہو جاتے ہیں جن پر دوسرے ناز کرتے ہیں۔ جو مادر وطن کے رویے کا اُس وقت تک ماتم کرتے ہیں جب وہ بُرے طریقے سے حاصل کئے گئے فائدوں سے اپنے آپ کو مالا مال کرتی ہے۔ کیونکہ ان کی نگاہوں میں وہ اس وقت بلند نہیں بلکہ معتبر تر، حقیقی حسن و دولت سے مردم اور اپنی اخلاقی بیسوائی کے چیتھڑے پہلے ہوئے دکھائی دیتی ہے

تمام ملکوں میں وہ سچے وطن پرست کہاں ہیں جو اپنی مادر وطن سے محبت کرتے ہیں اور اسے دیانت دار اور بے عیب دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور اسے کسی گرا دینے والی حرکت کی اجازت نہیں دے سکتے۔ اور نہ اس کا چہرہ خون اور کیچڑ سے لتھڑا ہوا دیکھنا گوارا کر سکتے ہیں۔

مترجمہ:۔ شریف کنجاہی

www.taemeernews.com

ظہیر کاشمیری

ادب کا مادّی نظریہ

"وہ احکام" اور "پہاڑی کے وعظ" سے لیکر سینٹ آگسٹائن کی کتاب "شہرِ الٰہی" تک معاشرہ پر جو کچھ بھی لکھا گیا۔ وہ مابعد الطبیعاتی، اخلاقی، اور الہیاتی نکتۂ نظر سے تھا۔ اُن ادوار میں یہ اندازِ فکر اتنا ناگزیر تھا کہ افلاطون اور ارسطو ایسے مفکرین بھی معاشرہ کی مثالی تشریح میں اُلجھ کر رہ گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی تاریخ اپنے اوائل میں معاشرہ کے اُن مادی یا فطری اصولوں کو نہ سمجھ سکی جو معاشرہ کے لئے بنیاد کا حکم رکھتے تھے۔ انسان کی یہ فکری مجبوری ادب پر بھی اثر انداز ہوئی۔ چنانچہ بعض اذہان نے اسے معاشرہ کی ضمنی پیداوار سمجھتے ہوئے نظرانداز کر دیا۔ اور جو مفکرین اس پر سنجیدگی سے غور کرتے انہوں نے بھی اسے قائم بالوجود سمجھ لیا۔ اُن کی نظر میں ادبی تحریکوں کا معاشرہ کے مادی یا خارجی رجحانات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس سوچ کا نتیجہ یہ نکلا کہ ادب کو زندگی سے علیحدہ کر کے دیکھا جانے لگا۔ ایک ایسے شعبے کی حیثیت سے جو عالمِ علوی سے تعلق رکھتا ہو اور جس کا انسانی زندگی سے تعلق ہی نہ ہو۔

آخر جب عہدِ وسطیٰ ختم ہونے لگا۔ اور انسانی معاشرہ میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں تو مفکرین کا زاویۂ نظر بھی بدلا، اب معاشرہ کوئی ناقابلِ تشریح عمل نہ تھا بلکہ ایک منضبط نظامِ کار تھا۔ جو صدہا کائناتی اصولوں سے بندھا ہوا ہو۔ اور علیٰ ہذا القیاس ادب ایک ایسا شعبہ تھا۔ جو انسانی زندگی سے براہِ راست متعلق ہو۔ اور اس کی گوناگوں تبدیلیوں کے ساتھ خود بھی بدلتا رہتا ہو۔ چنانچہ معاشرہ کے سب سے پہلے جدید مفکر گیمباٹسٹلے (Scienza Nuona) میں اعلان کیا کہ "ہومر کی نظمیں جہاں یونان کی قدیم رسموں اور معاشرتی تحریکوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ وہاں وہ اُن فطری قوانین کی بھی ترجمان ہیں جو اس وقت کے یونانی باشندوں پر اثر پذیر رہے۔"

www.taemeernews.com

نکتۂ نظر کی یہ تبدیلی اُس فلسفیانہ مسئلہ کے حل سے وجود میں آئی۔ جسے خارجیت اور داخلیت کا مسئلہ کہتے ہیں۔ قدیم مفکرین ضمیر کُل اور فوق الشعور ایسی اصطلاحیں رواج دے کر یہ ثابت کر رہے تھے کہ انسانی ذہن خارجیت کا ہی مرہونِ نہیں۔ بلکہ اُس کے کچھ عنصر جو کلیتہً داخلی ہیں۔ مادی تجربات سے پہلے ہی موجود ہوتے ہیں۔ اُدھر عہد وسطیٰ نے دم توڑا اور ادھر دماغ کا یہ تصور دھیرے دھیرے مفقود ہونے لگا۔ اب مفکرین اس نتیجہ کے قائل ہونے لگے کہ دماغ کوئی مافوق الحس شے نہیں۔ یہ آلۂ خیال ہے اور اس کی ہر داخلی حالت خارجی ماحول کا ہی عکس ہوتی ہے۔ لاک نے یہاں تک کہہ دیا کہ "نومولود بچے کا دماغ خالی تختی کی مانند ہوتا ہے جس پر تجربے تحریر ہوتے ہیں"۔ —— دماغ کا یہ شیئت پسندانہ تصور انگلستان سے ہوتا ہوا فرانس پہنچا اور آخر انیسویں صدی میں جرمن مفکروں نے اسے اتنا مستند بنا دیا کہ ہزار ہا سال کے ترقی یافتہ مثالی نظریے جنہیں ہیگل نے انتہا تک پہنچا دیا تھا۔ ہمیشہ کے لئے شکست کھا گئے۔

انسان، جسم نامی[1] ہے۔ جس پر خارجی مہیجات، حسی آلات کے ذریعے اپنا عمل کرتے رہتے ہیں۔ انسانی جسم اس کا ردِ عمل کی صورت میں جواب دیتا ہے۔ اور اس طرح عمل اور ردِ عمل کا یہ باہمی سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا —— اس مسلسل تحریک کے کارن تصورات، خیالات اور نظریئے وجود میں آتے ہیں۔ جو دوسرے لفظوں میں خارجی حالات کے داخلی نقوش ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ ذہن کا وہ حصہ، جسے نفسیات کی اصطلاح میں "وراثت" کہا جاتا ہے۔ انسان کے "قبل ولادت حالات[2]" کے تاثر کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا ——

—— اس اعتبار سے ادب کوئی مافوق الادراک شے نہیں رہتا۔ ذہن تا قدر ادب کے ذہنی عمل پر حصر رکھتا ہو، کسی مصنف کی تصنیف سے اُس کی ذہنی کشمکش اُس کے خارجی حالات اور اُس کی اکتسابی صلاحیتوں کا پوری طرح اندازہ لگا سکتا ہے کسی زمانے میں شعر آسمان سے نازل ہوتے تھے اور شاعر ملہم کہلاتا تھا۔ لیکن آج ایسا نہیں۔ ادب دیگر فنون کی طرح ایک فن ہے۔ ہر موزوں طبیعت اُس کا اکتساب کر سکتی ہے۔ اور ہر ادبی تخلیق اتنی ہی اچھی ہوتی ہے جتنی اُس پر محنت کی جائے۔ اس مسلم حقیقت کی بنا پر بیلنسکی نے ادب پر بحث کرتے ہوئے نظریۂ عکس کو رواج دیا تھا۔

اگر دماغ خارجی ماحول کا پابند ہے۔ تو اُس کی گوناگوں تبدیلیاں بھی گرد و پیش کے تغیرات سے بندھی ہوں گی۔ اور واقعی بات بھی یہی ہے۔ ذہنی ارتقا دراصل قوم

[1] LIVING ORGANISM [2] PREDETERMIND CONDITIONS

www.taemeernews.com

کائناتی تحریک کے تاثر کا نام ہے جو ہر نئے عہد میں نئی قدروں کو پیدا کرنے کی ذمہ دار ہے ــــ ابنِ آدم نے تہذیب کے اوائل میں کائنات کو ساکن تصور کیا اور ہر شے میں ابدیت تلاش کرنا شروع کر دی۔

ہرکلیٹس نے سب سے پہلے کائنات کے اس سکونی تصور کے خلاف نظریۂ تغیر پر روشنی ڈالی۔ اُس نے کہا کہ موجودات کی ہر شے لمحہ بہ لمحہ بدل رہی ہے۔ تغیر اصلِ کائنات ہے اور کائنات کی کوئی حالت بھی مستقل نہیں۔

ہر شے اتحادِ اضداد سے وجود میں آتی ہے۔ اور اضداد اپنے اتحاد کے باوجود ایک دوسرے پر اپنا عمل کرتی رہتی ہیں۔ اس بنیادی نزاع کے کارن ہر شے ہمیشہ ایک تحلیلی اور ترکیبی عمل سے گزرتی رہتی ہے۔ دماغ بیرونیات کا پابند ہے۔ چنانچہ اُس کا بھی اس کلیے کے کارن بدلتے رہنا ایک قدرتی امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ادبی تاریخ ہر زمانے میں نئے بھیس بدلتی رہی ہے۔ جو ادب کل تھا وہ آج نہیں۔ جو آج ہے وہ کل نہیں ہوگا۔ چنانچہ موجودہ ادب کو پرانے معیارِ تنقید سے پرکھنا یا پرانے ادب کو موجودہ معیارِ تنقید سے جانچنا غلط ہے۔ ادب ٹھہراؤ کا نہیں رفتار کا نام ہے۔ اور اسی اعتبار سے اس کی قدریں بھی بدلتی رہتی ہیں۔

ہر شے اتحادِ اضداد سے وجود میں آتی ہے۔ بعض ضدیں شے متعلقہ کا ثبات چاہتی ہیں۔ اور مثبت قدریں کہلاتی ہیں۔ لیکن بعض ضدیں شے متعلقہ پر تخریبی عمل کرنے کے باعث منفی قدروں کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں۔ مثبت اور منفی قدروں کی مسلسل چپقلش ہر شے میں مقداری تبدیلی پیدا کرتی رہتی ہے۔ لیکن جب منفی قدریں پوری طرح غالب آجائیں۔ تو شے متعلقہ کی ماہیت بدل جاتی ہے۔ اور یہ ہوتا ہے۔ ماہیتی تبدیلی کا مرحلہ ــــ

انسانی دماغ بھی اسی انداز سے شعور حاصل کرتا ہے۔ پہلے وہ مقداری تبدیلیوں کے دور سے گزرتا ہے اور پھر ماہیتی تبدیلیوں کے دور سے ــــ ایک ہی نظامِ کار کا ادب روایتی اعتبار سے بظاہر ایک اکائی معلوم ہوگا۔ لیکن بغور دیکھنے سے اس میں مقداری کمی بیشی ضرور نظر آئے گی ــــ مقداری تبدیلی کے بعد ماہیتی تبدیلی کا دور ادب میں اُس وقت آتا ہے۔ جب معاشرہ اصلاح اور ریفارم کے عہد سے گزر کر انقلاب کی طرف جا رہا ہو۔ اور جب نئے اداروں کے ساتھ نئے جماعتی رشتے وجود میں آ رہے ہوں۔ ادب کی ماہیتی تبدیلی نئی روایتوں کو ساتھ لے کر آتی ہے ــــ

www.taemeernews.com

فارم میں نئے تجربے کئے جاتے ہیں - اور مصنفین کا اندازِ فکر بالکل بدل جاتا ہے۔ —— اسی طرح کسی ملک کے ادب میں اگر دفعتاً انقلابی تبدیلیاں رُونما ہو جائیں تو قاری کو بخوبی اندازہ لگا لینا چاہیئے کہ متعلقہ ملک معاشرتی طور پر ماہیتی تبدیلی کے مرحلہ سے گزرا ہے۔

ہر شے ان گنت ماہیتی تبدیلیوں سے گذر رہی ہے اور گزرتی رہے گی۔ جو منفی تبدیلیاں ایک ماہیت پیدا کرتی ہیں۔ وہ اضدادی جنگ کے عمومی کلیئے کے کارن آخر خود نما ہو جاتی ہیں - اور نئی ماہیت جنم لیتی ہے۔ اسی طرح دماغ بھی کسی ایک ماہیتی تبدیلی کے مقام پر نہیں ٹھہر سکتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ادب نے کسی ایک ماہیت کو ہمیشہ کے لئے کبھی نہیں اپنایا۔ معاشرہ کی ہر ماہیتی تبدیلی ادب کو اپنے ساتھ بدلتی رہی اور بدلتی رہے گی۔ سرمایہ دارانہ عہد ہومر کی شاعری کے ماننے کے لئے گوارا نہیں - اور عوامی دَور میں رڈیارڈ کپلنگ کی پیدائش غیر منطقی بن رہی ہے۔

مادے کا مشینی تصور پیش کرنے والے مفکروں نے ارسطو کے علت و معلول کے کلیئے کی تشریح کرتے ہوئے انسان کو ایک بے جان کل سمجھ لیا۔ اُن کے نزدیک انسان خارجی تغیرات کے ساتھ اس طرح بندھا ہوا تھا کہ اُس کا گرد و پیش کے متعلق ہر فعل ایک مشینی فعل تھا۔ دراصل انسان کو اس قدر مجبور ثابت کرنے والوں نے دماغ کی چند اہم صلاحیتوں کو نظر انداز کر دیا تھا۔ حسی آلات کے ذریعے حاصل کردہ خام مواد کو ترتیب دینے کے علاوہ اور خارجی تغیرات سے تاثر حاصل کرنے کے علاوہ انسانی دماغ میں خارجی حالات کو (بذریعہ ردِ عمل) تبدیل کرنے کی زبردست صلاحیت موجود ہے۔ دماغ کا یہ فعل کوئی ارتجالی فعل نہیں۔ بلکہ یہ ہمیشہ کسی عقلی یا غیر عقلی سکیم کے ماتحت ہوتا ہے۔ انسان کی عظمت اسی میں ہے کہ وہ موجودہ حالات سے کبھی مطمئن نہیں ہوتا - بلکہ اُسے مثالی نظر سے دیکھ کر اس میں تبدیلیاں کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔

حیاتیاتی ارتقاء پسندوں کے امام ہربرٹ سپنسر نے مسئلۂ اخلاق پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ " —— ہر وہ فعل اخلاقی ہے۔ جو انسان کے داخلی حالات کو خارجی حالات پر منطبق کرنے میں مدد دے " معترضوں نے اخلاقی فعل کی اس تعریف پر اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ کہ ہربرٹ سپنسر نے گھوڑے کو تانگے کے آگے جوتنے کے بجائے تانگے کو گھوڑے کے آگے جوت دیا ہے۔ انسان کی برتری اس بات میں نہیں - کہ وہ اپنے آپ کو خارجی حالات کے مطابق بناتا پھرے - بلکہ اُس کی عظمت اس میں ہے کہ وہ خارجی حالات کو اپنے نصب العین کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرے۔

www.taemeernews.com

ادب بھی محض خشک شیئت پسندی کا نام نہیں۔ جب تک اس میں مثالی عنصر شامل نہ ہو، اسے ادب عالیہ نہیں کہا جا سکتا۔ مثالی عنصر کے بغیر ادب گرد و پیش کی چند تصویریں تو مرتب کر دے گا۔ لیکن اُس فکری ارتقاء کو پیدا نہ کر سکے گا۔ جو ہر عہد کے ادب کی جان ہے۔ فرسودہ اداروں کو توڑنے کے ذہنی نقشے، نئی سماج کو تعمیر کرنے کے خاکے، یہ سب چیزیں ادبی مثالیت ہی کی پیدا کردہ ہیں۔ مثالیت کے بغیر ادب تخریب کی یا تہذیبی ٹھہراؤ کی باتیں تو کر سکتا ہے۔ لیکن معاشرہ کے لئے مثبت طاقت نہیں بن سکتا۔ افلاطون نے شاید ادب کے اس حصے کو نظر انداز کر دیا تھا۔ ورنہ اس کی ریاست سے ادیب کبھی خارج نہ ہونے پاتے۔

ایک مادہ پرست ادیب بھی ادب کے مثالی عنصر سے گریز نہیں کر سکتا۔ لیکن اُس کی مثالیت، عمل سے بہت قریب ہوگی۔ وہ جاگیری عہد کی ادبی بھارتوں سے نہیں اُلجھے گا۔ بلکہ اُس دَور کی باتیں کریگا۔ جو ممکن الحصول ہو۔ پہلی عالمگیر جنگ سے پہلے اشتراکی عہد کے متعلق جتنا ادب بھی پیدا ہوا۔ اُسے مثالی ہی کہا جائیگا۔ لیکن اُس مثالیت کی بنیاد وجدان یا الہام نہیں تھا۔ بلکہ وہ مادی اصول تھے۔ جو ہمیشہ سے کائناتی ارتقاء کا باعث بنے رہے۔ ولیم بلیک یا ٹیگور کی صوفیت اور عوامی عہد کے ادیبوں کی مثالیت میں بین فرق نظر آتا ہے۔ مقدم الذکر عقل کے مقام سے گذر کر شعر کہتے ہیں اور موخر الذکر ایسے مستقبل کے خواب دیکھتے ہیں جو فکری اعتبار سے قابلِ تشریح ہو —— مادہ پرست ادیب کی مثالیت میں تجزیاتی عنصر زیادہ ہوتا ہے اور غیر مادہ پرست ادیب کی مثالیت تخیلی عنصر سے بھرپور ہوتی ہے۔

دماغ اگر خارجیت کا عکس ہے۔ اور اس کی ہر تبدیلی کے ساتھ بدل جاتا ہے تو ایک عہد کے ادیبوں کو ایک ہی طریق پر فکر کرنا چاہیئے۔ اور ان کے ادب کا مافیہ بھی ایک ہی ہونا چاہیئے اس سوال کا ایک جواب تو یہ ہے کہ دماغ اور گرد و پیش کی رفتار متوازی نہیں ہوتی۔ خارجی ماحول تبدیل ہونے ہی بہت تیزی سے بڑھ پھیل جاتا ہے اور انسانی دماغ جو اس تبدیلی کا باعث ہوتا ہے اپنی سست رفتاری کے سبب پیچھے رہ جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ آج جہاں عوامی ادب کا غلغلہ بلند ہوتا ہے۔ وہاں سامنتی اور سامراجی عہد کے ادیب بھی بکثرت مل جاتے ہیں۔ اور —— دوسرا جواب یہ ہے کہ ہر شخص کا ذاتی کردار (نظمِ بدن اور اقتصادی دائرہ) اُس کے ذہن کو منفرد حیثیت کا حامل بنا دیتا ہے۔ اس اصول کی وجہ سے ایک ہی ماحول اور ایک ہی زمانے میں رہتے ہوئے مختلف ادیب مختلف طریقوں پر فکر کرتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ادب میں (Idiosyncracy) کا خاتمہ ہو جاتا

www.taemeernews.com

کنھیا لعل کپور

فکر کی شاعری

شیکسپیئر کے ڈرامے MIDSUMMER NIGHT DREAM میں ایک ملکوتی کردار "پک" ہے۔ جو فضا میں پرواز کرتے ہوئے بنی آدم پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالتا ہے۔ اور شرارت اور طنز کے ملے جلے جذبات سے چیخ کر کہتا ہے۔

"یا خدا! انسان کتنا بیوقوف ہے؟"

مجھے فکر کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ کہ "جیولے" کا شاعر "پک" سے بڑی حد تک مشابہت رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ تخیل کی بلندیوں پر پرواز کرتے ہوئے بار بار چلا اٹھتا ہے۔

"اے آدم وحوا کے فرزندو! تم کتنے عجیب ہو!!"

طامس ہارڈی اپنی ایک خیال انگیز نظم "چاند سے خطاب" میں کہتا ہے۔ "اے چاند! تو روزِ ازل سے یہ "بے معنی تماشا" دیکھ رہا ہے۔ جسے کئی لوگ دنیا بھی کہتے ہیں۔ لیکن کیا تو خدا کو یہ مشورہ نہیں دے سکتا۔ کہ اس عالمِ ہست و بود کو جلد تر غرقِ آب کر دے!"

فکر اپنی نظم "مشورہ" میں اسی خیال کو نہایت گستاخی اور بیباکی کے ساتھ پیش کرتے ہوئے..... رب العالمین سے خطاب کرتا ہے۔ کہ

بڑی گستاخی سے کہہ دوں گا میں ربِ عالم
تری بیکار تمنا کا نشانہ ہیں ہم!

اسی نظم میں وہ خدا سے ایک اور سوال بھی کرتا ہے۔ کہ اس زندگی کا جو بقول فانی دیوانے کا خواب ہے۔ مفہوم کیا ہے۔

تجھ سے الجھوں گا کہ اس رقص کا مفہوم ہے کیا
تجھ سے پوچھوں گا کہ یہ نغمۂ موہوم ہے کیا

طامس ہارڈی نے اپنے ایک ناول میں پیشین گوئی کی تھی۔ کہ زمانہ مستقبل کا پختہ فکر انسان جب اپنے

گرد و پیش پر نظر ڈالے گا۔ تو مسکرانا بھول جائیگا .... فکرؔ زمانہ مستقبل کا ہی شاعر ہے۔ اور جب انسان کی مختلف مسیتاؤں کی بوالعجبیوں کا جائزہ لیتا ہے تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ کافور ہو جاتی ہے اور کلیجے سے ہوک اٹھتی ہے وہ مسکرانا بھول جاتا ہے۔ چہ جائیکہ ایک قہقہہ استہزا بلند کر سکے۔ اس کی شاعری ایک مسلسل صدائے احتجاج ہے۔ ایک دردناک آواز جس کی درماندگی پر رحیل کارروان کا دھوکا نہیں ہو سکتا۔ وہ انسانوں اور دیوتاؤں کے مظالم کا شکوہ سنج ہے۔ اس کی نگاہ میں ان دونوں عناصر نے مل کر زمین کے تاریک سیارے کو ظلم و استبداد کی آماجگاہ بنا دیا ہے۔

وہ خدا کو، اس قوتِ اعلیٰ کو "بازیگرِ کونین" کے عجیب و غریب لقب سے یاد کرتا ہے۔ وہ بازیگر کونین، جو ضعیف الاعتقاد اور فریب خوردہ مخلوق کا مذاق اڑا کر لطف اندوز ہوتا ہے "جاؤ، کہہ دو" میں وہ اس قوتِ اعلیٰ پر طنز کرتے ہوئے کہتا ہے۔

اور وہ بازیگرِ کونین جسے تاب نہیں
کسی مضراب کی طوفان کی تخلیق کرے
اک نئے ساز سے بہلائیگا پھر محفل کو!
ساز کی اوٹ میں دبکے ہوئے نغموں سے کہو —— جاؤ، کہہ دو!

وہ صرف خدا ہی کو نہیں۔ بلکہ اپنے گرد و پیش کے انسانوں کو بھی معاف نہیں کرتا۔ کیونکہ انسان بھی جو مذہب اور انصاف کی آڑ میں گناہ اور جرائم کا کھیل کھیلتا ہے۔ ناقابلِ عفو الزام کا ذمہ دار ہے۔ اپنی ایک نظم "ایک کہانی" میں وہ مشہور ہندو قانون ساز "منو" کی شعبدہ بازی کو بے نقاب کرتا ہے۔ جس نے انسانی چاند کے چار ٹکڑے کر کے سماج کی اشتراکی قدروں کو صدیوں تک کے لئے مفلوج کر دیا۔ تیز، تلخ اور طنزیہ انداز میں "منو" کو سلام کرنے کے بعد وہ نئی سماج اور نئے نظریوں کی جھلکیاں دکھلاتا ہے۔ اور "منو" کے پردے میں "منوازم" کے موجودہ نمائندوں کو چیلنج کرتا ہے۔ کہ

منو مہاراج! تری صبح معظم کو سلام
شعبدہ باز! ترے سحرِ منظم کو سلام
ترے افلاک کے ہر پیچ کو، ہر خم کو سلام
تری اس لغزشِ پروازیِ آدم کو سلام
لیکن اب دیکھ! وہ اک تیشۂ خوں رنگ اٹھا
اب تو ہم ترے فسوں، تیرے شکنجوں کے صنم
دودھیا چاند کی اس وحدتِ قدریں کی قسم
توڑ ہی ڈالیں گے اب اور نہیں سہہ سکتے

www.taemeernews.com

فکر کی فنی عظمت اس وقت مقام عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ جب وہ موجودہ مادی تہذیب کے اس پہلو پر تازیانہ لگاتا ہے۔ جس پر دور حاضر کی گردن فرط غرور سے تن جاتی ہے۔...... فکر موجودہ تمدن کی پری کا جنون آمیز اور خونی رقص دیکھ دیکھ کر مایوس ہو جاتا ہے۔ اور پھر نہایت یاسیت کے عالم میں یہ چاہتا ہے۔ کہ موجودہ تہذیب اس ماضی کی طرف لوٹ جاتے۔ جبکہ تہذیب جدید کی منزل تک نہ پہنچنے کے باوجود، تہذیبی عناصر پائے جاتے تھے۔ "مراجعت" میں وہ رات کے وقت چلانے والے شیر خوار بچے کی طرح کہہ اٹھتا ہے

اے ساتھیو! اے آتش و آہن کے خداؤ
کچھ بھی ہو لاؤ، کوئی شعلہ، کوئی دیپک
اس کہرے کی میلی ہوئی آنکھوں میں جلاؤ
ورنہ مجھے لے جاؤ اپنی خوابگہوں میں
تھیں دل سے ہم آہنگ جہاں وقت کی سانسیں

فکر کی شاعری خیالات کی قوت اور انفرادیت سے معمور ہے۔ بغیر کسی الجھاؤ کے ہم اسے دماغ کی شاعری کہہ سکتے ہیں۔ دل کی نہیں۔ یہ ایسی شاعری نہیں جو پڑھتے ہی دل میں اتر جاتی ہے۔ اس لئے یقیناً ان حلقوں کو مایوس کرے گی۔ جو فن اور دماغ کے رشتے سے محروم ہیں۔ فکر کی شاعری ایک مخصوص طبقے کے ذہن کو مانوس دکھائی دیگی۔ وہ عامہ ذہانت اور سطحی ادراک کا مالک نہیں ہے۔ بلکہ اس کا ذہن چند مخصوص عناصر کا مرکب ہے۔ وہ عوامی اور جماعتی جذباتیت کو متاثر نہیں کرتا۔ اور مجھے ذرہ بھر تعجب نہیں ہوگا۔ کہ وہ اپنی موت سے بعد اس وقت شہرت کے معراج پر پہنچے۔ جب کہ دنیا اسے آدھا بھلا چکی ہو۔ وہ روایات سے ہٹ کر باتیں کرتا ہے۔ اس کے خیالات اس قدر دقیق ہیں۔ اور وہ مسائل حیات کے اس قدر غیر عصری اور تحیر خیز حل پیش کرتا ہے۔ جو عوام کی پسندیدگی کی ذیل میں نہیں آتے۔ اور جنہیں عوام کے دل و دماغ قبول لینے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اس کی تشبیہیں استعارے اور تراکیب انوکھی انفرادیت کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ ایسے محاورے، جملے اور الفاظ تخلیق کرتا ہے۔ جو خاص اس کے اپنے ہوتے ہیں۔ اور اس قدر طبعزاد ہوتے ہیں۔ کہ قارئین انہیں تعجب کے ساتھ پسند کرنے لگتے ہیں۔ اگرچہ وہ ایک عام قاری کے فہم سے بالا ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ اس کا ہر مصرع انفرادی معانی سے معمور ہوتا ہے۔ نظریوں کی یہ انفرادیت ایک سطحی ذہن کی سمجھ سے تو باہر ہوتی ہے۔ ایسا سطحی ذہن گہرائیوں سے دور بھاگتا ہے۔ لیکن جب ذہین قاری اسے پڑھتا ہے۔ تو اس کی شاعری میں چند نرم و نازک احساسات کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ وہ احساسات جو زندگی کی منزلوں میں کبھی کبھار میسر آتے ہیں۔ اور ایک گہرا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔

جو قاری مطالعہ کے تفریحی پہلو کے خوگر ہیں۔ ان کو فکر کی شاعری میں ایک خوفناک یاسیت اور کڑوی

www.taemeernews.com

کسیلی قنوطیت کا احساس ہوگا۔ کیونکہ وہ بسا اوقات اتنا قنوطی ہو جاتا ہے۔ کہ مشہور فلاسفر دیوجانس شوپن ہار اور ٹامس ہارڈی سے دوسرے درجے پر دکھائی دیتا ہے.... لیکن وہ قاری جو مفکرانہ آرٹ کے دلدادہ ہیں۔ اس مجموعے میں کئی صالح، صحت مند اور رجائی نظمیں بھی انتخاب کر لیں گے۔ اگرچہ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ کہ وہ اکثر عالم ناامیدی میں پکار اٹھتا ہے۔

اور میں — مانوس غمگینی میں بل کھاتا ہوا
اور میں — ناکام سیاروں سے شرماتا ہوا
وقت کے جادو بھرے جھولے میں لہراتا ہوا
آزمودہ کشمکش کے گیت دہراتا ہوا
دیکھتا ہوں خود کو غم خانے میں پھر آتا ہوا
اپنا غم خانہ — جو رنگ اپنا بدلتا ہی نہیں
اس گہن کے بیچ سے سورج نکلتا ہی نہیں

لیکن یہ اس کے ذہن کی ایک عبوری فضا ہے۔ اور وہ اس فضا میں سے جلدی گزر جاتا ہے۔ کیونکہ اس کی کئی ایک نظمیں ایسی بھی ہیں۔ جو نشاطیہ اور طربیہ کیفیت کی حامل ہیں۔ ان نظموں کا وجود میں آنا اس امر کیطرف ایسا واضح اشارہ ہے۔ کہ اگر انسان صدق دل سے چاہے۔ تو اپنے گرد جکڑی ہوئی سالہا سال کی زنجیر دل سے رہائی حاصل کر سکتا ہے۔ "بلاوے" میں وہ انسان کو اسی نوعیت کا زندگی بخش اذن دیتا ہے۔ کہ وہ ایک مشترکہ محاذ بنا کر اس کائنات کو اپنی آرزوؤں کے قالب میں ڈھال سکتے ہیں۔

آؤ، کہ ہم ہیں نجم و مہ و مہر سے بلند
ٹھہری ہوئی حیات کو زیر و زبر کریں
اس برف زار پر بھی کوئی آتشیں کمند
کوندا بنا ہوا ہے دماغوں کا پھول پھل
شعبوں پہ کھلتا جاتا ہے ذہنوں کا بند بند

فکر کی شاعری کا ایک اور اہم پہلو بھی قابل ذکر ہے۔ کہ وہ واحد شاعر ہے۔ جس نے ہندو دیومالا کو جدید حیران کن اور منفرد زاویہ نگاہ سے دیکھا ہے۔ ہندو دیومالا سے اس کا یہ سلوک روایات سے ہٹ کر انفرادی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ "شکنتلا"۔ "برہمچاری" اور "ایک کہانی" میرے اس دعویٰ کے بہترین جواز ہیں۔ "شکنتلا" میں وہ صنف نازک کے حق میں مرد سماج کی جابرانہ اور بہیمانہ فطرت کو عریاں کرتا ہے۔ "برہمچاری" میں وہ جنسی ہیجانات کو دبانے کی تلقین کرنے والے صاحب اختیار دانشوں کو چیلنج کرتا ہے۔ اور "ایک کہانی" میں وہ اپنے منفرد اعتبارات کے حربوں سے قانون ساز اور مصنوعی کے خلاف نبرد آزما ہوتا ہے

www.taemeernews.com

ہر عظیم فن کار کی طرح فکر بھی ایک صاحب اسلوب شاعر ہے۔ اس کا طرزِ اظہار منفرد ہے۔ اور ایک خاص قسم کا عجب لئے ہوئے ہے۔ اس کے انتخاب لفظی اور مصرعوں کی ساخت میں ایک یگانگت ہے۔ مثلاً اس کا یہ مصرع

جیسے کسی چھیڑی ہوئی ناگن کا نشانہ

وہ اپنے اسلوب بیان میں، الفاظ کی جدت اور تازگی میں، نئی تراکیب میں، تشبیہوں کی ندرت میں، بے مثال چابکدستی رکھتا ہے۔ اور جس کی مثالیں اس کی نظموں میں عام ملتی ہیں۔ مثلاً

"ہم نقش دو آہن کے عداد"۔ "سیلی ہوئی آنکھیں"۔ "کہرا جما جالا نہیں جاتا"۔ "دھول میں کفنایا ہوا"۔ "رنگ غم خانہ"۔ "الجھی حیات"۔ "بازیگر کونین"۔ "پاکیزان عرش"۔ "ممنوعہ مسرت"۔ "دوشیزہ تمنائیں"۔ "سرمئی ساتے"۔ "تدپوش عبادت گاہیں"۔ "نغمہ گر شعر و شراب"۔ وغیرہم۔

اسے الفاظ کی کمی کبھی محسوس نہیں ہوتی۔ کیونکہ جہاں بھی لغوی الفاظ اس کا ساتھ نہیں دیتے۔ وہاں وہ اپنے الفاظ ڈھال لیتا ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ روایتی الفاظ اور فرسودہ تراکیب اس کے انوکھے خیالات کو دور کرنے میں اکثر ناکام رہتی ہیں۔ اور جب اس کے انوکھے خیالات کے راستے میں روایاتی اور گھسے پٹے محاورات اور تشبیہات مزاحم ہوتے ہیں۔ تو وہ اپنے نظریوں کی دیانت اور خیالات کی سچائی ثابت کرنے کے لئے ان الفاظ سے بے نیازی اختیار کر لیتا ہے۔ اور ایک منفرد اور صاحب طرز فن کار کی طرح اپنے الفاظ کی دنیا آپ پیدا کر لیتا ہے۔

میرے خیال میں فکر اس قسم کا شاعر ہے۔ جو ایک نئی اور اچھوتی بات کہنا چاہتا ہے۔ اس لئے اس نے ایک نیا اور اچھوتا اسلوب اختیار کیا ہے۔ اور یہ اس کی فنی دیانت کی دلیل ہے۔ اگرچہ اس نے اپنی بات کے اظہار کے لئے "صنعت شعر" کو منتخب کیا ہے۔ جو ایک پرانی چیز ہے۔ لیکن وہ اس میں بھی رسمیات کے خلاف بغاوت کر دیتا ہے۔ اور اس طرح ایک نیا جادو، ایک نئی موسیقی، ایک نیا راگ اور ایک نئی شوکت سے دنیائے شاعری کو مالامال کر دیتا ہے۔

جابرانہ قوانین

قدرت نے کسی کو چھوٹا یا بڑا نہیں بنایا۔ کمتری اور برتری کے قوانین انسان کی اپنی بنائی ہوئی روایتوں کے پیدا کردہ ہیں۔

(روسو)

www.taemeernews.com

طفیل احمد

سوویت تمدن — ایک نیا تمدن

تہذیب اور تمدن کا تعلق انسانی سماج سے ہے۔ انسانی سماج ایک نامیاتی شئے ہے۔ وہ ایک ایسے مجموعی کُل کی حیثیت رکھتا ہے جس کا ہر پہلو دوسرے پہلوؤں سے متعلق اور وابستہ ہے۔ اور جس کا ہر پہلو نہ صرف دوسرے پہلوؤں سے متاثر ہوتا ہے۔ بلکہ خود بھی ان پر اثر ڈالتا ہے۔ انسانی سماج کوئی جامد اور ساکن شئے نہیں۔ بلکہ ہمیشہ بدلتا اور نئی شکل اختیار کرتا رہتا ہے۔ وہ ایک مسلسل حرکت اور غیر مختتم تبدیلیوں کے سحر میں گرفتار ہے۔ تہذیب اور تمدن بھی ہمیشہ بدلتی ہوئی اشیا ہیں۔ تہذیب و تمدن بھی سماج کے دو پہلو ہونے کی حیثیت سے نہ صرف ایک دوسرے سے منسلک اور وابستہ ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کو متعین بھی کرتے ہیں۔ لیکن جہاں تک اس متعین کرنے کا تعلق ہے۔ تمدن کی حیثیت بنیادی ہے۔ تمدن ہی تہذیب کی شکل و صورت اور اس کی اندرونی رُوح کو متعین کرتا ہے۔ اس کو اعلیٰ بناتا ہے یا اس کے معیار کو گھٹا دیتا ہے تمدن ہی کی اچھائی یا خرابی پر تہذیب کے اچھے یا بُرے ہونے کا انحصار ہے۔ تمدن سماج کے خارجی مظاہر سے مترتب ہوتا ہے۔ تہذیب اس کا داخلی پہلو ہے۔ خارجی حالات سماج کی اندرونی رُوح اور اس کے داخلی پہلو —— یعنی تہذیب کو —— متعین و متاثر کرتے ہیں۔ تہذیب کوئی مُردہ اور بے حس شئے نہیں۔ وہ بھی تمدن پر اپنا ردِ عمل ثبت کرتی ہے۔ تہذیب، تمدن کی پیداوار ہوتے ہوئے بھی اس پر اپنا اثر ڈالتی۔ اور اس کی خصوصیات کا تعین کرتی ہے۔ تمدن زیادہ بنیادی ہونے ہوئے بھی تہذیب سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ تہذیب تمدن کا داخلی پہلو ہے۔ اور تمدن، تہذیب کا خارجی پہلو۔ دونوں مل کر انسانی سماج کی تشکیل کرتے ہیں۔ اور ایک دوسرے سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ لیکن تہذیب اس وقت تک اپنی شکل اور نوعیت نہیں بدل سکتی جب تک تمدن میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہو۔ جب تمدن کا ڈھانچہ بدلتا ہے۔ تب نئی تہذیبی قدریں پیدا ہوتی ہیں اور پرانی قدریں بدلتی ہیں اس طرح تہذیب و تمدن ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔

یہ سوچنا غلط ہے۔ کہ تہذیب ہی تمدن کو پیدا کرتی ہے۔ اور اس کے پورے ڈھانچے کو متعین کرتی ہے

www.taemeernews.com

یہ تو گاڑی کو گھوڑے کے آگے جوتنے کے مترادف ہے۔ یہ نظریہ انیسویں صدی کا عینیت پرستانہ نظریہ ہے۔ جو مادی دنیا کی ہر چیز کو خیال کی پیداوار سمجھتا ہے۔ صحیح اور سائنسی نظریہ یہ ہے۔ کہ مادی دنیا ہی ہمارے ذہن میں خیال کی تخلیق کرتی ہے۔ یہ ضرور ہے۔ کہ خیال ایک بار پیدا ہو جانے کے بعد پھر مادی دنیا پر اپنا اثر ڈالتا ہے۔ اور اس کی شکل و صورت کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ مادی دنیا محض ہمارے خیال کی پیداوار ہے۔ خیال مادی دنیا کی شکل ضرور بدلتا ہے۔ اور اس کو نئے رنگ ڈھنگ میں ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ لیکن وہ مادی دنیا کو پیدا نہیں کرتا۔ اس لئے کہ یہ ایک غیر ممکن عمل ہے۔ اسی طرح تہذیب جو انسانی سماج کا گویا ذہنی پہلو ہے۔ سماج کے مادی مظاہر یعنی تمدن سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ خود تمدن کو پیدا نہیں کرتی۔ تمدن ہی تہذیب کو پیدا کرتا ہے۔ اور اس کی صفت اور کردار کا تعین کرتا ہے۔ تہذیب محض تمدن پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس پر رنگ آمیزی کرتی ہے۔ اس کو آگے بڑھا سکتی ہے یا اس کی ترقی کو روک سکتی ہے۔ لیکن اس کو پیدا نہیں کر سکتی۔ اور نہ یکسر اسے بدل سکتی ہے۔ تہذیب تمدن کے ارتقا کے رُخ کو بھی نہیں موڑ سکتی۔ وہ صرف اس کے ساتھ ساتھ چل سکتی ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ تمدن کے ارتقا کی رفتار کو دھیما یا تیز کر سکتی ہے۔

تہذیب کوئی بنی بنائی گول مٹول سی چیز نہیں ہے۔ کہ اسے ایک ہی دفعہ تمام آنے والے زمانوں کیلئے بنا کر رکھ دیا گیا ہو۔ ہر تہذیب کچھ خاص تمدنی حالات میں پیدا ہوتی ہے۔ پھیلتی اور بڑھتی ہے۔ اور جب ان تمدنی حالات کا زوال ہوتا ہے تو وہ بھی ختم ہو جاتی ہے۔ صرف اس کی چند اعلیٰ ترین قدریں نئی تہذیب میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ اس لئے کہ تہذیب میں ایک تسلسل بھی ہوتا ہے۔ تہذیب ہمیشہ انقلاب پذیر رہتی ہے۔ اس لئے ہم کسی بھی تہذیب کے اصولوں اور قدروں کو دائمی اور ابدی نہیں قرار دے سکتے نہ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ کسی خاص قوم یا کسی خاص مذہب کے پیروکاروں کی تہذیب سب سے مکمل ہے۔ اور اسے تمام آئندہ زمانوں کے لئے ایک ہی بار بنا کر تیار کر لیا گیا ہے۔ تاکہ ہر قوم کو ہر حالات میں سانچے کے طور پر کھلایا جا سکے۔ پھر چونکہ ہر تہذیب خاص خاص تمدنی حالات کی تخلیق ہوتی ہے۔ اس لئے کسی تہذیب کو ہر تمدن پر چپکایا نہیں جا سکتا۔ یہ بالکل بچوں کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ کہ موجودہ یورپی تمدن کو صالح بنانے کے لئے اس کے اندر کسی مشرقی تہذیب کا انجکشن دینے کی کوشش کی جائے۔ یورپی تمدن کا اپنا ایک داخلی پہلو ہے۔ جسے آپ اسکی تہذیب کہہ لیجئے۔ اگر یورپ کی تہذیب بدلی جا سکتی ہے تو صرف یورپ کے تمدن کو بدل کر۔ ہر تمدن اپنی داخلی روح ساتھ لے کر چلتا ہے۔ اس کو اپنی روحانی خصوصیات سے زبردستی دستبردار نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں اگر ہم اس کی تہذیبی روح کو بدلنا چاہتے ہیں۔ تو ہمیں اس کے ڈھانچے کو بدلنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ تاکہ اس کے تمدنی حالات اور ان کے پیدا کردہ تہذیبی رجحانات میں بے آہنگی اور نامطابقت پیدا نہ ہو۔ انسانی سماج کی نامیاتی فطرت کا یہی تقاضا ہے۔ کسی تمدن میں زبردستی کسی دوسری تہذیب کے رجحانات پیدا کرنا

www.taemeernews.com

غیر فطری عمل جراحی ہے۔

تمدن سے مراد ہے کسی سماج کا معاشی سیاسی اور معاشرتی نظام۔ اور تہذیب سے مراد ہے اس کا تعلیمی اخلاقی اور مذہبی و روحانی نظام۔ تہذیب کے دائرے میں ادب اور آرٹ بھی شامل ہیں۔

اسے ہم محض تاریخی اتفاق نہیں قرار دے سکتے۔ کہ انسان اسی زمانے سے متمدن ہونا شروع ہوا۔ جس زمانے میں ذاتی ملکیت کا رواج قائم ہوا۔ تہذیب و تمدن اور ذاتی ملکیت دونوں کا سماجی ارتقا کے ایک ہی دور میں پیدا ہونا محض اتفاق نہیں۔ دونوں میں کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ تمدن کی پیدائش ذاتی ملکیت پر مبنی معاشی نظام سے ہوئی ہے۔ آج کے تاریخی حالات میں یا پیدائش انسیا کے ارتقا کے موجودہ دور میں ذاتی ملکیت کا وجود تہذیبی و تمدنی ترقی کے منافی ہے۔ لیکن جس زمانے میں وہ پہلی بار وجود میں آئی۔ اس کے تاریخی حالات کے تحت وہ یقیناً سماج کی ایک ترقی پسند طاقت رہی ہوگی کوئی چیز بجائے خود اچھی یا بری نہیں ہوتی۔ بلکہ مخصوص خارجی حالات اُسے اچھا یا بُرا بنا دیتے ہیں ذاتی ملکیت کے بغیر ابتدائی سماج غالباً ترقی کے منازل طے نہیں کر سکتا تھا۔ اور نہ تہذیب و تمدن ہی وجود میں آسکتا تھا۔ اسی وجہ سے کسی بنے بنائے اخلاقی اصول کو ابدی قرار دے کر اس کی کسوٹی پر تمام قدیم و جدید تہذیبوں اور تمدنوں کو جانچنا سراسر غیر سائنسی طریقہ ہے۔ عہد قدیم میں انسانی سماج کی مادی قوت میں اضافہ کرنے کے لئے اور قدرت کے ذرائع پر اس کے اختیارات و اقتدار کا دائرہ وسیع اور مضبوط کرنے کے لئے جس کے بغیر تہذیب و تمدن کی ترقی ناممکن تھی۔ ذاتی ملکیت اور اس پر مبنی معاشی نظام کی ضرورت تھی۔ ذاتی ملکیت نے سرمایہ دارانہ نظام کے ارتقا تک یہ اہم تاریخی فرض انجام دیا۔ لیکن اب قدرت پر انسانی حیطۂ اقتدار کو وسیع تر کرنے سے اور تہذیبی و تمدنی ارتقا کے تسلسل کو برقرار رکھنے سے ذاتی ملکیت قاصر اور معذور ہے۔ اب تک ذاتی ملکیت نے جس تہذیبی و تمدنی ترقی کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔ اس کو برقرار رکھنے کے لئے اب ہمیں اجتماعی ملکیت کی ضرورت ہے۔ ورنہ خود تہذیب و تمدن ہی فنا کے گھاٹ اُتر جائیگا۔

گویا اب تک دنیا میں جتنی تہذیبیں پیدا ہوئیں۔ اور جتنے تمدنوں نے جنم لیا۔ اُن سب پر ذاتی ملکیت کی چھاپ رہی ہے۔ اسی وجہ سے ہمیں ان میں کوئی نہ کوئی نقص اور تکمیل کا فقدان نظر آتا ہے۔ لیکن یہ کوئی قابل الزام بات نہیں ہے بلکہ تاریخی طور پر ایسا ہونا لابدی تھا۔ ہم یونانی تمدن کو محض اس لئے بُرا نہیں کہہ سکتے۔ کہ اس کی بنیاد غلامی کے نظام پر قائم تھی۔ کیونکہ اس زمانے کے تاریخی حالات کے تحت اتنی تہذیب اور اتنا تمدن بھی نظام غلامی ہی کا مرہونِ منت تھا۔ قدیم روم اور کارتھیج، ہندوستان و چین مصر و بغداد، ایران و تاتار اور یورپ کا موجودہ تمدن سب ذاتی ملکیت کے نظام کے سہارے ہی پیدا ہوئے اور آگے بڑھے۔ اسی لئے آج کے اخلاقی آئیڈیل کی عینک سے دیکھئے۔ تو ان کے اندر اچھائیوں کے ساتھ برائیاں بھی نظر آتی ہیں۔ قدیم یونان کے علمی و تہذیبی کمالات میں ہمیں غلاموں کے خون کی سرخی نظر آتی ہے۔ روم کی

www.taemeernews.com

شاہانہ عظمت و جبروت کا عالیشان قصر بھی غلاموں کے کندھوں پر کھڑا کیا گیا تھا۔ قدیم ہندو تہذیب اچھوتوں کو کچل کر اور پیس کر آگے بڑھی۔ مسلم تمدن کی نشوونما بھی جاگیرداری نظام کے سہارے ہوئی جس میں تہذیب کی دولت صرف امراء و رؤسا کے طبقے کو حاصل تھی اور بقیہ انسانیت کو جانوروں سے بدتر سمجھا جاتا تھا۔ جدید یورپی تمدن میں فلاکت کش مزدور کے چہرے کی زردی اور کمزور اور محکوم قوموں کے خون ناحق کی سرخی جھلک رہی ہے ان تمام تمدنوں کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے۔ کہ اگر ایک طرف تہذیب و تمدن کا مسلسل ارتقا ہوتا رہا۔ تو دوسری طرف انسان کی عظیم اکثریت ظلم و تعدی، بھوک اور مفلسی، جہالت اور کثافت کا شکار ہوتی رہی۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بغیر انسانی تمدن کی ترقی ناممکن تھی۔

اسی تضاد نے دنیا کے اعلیٰ ترین اخلاقی اور انسانی اصولوں کو کبھی عملی صورت اختیار نہیں کرنے دی تمدن کی پوری تاریخ میں ہمیں نظریہ اور عمل کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل نظر آتی ہے۔ افلاطون کی اشتمالیت گوتم بدھ کے اشتمالیت اور مساوات کے نظریے، عیسیٰ کا محبت اور نیکی کا پیغام، اسلام کا مساوات کا اصول ان میں سے کسی بھی اخلاقی نظام کو آج تک عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکا۔ موجودہ یورپی تمدن بھی ایک اخلاقی تضاد کا شکار ہے معلمین اخلاق کو یہ بھی شکایت ہے۔ کہ سائنس جتنی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اسی لحاظ سے انسان کی اخلاقی ترقی نہیں ہو رہی ہے۔ سائنس کی طاقتیں شیطانی ارادوں کے ہاتھ میں آ رہی ہیں

یہ ہے ان تمام تہذیبوں اور تمدنوں کی وہ مشترکہ خصوصیت جو ذاتی ملکیت پر قائم ہیں۔ لیکن ۱۹۱۷ء کے زمبر میں روس کے سوشلسٹ انقلاب کے بعد انسانی تاریخ میں پہلی بار ایک ایسے تمدن اور ایک ایسی تہذیب کی تعمیر شروع ہوئی جس کی بنیاد ذاتی ملکیت پر نہیں۔ بلکہ ذاتی ملکیت کی تباہی و بربادی پر قائم ہے۔ سوویت تمدن پہلا تمدن ہے۔ جو ذاتی ملکیت کا مرہون منت نہیں ہے۔ سوویت تمدن نے اس تصور کو پاش پاش کر دیا۔ کہ آج کے حالات میں بھی تمدن اور تہذیب اگر ترقی کر سکتی ہے۔ تو صرف ذاتی ملکیت کی بنا پر۔ اس شرط پر کہ کچھ انسان تمدنی ترقی سے فائدہ اٹھائیں۔ اور عظیم اکثریت تمدن کو برقرار رکھنے کے لئے مصائب و آلام کا شکار بنی رہے۔ یہی وہ بنیادی خصوصیت ہے۔ جو سوویت تمدن کو تاریخ انسانی کے تمام تمدنوں سے ممتاز اور علیحدہ کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اشتراکی انقلاب ہمیں انسانی سماج میں ایک ایسی تبدیلی کا پتہ دیتا ہے۔ جسکے مقابلے میں کوئی بھی تبدیلی اتنی بنیادی نہیں ہے۔ غلامی سے جاگیرداری اور جاگیرداری سے سرمایہ داری کی طرف جو تبدیلیاں ہوئیں۔ وہ ہرگز اتنی بنیادی نہیں تھیں۔ اس لئے کہ وہ ذاتی ملکیت کے حدود کے اندر ہی واقع ہوئیں۔ اور وہ ذاتی ملکیت کو ختم نہ کر سکیں۔ لیکن اشتراکی انقلاب جس سماجی تبدیلی کو وجود میں لاتا ہے۔ وہ سب سے زیادہ بنیادی ہے۔ ایک بنیادی تبدیلی تو اس وقت ہوئی۔ جب ذاتی ملکیت وجود میں آئی۔ اور دوسری بنیادی تبدیلی اب ہو رہی ہے جب کہ ذاتی ملکیت ختم ہو رہی ہے۔ گویا چار پانچ ہزار سال کے بعد انسانی سماج میں اتنا گہرا اور بنیادی انقلاب آج تک نہیں ہوا۔ جب چرچل چیخ کر کہتا ہے۔ کہ سوویت نظام انسانی تمدن

www.taemeernews.com

کو ختم کئے ڈالتا ہے۔ تو دراصل اس کے پیش نظر یہ حقیقت ہوتی ہے۔ کہ دنیا کے تمام قدیم و جدید تمدن ذاتی ملکیت پر ہی مبنی تھے۔ اور ذاتی ملکیت کے وجود میں آنے سے پہلے دنیا میں تمدن کا وجود ہی نہیں تھا۔ وہ یہ سوچنے سے قاصر ہے۔ کہ اب سماجی ارتقا کی وہ منزل آپہنچی ہے۔ جب تمدن کی بقا کے لئے ذاتی ملکیت کی کوئی ضرورت نہیں۔ بلکہ اسے تباہ و برباد کر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ اب اگر تمدن کی ترقی کی رفتار کو برقرار رکھنا ہے۔ تو ذاتی ملکیت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔ اب انسان نے قدرت پر اتنا قابو حاصل کر لیا ہے۔ اور اس نے ایسے آلات پیدا کر لئے ہیں۔ کہ کچھ لوگوں کو تمدن کی تعمیر میں مصروف رکھنے کے لئے عظیم اکثریت کو کم تر زندگی گزارنے پر مجبور کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔

غرض سوویت تمدن کی عظیم الشان تاریخی اہمیت یہی ہے۔ کہ وہ انسانی تاریخ کا پہلا تمدن ہے جس کی بنیاد ذاتی ملکیت پر قائم نہیں بلکہ اجتماعی ملکیت پر۔ یہ تمدن ابھی تک تکمیلی شکل اختیار نہیں کر سکا ہے لیکن نہایت تیز رفتاری کے ساتھ تکمیل کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ اور مزدوروں کی حکومت میں اس کا تکمیل تک پہنچنا ایک لازمی اور یقینی امر ہے۔

یہ ہے سوویٹ تمدن کی بنیادی خصوصیت۔ اب ہم اس کے خارجی ڈھانچے اور اس کی داخلی خصوصیات یعنی اس کی تہذیب کا مطالعہ کریں گے۔

معاشی نظام

ہر تمدن کسی مخصوص معاشی نظام کی پیداوار ہوتا ہے۔ اس لئے ہم سب سے پہلے سوویٹ معاشی نظام کی خصوصیات سے بحث کریں گے۔ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے سوویٹ معاشی نظام کی بنیاد اجتماعی ملکیت پر قائم ہے۔ دولت پیدا کرنے کے تمام ذرائع، زمینیں، کارخانے ملیں اور آلات وغیرہ پوری جماعت کی ملک ہیں۔ یہ معاشی نظام کسی خاص طبقے کے فائدے کے اصول پر قائم نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ ہر فرد کے فائدے کے اصول پر۔ یہ نظام چند لوگوں کی نفع اندوزی کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ پوری جماعت کی خدمت کے لئے۔ آج تک دنیا کے کسی بھی متمدن نظام میں سماج کے تمام افراد کے ساتھ اس طرح بالکل یکساں اور مساوی سلوک روا نہیں رکھا گیا ہے۔ سوویٹ معاشی نظام کے ماتحت پہلے سماج کے تمام افراد کی ضرورتوں کا تخمینہ کیا جاتا ہے۔ پھر اسی کے لحاظ سے چیزیں پیدا کی جاتی ہیں۔ اس اصول کی پابندی کی جاتی ہے کہ سماج میں جس چیز کی ضرورت ہے۔ وہی پیدا کی جائے۔ اس میں سماج کی فوجی اور صنعتی ضروریات بھی شامل ہیں۔ اس سلسلے میں بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور جوانوں کی عام اور مشترکہ ضروریات کے علاوہ ان کی الگ الگ اور خاص خاص ضروریات کا بھی پورا پورا خیال کیا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے سرمایہ دارانہ معاشی نظام میں چیزیں صرف سرمایہ داروں کے نفع کے لئے پیدا کی جاتی ہیں۔ چاہے سماج کی ضرورتیں پوری ہوں یا نہ ہوں۔ سرمایہ دار جو ذرائع پیداوار کا مالک ہوتا ہے۔ وہی چیزیں پیدا کرتا ہے جس سے اسے منافع حاصل ہونے کی امید ہوتی ہے اس کے پیش نظر پھر سے سماج کی ضروریات کا خیال نہیں رہتا۔ سوویت معاشی نظام میں جب سماج کے تمام افراد

www.taemeernews.com

کی ضرورتوں کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ تو نہ صرف مادی اور جسمانی ضروریات کا خیال کیا جاتا ہے بلکہ ذہنی اور جمالیاتی ضروریات کا بھی۔ یعنی سوویت معاشی نظام ہر فرد کے لئے کھانے کپڑے کے ساتھ ساتھ علم، آرٹ، ادب اور موسیقی وغیرہ بھی مہیا کرتا ہے۔ دولت کی پیدائش اور تقسیم کی پوری تنظیم اسی مقصد سے کی جاتی ہے۔ سوویت معاشی نظام چیزیں پیدا کرنے والوں کے لئے وجود میں نہیں لایا گیا۔ بلکہ چیزیں استعمال کرنے والوں کے لئے سوویت نظام میں طبقوں کا وجود نہیں ہے۔ اس میں نہ کوئی ایسا طبقہ ہے۔ جو دوسرے طبقوں کا استحصال کرتا ہو اور نہ ایسے طبقے جن کا استحصال کیا جاتا ہو۔ وہ تو اس بنیادی اصول پر قائم ہے۔ کہ ہر شخص سے اس کی جسمانی اور ذہنی طاقت کے مطابق کام لیا جائے۔ اور ہر شخص کی ضروریات پوری کی جائیں۔ ایسے معاشی نظام میں ہر فرد کو لازمی طور پر روزگار مہیا کیا جاتا ہے۔ اور اسے کام کے ساتھ ساتھ فرصت کے اوقات، اور مالی تحفظ حاصل رہتا ہے۔ وہاں بیکاری کبھی نہیں آسکتی۔ اور نہ سرمایہ دارانہ نظام کی طرح یہ صورتِ حال پیدا ہوتی ہے۔ کہ ایک طرف چیزوں کی افراط ہے۔ اور دوسری طرف لوگ بھوک سے مر رہے ہیں۔ اور اشیائے ضرورت کے لئے ترس رہے ہیں

سوویت معاشی نظام میں انسان مشین کا غلام نہیں ہے۔ بلکہ مشین ہی انسان کے قبضہ و اختیار میں ہے۔ چنانچہ سرمایہ دارانہ نظام کے برخلاف وہاں مشین سے اور نئی نئی مشینی ایجادوں سے لوگ خوف نہیں کھاتے۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں ہر ایجاد کے معنی ہیں۔ کچھ مزدوروں کا بیکار ہو جانا۔ لیکن سوویٹ معاشی نظام میں مشینی ایجادوں سے یہ ہوتا ہے۔ کہ مزدوروں کی فرصت کے اوقات میں اضافہ ہو جاتا ہے اس لئے وہ مشینی ایجادوں کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ چنانچہ بائیس سال کے قلیل عرصے میں سوویت یونین میں نہ صرف چیزیں پیدا کرنے والی تمام مشینیں آگئی ہیں۔ بلکہ مشینیں بنانے والی تمام مشینیں بھی اب وہیں پیدا کی جانے لگی ہیں۔ مشینی ایجادیں بھی تیزی سے ہو رہی ہیں۔ انقلاب سے پہلے کے غیر صنعتی نظام کے مقابلے میں یہ تو حیرت انگیز ہے۔ سوویت یونین کی صنعتی ترقی کی رفتار کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے۔ کہ وہ بہت جلد اکیلا باقی دنیا کے مقابلے میں صنعتی طاقت کے لحاظ سے زیادہ ترقی کر جائیگا۔

سوویت معاشی نظام میں صنعت اپنا مقصد آپ نہیں۔ بلکہ وہ محض انسانی اور سماجی ضروریات کے پورا کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ سوویت معاشی نظام میں روز بروز چیزوں کی قیمتیں گھٹتی جا رہی ہیں۔ اور اس کے مقابلے میں لوگوں کی آمدنی اور تنخواہوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس طرح معیار زندگی بلند ہو رہا ہے اور چیزوں کی کھپت بھی تیزی کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہے۔ وہاں کی پیدائش اشیا کا نظام اس رجحان کا ساتھ دے رہا ہے۔ معاشی خوشحالی کے نتیجے کے طور پر تہذیبی ترقی بھی اعلیٰ پیمانے پر ہو رہی ہے۔

سوویت کارخانوں کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے۔ کہ وہاں سرمایہ دار ملکوں کے کارخانوں کی طرح مینجر یا ڈائرکٹر اور مزدور میں تصادم اور مناقشے کی صورت نہیں رہتی۔ اور دونوں میں مقصد کا تضاد نہیں پایا جاتا۔ انگلستان یا امریکہ کے کارخانوں میں کارخانے کے مالک، ڈائرکٹر اور مینجر کے مقصد میں اور مزدور کے

www.taemeernews.com

مقصد میں بنیادی اختلاف موجود ہوتا ہے۔ مالک پیدائش اور اشیا کے اخراجات کو گھٹانے کے لئے مزدور کو کم سے کم تنخواہ دینا چاہتا ہے۔ اور مزدور اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے زیادہ تنخواہ کا مطالبہ کرتا ہے۔ مقصد کا یہ اختلاف پیدائش اشیا کے نظام پر خراب اثر ڈالتا ہے۔ سوویت نظام میں منیجر یا ڈائرکٹر اور مزدور کے مقصد میں مکمل ہم آہنگی اور مطابقت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ مقصد ہے پورے سماج کے فائدے کے لئے چیزیں پیدا کرنا۔ سوویت کارخانوں کی اندرونی تنظیم بھی ایسی ہوتی ہے۔ جس کے تحت مزدور کو جمہوریت اور باہمی تعاون اور سماجی خدمت کی تربیت اور تعلیم ملتی ہے۔ اس ماحول میں اس کی شخصیت ترقی کر کے بلند ترین اخلاقی منزل پر پہنچ جاتی ہے چنانچہ سوویت کارخانوں میں مزدور کو کام بوجھ نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ مسرت اور خدمت کا ایک ذریعہ۔ یہ احساس کہ وہ کارخانے میں کام کر کے خود کو فائدہ پہنچانے کے علاوہ عظیم الشان انسانی اور سماجی خدمت انجام دے رہا ہے کام کو مسرت اور طمانیت کا ایک ذریعہ بنا دیتا ہے۔

سیاسی نظام

سوویت ریاست کی اساس دو اصولوں پر قائم ہے۔ (۱) بلا لحاظ نسل، رنگ، قوم، صنف تمام اشخاص کے حقوق برابر ہیں۔ (۲) سوویت وفاق کی تمام قوموں اقلیتوں اور اکثریتوں کے حقوق برابر ہیں۔ سوویت ریاست کو مزدور حکومت چلا رہی ہے۔

۱۹۳۶ء کے دستور کے مطابق ہر فرد کو مندرجہ ذیل حقوق دیئے گئے ہیں:۔

۱۔ روزگار حاصل کرنے کا حق۔

۲۔ آرام کرنے کا حق

۳۔ تعلیم حاصل کرنے کا حق

۴۔ بڑھاپے اور دورانِ علالت میں سرکاری تحفظ کا حق

یہ حقوق محض الفاظ کا گورکھ دھندا نہیں ہیں۔ بلکہ حقیقت پر مبنی ہیں۔ سوویت ریاست میں آج کوئی بیکار نہیں ہے۔ ہر شخص کو سال میں طویل عرصے تک تنخواہ کے ساتھ چھٹی ملتی ہے۔ عام حالتوں میں سات گھنٹے اور خاص حالتوں میں آٹھ گھنٹوں سے زیادہ کام نہیں لیا جا سکتا۔ کوئی ایسا شخص نہیں ہے۔ جو تعلیم حاصل کرنے کی عمر میں ہے۔ اور سرکاری امداد سے تعلیم حاصل نہیں کر رہا ہے۔ بڑھاپے اور دورانِ علالت میں ہر فرد کو سرکاری مالی تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ سوویت نظام میں اگر کسی فرد کو روزگار نہ ملے۔ تو وہ ریاست کے خلاف مقدمہ دائر کر سکتا ہے اور عدالت میں چارہ جوئی کر سکتا ہے۔

سوویت نظام میں بلا امتیاز نسل، رنگ، زبان اور عقیدہ ہر مرد و عورت کو ۱۸ برس کی عمر سے ووٹ دینے کا حق حاصل ہے۔ دنیا میں کسی بھی ملک میں ووٹ دینے کے حق کو اتنا وسیع نہیں کیا گیا ہے۔

سوویت ریاست کے ہر فرد کو مکمل سیاسی مساوات حاصل ہے۔ سیاسی مساوات کا انحصار دراصل معاشی مساوات پر ہے۔ انگلستان میں اصولی طور پر ایک بڑے سرمایہ دار اور ایک معمولی آدمی دونوں کو پارلیمنٹ

www.taemeernews.com

کی نشست کے لئے کھڑا ہونے کا حق حاصل ہے۔ لیکن حقیقت کیا ہے؟ معمولی آدمی سرمایہ دار کے مقابلے میں کبھی کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ اس کا شکست کھا جانا یقینی ہے۔ لیکن سوویت نظام میں چونکہ معاشی لحاظ سے لوگوں کو مساوات حاصل ہے۔ اس لئے انہیں حقیقی معنوں میں مساوات بھی حاصل ہے۔ سوویت ریاست کا کوئی بھی فرد محض اپنی خدمات، صلاحیت اور قابلیت کی بنا پر کسی بھی نشست کے لئے کھڑا ہو سکتا ہے اور کامیاب ہو سکتا ہے۔

سوویت وفاق میں تمام قومیں کے محنت کش عوام خود اپنی رضامندی اور خواہش سے شامل ہیں۔ قومیں جس وقت بھی چاہیں۔ وفاق سے ایک گھنٹے کے نوٹس پر علیحدگی اختیار کر سکتی ہیں۔ لیکن وہ ایسا اس لئے نہیں کرتیں۔ کہ اشتراکی سماج قائم کرنے کی کوشش میں کامیاب ہونے کے لئے اور دنیا کی سرمایہ دار سامراجی طاقتوں کی دستبرد سے محفوظ رہنے کے لئے وہ ساتھ رہنا پسند کرتی ہیں۔ چنانچہ آجکل سوویت وفاق کی ہر قومی ریاست نے اپنے تحفظ کے اختیارات اور خارجی پالیسی ایک مرکزی اقتدار کے حوالے کر رکھی ہے۔ لیکن ۱۹۴۴ء کی دستوری تبدیلی کی رُو سے یوکرین اور بیلو روس کی قومی ریاستوں کو خارجی پالیسی کی بھی خود مختاری حاصل ہے۔ ہر قومی ریاست کے نمائندے مرکزی مجلس قانون ساز میں موجود ہیں۔ اور انہیں مساوی حقوق اور اختیارات حاصل ہیں۔ ہر قومی ریاست کو معاشی، لسانی، تعلیمی، تہذیبی اور خود مختاری اور انتظامی امور کی آزادی حاصل ہے ہر قومی ریاست کے تمام سرکاری لوگ خود وہیں کے باشندوں میں سے چنے جاتے ہیں۔ اور ہر قومی ریاست کی زبان خود وہیں کی مقامی زبان ہے۔ ہر قومی ریاست میں تعلیم بھی مقامی زبان میں دی جاتی ہے۔ ہر قومی ریاست اپنے دستورِ اساسی کی تشکیل بھی خود ہی کرتی ہے۔ ہر ریاست کے اندر پائی جانے والی اقلیت کو اکثریت کے برابر اور مساوی حقوق حاصل ہیں۔ اور دونوں میں صرف کاغذی طور پر نہیں۔ بلکہ عملی طور پر قطعی کسی قسم کا کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جاتا۔ چنانچہ سوویت ریاست ہی دنیا کا وہ واحد نظام ہے۔ جہاں یہودیوں کا مسئلہ بالکل حل کر لیا گیا ہے۔

معاشرتی نظام

سوویت نظام میں انسانی تمدن کی تاریخ میں پہلی بار عورت کو مکمل طور پر مرد کے مساوی درجہ دیا گیا ہے۔ عورت نے یہ آزادی کئی ہزار سال کے بعد حاصل کی ہے۔ تمدن کی ابتدا ہی ذاتی ملکیت کے قیام اور اس کے نتیجے یعنی عورت کی غلامی سے ہوئی تھی۔ سوویت تمدن دنیا کا پہلا تمدن ہے۔ جس نے دونوں چیزوں کو ختم کر دیا ہے۔ انسانی سماج میں حاکم محکوم کے اولین طبقے مرد اور عورت کے درمیان پیدا ہوتے تھے۔ سوویت کے غیر طبقاتی تمدن میں لازمی طور پر اس اولین طبقاتی اختلاف کو مٹا دیا گیا ہے۔ عورت اب مرد کے ساتھ ساتھ تمام معاشی، سیاسی، تعلیمی اور تہذیبی امور میں حصہ لے سکتی ہے۔ وہ استانی سے لے کر فوج کی کمانڈر اور ریاست کی وزیر اعظم تک بن سکتی ہے۔ چنانچہ آج سوویت ریاست میں ایک لاکھ سے زیادہ عورتیں، انجینیر اور ٹکنیکی ماہرین کی حیثیت سے مختلف صنعتوں میں کام کر رہی ہیں۔ اور

www.taemeernews.com

کو مرد کے برابر تنخواہ ملتی ہے۔ اور زچگی کی حالت میں پوری تنخواہ کے ساتھ طویل عرصے کی فرصت ملتی ہے۔ مفت طبی امداد مہیا کرنے کے علاوہ بچے کی پیدائش اور دیکھ بھال میں ریاست ہر عورت کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ اس طرح عورت کو تھکا دینے والے اور جان لیوا گھریلو کاموں کا بوجھ برداشت نہیں کرنا پڑتا۔ جو تھوڑے بہت گھریلو امور اُسے انجام دینے پڑتے ہیں۔ وہ اُسے کوفت کی بجائے مسرت اور آرام کی دولت عطا کرتے ہیں۔ عورت کی گھریلو زندگی کوفت کی بجائے راحت اور سکون سے لبریز ہے۔ اور وہ تہذیبی امور میں دلچسپی لینے کے لئے کافی وقت بچا سکتی ہے۔ گھر کی دُنیا سے باہر کی دنیا سے لطف اندوز ہونے سے نہیں رہ سکتی۔

وہ اب دولت دیکھ کر شادی نہیں کرتی۔ بلکہ اپنی خواہش کے مطابق اور خالص محبت کی بنا پر۔ اس لئے کہ وہ اب معاشی لحاظ سے آزاد ہے۔ اور معاشی لحاظ سے اپنے شوہر کی دستِ نگر نہیں ہے۔ اولاد کی پیدائش اس کے لئے فکر و آلام اور مصائب کی دنیا نہیں بلکہ حقیقی مسرت کا پیغام لاتی ہے۔ وہ معاشی لحاظ سے آزاد ہونے کی بنا پر شوہر کو جنسی بے راہ روی سے روک سکتی ہے۔ اور بدچلن شوہر کے ظلم و ستم سے بغاوت کر کے بآسانی طلاق حاصل کر سکتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ وہاں کثرتِ طلاق ہے۔ بحیثیت مجموعی سوویت سماج میں کثرتِ طلاق کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ اور صرف خاص خاص حالات میں طلاق کو پسند کیا جاتا ہے۔ پھر بھی طلاق کی مکمل آزادی ہے۔

اس طرح سوویت سماج میں یک ازدواجی کا اطلاق نہ صرف عورتوں پر ہوتا ہے۔ بلکہ مردوں پر بھی۔ اب مرد اپنے معاشی اقتدار سے فائدہ اٹھا کر بیوی کو اپنی جنسی بے راہ روی کی روحانی تکلیف برداشت کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ اب تک تمدن کی پوری تاریخ میں یک ازدواجی کی پابندی صرف عورتوں سے کرائی گئی تھی۔ مرد اس کی پابندیوں سے آزاد تھا۔ وہ یک طرفہ یک ازدواجی تھی۔ سوویت سماج کی یک ازدواجی مکمل یک ازدواجی ہے۔ اس لئے کہ اس کی پابندی عورت اور مرد دونوں پر لازم ہے۔

سوویت تمدن پہلا تمدن ہے۔ جہاں طوائفوں کے وجود کا قلع قمع کر دیا گیا ہے۔ جب سے تمدن پیدا ہوا انسانی سماج طوائفوں کے وجود سے نجات نہ پا سکا تھا۔ سوویت سماج پہلا سماج ہے جس نے اس سے نجات حاصل کر لی ہے۔ تمام صنعتوں، حرفتوں اور باعزت پیشوں کا دروازہ عورت پر وا کر کے اُسے خوددار اور آزاد بنا دیا گیا ہے۔ اب وہ پیٹ کی خاطر اپنی عفت و عصمت فروخت نہیں کرتی۔

سوویت سماج میں جنسی الجھنیں، غیر صحت مند قسم کی جنسی بھوک اور بے راہ روی بہت کم پائی جاتی ہے اور جو کچھ ہے وہ تیزی کے ساتھ ختم ہوتی جا رہی ہے۔ وہ نیا انسان جو سوویت سماج میں پیدا ہو رہا ہے۔ ان تمام جسمانی اور نفسیاتی بیماریوں سے پاک ہے۔ جنسی مسائل کی طرف اس کا رویہ صحت مند ہوتا ہے۔ وہاں انسان کی جنسی خواہش اپنی فطری حالت پر آ رہی ہے۔ وہ ایک مرض بن کر انسان کی اخلاقی، جسمانی اور ذہنی زندگی کو پامال نہیں کرتی۔

www.taemeernews.com

سوویٹ سماج میں خاندان ایک معاشی وحدت نہیں رہا۔ لیکن وہ ایک اخلاقی اور معاشرتی وحدت ضرور ہے۔ وہاں خاندانی اور گھریلو زندگی ختم نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ پہلے سے زیادہ خوشگوار، آرام دہ اور صاف ستھری ہوگئی ہے۔ اب معاشی کوفت گھریلو اور خاندانی زندگی کی مسرتوں کو تباہ نہیں کرتی۔ بیوی شوہر، ماں اور بچے کے تعلقات میں زیادہ خوشگواری پیدا ہوگئی ہے۔ اس لئے کہ اُن میں سے ہر کسی کو معاشی افکار و آلام سے نجات حاصل ہوتی ہے۔

تعلیمی نظام

۸ سے ۱۵ سال تک کی عمر کے ہر بچے اور بچی کے لئے تعلیم مفت اور لازمی ہے۔ سوویت نظامِ تعلیم کا بنیادی مقصد یہ ہے۔ کہ فرد کو سماج اور انسانیت کا خدمت گذار بنائے۔ سوویت نظامِ تعلیم میں سب سے پہلے یہ بتایا جاتا ہے۔ کہ جسمانی محنت کرنا کوئی ذلیل بات نہیں ہے بلکہ وہ اتنی ہی قابلِ عزت اور اہم ہے جتنی دماغی محنت۔ سوویت نظامِ تعلیم میں طالب علموں کے اندر وسیع النظری اور جامعیت پیدا کرنے کے لئے انہیں پہلے پورے سماجی اور معاشی نظام سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ ہر جزو کو کُل کے ساتھ دیکھ سکیں۔ وہ جزو کو علیحدہ کرکے نہیں دیکھتے۔ بلکہ کُل سے ہر جزو کے تعلق پر نظر رکھتے ہیں۔ اور کُل کے ساتھ ساتھ جزو کا بھی مطالعہ کرتے ہیں یہ جامعیت اور وسیع النظری ان کے اندر پلی ٹیکنیک کی تربیت دی جاتی ہے۔ اور پورے پیدائش اشیا کے نظام سے اور سماج سے اس کا جو گہرا تعلق ہے۔ اس سے انہیں آگاہ کیا جاتا ہے۔ سوویت طالب علموں کو بچپن ہی سے دوسروں کے ساتھ تعاون اور اشتراکِ عمل کا سبق دیا جاتا ہے۔ اور ان کے اندر غلط قسم کی انفرادیت پسندی اور خود غرضی کو ختم کرکے اجتماعیت پسندی پیدا کی جاتی ہے۔ ان کے اندر گرد و پیش کے حالات کو سمجھنے اور ان میں دلچسپی لینے کی اہلیت پیدا کی جاتی ہے۔ ان کو صرف اپنے ذاتی اور خود غرضانہ معاملات میں دلچسپی لینا نہیں سکھایا جاتا۔ سوویت نظامِ تعلیم میں غلط قسم کی مقابلہ بازی اور حاسدانہ جذبات کو روکنے کے لئے طلباء کو فرداً فرداً نمبر نہیں دیئے جاتے۔ بلکہ اجتماعی سعی و عمل اور اجتماعی تعاون کی تربیت دینے کے لئے پورے پورے کلاس کو الگ الگ نمبر دیئے جاتے ہیں۔ یعنی مقابلہ افراد کے درمیان نہیں ہوتا بلکہ جماعتوں کے درمیان۔ سوویت طالب علم کے لئے تعلیم گاہوں سے باہر بھی ہزاروں تعلیمی کلب اور مطالعہ گاہیں قائم ہیں۔ جن میں داخل ہوکر وہ اپنی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کو ترقی دے سکتے ہیں۔ سوویت بچوں کے ذہن سے بالکل ابتدا ہی سے رنگ و نسل اور قومیت کے تعصبات کو مٹانے کی ارادی کوشش کی جاتی ہے سوویت طالب علموں کو پوری توجہ اور سکون دماغ کے ساتھ تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس لئے کہ حکومت ان کی مالی امداد کرتی ہے۔ اور ان کی تمام علمی و تعلیمی ضروریات کی چیزیں مہیا کرتی ہے۔ سوویت طالب علم کے سامنے ترقی کے بیشمار اور لاتعداد مواقع اور امکانات کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔ اسے تعلیمی زندگی ختم کرنے کے بعد بیکاری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ سوویت ریاست عنقریب مکمل طور پر تعلیم یافتہ لوگوں کی ریاست ہوجائیگی۔ جس میں ایک بھی جاہل یا اَن پڑھ نظر نہیں آئیگا۔ سوویت نظام میں جتنی کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ اتنی دنیا میں

www.taemeernews.com

کہیں نہیں شائع ہوتیں۔

سوویت ریاست کے افراد کو مالی تحفظ اور فرصت کے اوقات حاصل ہیں۔ چنانچہ انہیں علم و ادب اور آرٹ سے دلچسپی لینے کے بے شمار مواقع ملتے ہیں۔ سوویت نظام میں تہذیب کا معیار دن بدن زیادہ سے زیادہ بلند ہوتا جا رہا ہے۔ ہر قوم کی اپنی تہذیب، اپنے آرٹ، اپنے ادب اور اپنے فنونِ لطیفہ کو نشو و نما دینے کے پورے پورے مواقع حاصل ہیں۔ اور کسی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ دوسری قوموں کی ادبیات اور فنونِ لطیفہ میں بھی سوویت قومیں گہری دلچسپی لیتی ہیں۔ سوویت سرزمین کے طول و عرض میں بیشمار ناٹک گھر، مطالعہ گاہیں، موسیقی کلب، رقص گاہیں اور فنونِ لطیفہ کے ادارے پھیلے ہوئے ہیں۔ جو ہر ہر فرد کو تہذیب و تمدن اور علم و ادب کی برکتوں سے مالا مال کر رہے ہیں۔ سوویت تمدن پہلا تمدن ہے جس میں تہذیب کی دولت صرف چند افراد کو حاصل نہیں ہے۔ بلکہ ہر ہر فرد کو۔ سوویت نظامِ تعلیم میں سائنس کی زبردست اہمیت ہے۔ وہاں سائنس کو شک و شبہ کی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ برخلاف اس کے امریکہ اور انگلستان کے بہت سے مفکرین سائنس ہی پر موجودہ سماجی خرابیوں اور برائیوں کا الزام دھرتے ہیں۔ سوویت نظام سے زیادہ سائنس کی ترقی کے لئے موافق فضا اور کہیں نہیں مل سکتی۔ وجہ ظاہر ہے۔ سوویت نظام میں سائنس کی ترقی کے معنی ہیں مزدور کے آرام اور فرصت کے اوقات میں مزید اضافہ۔ لیکن سرمایہ دارانہ نظام کے موجودہ دور میں سائنس کی ترقی سے بیکاری اور بیروزگاری کے بڑھنے کا اندیشہ ہے۔ دُنیا کے کسی ملک میں سائنس سوویت نظام کی طرح سماجی تنظیم و ترقی کا ایک لازمی حصّہ اور اس کی بنیاد نہیں ہے۔

سوویت نظام کی اخلاقی بلندی

سوویت نظام اس اصول پر مبنی ہے۔ کہ انسانی سماج ایک خاندان ہے۔ ہر فرد کو اس خاندان سے تحفظ اور آرام و ترقی کا مطالبہ کرنے کا حق ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہر فرد پہ خاندان کی طرف سے کچھ فرائض عاید ہوتے ہیں۔ جن کو ادا کرنا اس کے لئے ضروری ہے۔ سوویت نظام اس اصول پر مبنی نہیں ہے۔ کہ انسانی سماج میں طبقات اور مدارج قائم ہیں۔ جن کے تحت کچھ لوگوں کو حکمرانی اور آرام و آسائش کا حق حاصل ہے۔ اور باقی تمام لوگوں کے لئے فرماں برداری اور مصائب و آلام کا برداشت کرنا ضروری ہے۔ اس سے سوویت تمدن کی عظیم الشان اخلاقی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ پھر سوویت تمدن کی اساس خود غرضی اور نفع خوری پر قائم نہیں ہے۔ بلکہ انسان کی خدمت پر۔ مغرب میں عام شکایت پائی جاتی ہے۔ کہ مادّی ترقی کے مقابلے میں اخلاقی ترقی کی رفتار سست ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ مغربی ملکوں میں مادی ترقی کی بنیاد خود غرضانہ نفع خوری پر قائم ہے۔ برخلاف اس کے سوویت تمدن میں مادی ترقی چونکہ انسانی خدمت کے لئے ہو رہی ہے۔ اس لئے اخلاقی ترقی اور مادی ترقی کی رفتار یکساں ہے۔ اور دونوں میں کوئی تضاد یا اختلاف نہیں پایا جاتا۔ دونوں ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں۔ بلکہ ایک دوسرے کی ممد و معاون

www.taemeernews.com

اخلاقیات اور سائنس ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔ اور دونوں کو ایک دوسرے سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ سوویٹ نظام نے ہر فرد کو مادی افکار و آلام سے نجات دلا کر اسے اعلیٰ تہذیبی اور روحانی ترقی حاصل کرنے کا زبردست موقع عطا کیا ہے۔ سوویٹ افراد کے دل سے مادی تحفظ نے ہر قسم کا خوف و ہراس مٹا دیا ہے اس لئے ہر مصیبت کے موقع پر پورا انسانی سماج اس کی مدد کرنے کے لئے تیار ہے۔ سوویٹ نظام میں انفرادی اور ذاتی کاروبار و تجارت کو ختم کرکے پبلک جھوٹ اور پبلک دھوکہ بازی کے مواقع بھی ختم کر دیئے گئے ہیں۔ اور اس طرح افراد کی اخلاقی سطح کو پہلے سے زیادہ بلند کر دیا ہے۔ سوویٹ نظام نے غربت اور مفلسی کو ختم کرکے جرائم کی اصل بنیاد کا قلع قمع کر دیا ہے۔ سوویٹ نظام کے تحت ذاتی فائدہ اور اجتماعی فائدے کا فرق اور تضاد بالکل مٹ گیا ہے۔ اب وہاں ذاتی فائدے کا کام کرتے ہوئے انسان جنگی فائدے کا کام بھی کر رہا ہوتا ہے۔ اور اجتماعی فائدے کے کام میں مصروف رہ کر اپنی ذات کو بھی فائدہ پہنچا سکتا ہے۔

سوویٹ تمدن میں اب پہلی بار تمام بڑے بڑے مفکّروں، فلسفیوں، پیغمبروں اور تمام مذاہب کے اعلیٰ اصولوں کو عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ ایسے تمدن کا اخلاقی اور روحانی معیار کتنا بلند اور ارفع ہوگا۔

عظمتِ آدم

ظہیر کاشمیری کا مجموعۂ کلام

ظہیر کاشمیری پہلا شاعر ہے جس نے گہرے فکر سے کام لیکر مثالیت اور مادیت کے ڈانڈے ملا دیئے
ظہیر کاشمیری پہلا شاعر ہے جس نے تاریخی، سیاسی اور اقتصادی مسائل کو نئے جمالیاتی جامے پہنائے
ظہیر کاشمیری پہلا شاعر ہے جس نے فکری تناقص کے بغیر، فرد اور ریاست کے بڑے سے بڑے معاملے پر مستند رائے دی۔
ظہیر کاشمیری پہلا شاعر ہے۔ جو جدید اور ترقی پسند ہونے کے باوجود کلاسیکی ادب کا حمایتی ہے

عظمتِ آدم

ماضی اور حال کی غلط روایتوں کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔

عظمتِ آدم

آنے والی نسلوں کے لئے فلسفہ اور آرٹ کی سب سے بڑی دستاویز ہے۔

نیا ادارہ

www.taemeernews.com

سعادت حسن منٹو

افسانہ نگار اور جنسی مسائل

کوئی حقیر سے حقیر چیز بھی کیوں نہ ہو، مسائل پیدا کرنے کا باعث ہو سکتی ہے ——— مسہری کے اندر ایک مچھر گھس آئے تو اس کو باہر نکالنے، مارنے اور آئندہ کے لئے دوسرے مچھروں کی روک تھام کرنے کے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں ——— لیکن دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ یعنی تمام مسئلوں کا باپ اس وقت پیدا ہوا تھا۔ جب آدم نے بھوک محسوس کی تھی اور اس سے چھوٹا مگر دلچسپ مسئلہ اس وقت پردۂ ظہور میں آیا تھا جب دنیا کے اس سب سے پہلے مرد کی دنیا کی سب سے پہلی عورت سے ملاقات ہوئی تھی۔

یہ دونوں مسئلے جیسا کہ آپ جانتے ہیں، دو مختلف قسم کی بھوکیں ہیں جن کا آپس میں بہت گہرا تعلق ہے ——— یہی وجہ ہے کہ ہمیں اس وقت جتنے معاشرتی، جنسی، سیاسی اور جنگی مسائل نظر آتے ہیں اُن کے عقب میں یہی دو بھوکیں جلوہ گر ہیں۔

موجودہ جنگ کا خونیں پردہ اگر اٹھا دیا جائے تو لاشوں کے انبار کے پیچھے آپ کو ملک گیری کی بھوک کے سوا اور کچھ نظر نہیں آئے گا۔

بھوک کسی قسم کی بھی ہو بہت خطرناک ہے ——— آزادی کے بھوکوں کو اگر غلامی کی زنجیریں ہی پیش کی جاتی رہیں تو انقلاب ضرور برپا ہو گا ——— روٹی کے بھوکے اگر فاقے ہی کھینچتے رہے تو وہ تنگ آ کر دوسرے کا نوالہ ضرور چھینیں گے ——— مرد کی نظروں کو اگر عورت کے دیدار کا بھوکا رکھا گیا تو شاید وہ اپنے ہم جنسوں اور حیوانوں ہی میں اُس کا عکس دیکھنے کی کوشش کریں۔

دنیا میں جتنی لعنتیں ہیں، بھوک ان کی ماں ہے ——— بھوک گداگری سکھاتی ہے، بھوک جرائم کی ترغیب دیتی ہے، بھوک عصمت فروشی پہ مجبور کرتی ہے، بھوک انتہا پسندی کا سبق دیتی ہے ——— اس کا حملہ بہت شدید، اس کا وار بہت اوچھا اور اس کا زخم بہت گہرا ہوتا ہے ——— بھوک دیوانے پیدا کرتی ہے، دیوانگی بھوک پیدا نہیں کرتی۔

دنیا کے کسی کونے کا مصنف ہو، ترقی پسند ہو یا تنزل پسند، بوڑھا ہو جوان، اُس کے پیش نظر دنیا کے تمام بکھرے ہوئے مسائل رہتے ہیں۔ جن جن کو وہ ان پر لکھتا رہتا ہے، کبھی کسی کے حق میں کبھی کسی

www.taemeernews.com

کے خلاف!

آج کا ادیب بنیادی طور پر آج سے پانچ سو سال پہلے کے ادیب سے کوئی زیادہ مختلف نہیں — ہر چیز پر نئے پُرانے کا لیبل وقت لگاتا ہے، انسان نہیں لگاتا — ہم آج نئے ادیب کہلاتے ہیں، کل نئے والی کل ہمیں پرانا کر کے الماریوں میں بند کر دے گی، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم بیکار رہے، ہم نے مفت میں مغز دردی کی — گھڑی کی سوئی جب ایک سے گذر کر دو کی طرف رینگتی ہے تو ایک کا ہندسہ بے مصرف نہیں ہو جاتا — پورا سفر طے کر کے سوئی پھر اسی ہندسے کی طرف لوٹتی ہے — یہ گھڑی کا اصول بھی ہے اور دُنیا کا بھی۔

آج کے نئے مسائل بھی گذری ہوئی کل کے پُرانے مسائل سے بنیادی طور پر مختلف نہیں۔ جو آج کی برائیاں ہیں، گذری ہوئی کل ہی نے اُن کے بیج بوئے تھے۔

جنسی مسائل جس طرح آج کے نئے ادیبوں کے پیشِ نظر ہیں، اسی طرح پُرانے ادیبوں کے پیشِ نظر بھی تھے، — انہوں نے اِن پر اپنے رنگ میں لکھا، ہم آج اپنے رنگ میں لکھ رہے ہیں۔

مجھے معلوم نہیں، مجھ سے جنسی مسائل کے متعلق بار بار کیوں پوچھا جاتا ہے؛ — شاید اس لئے کہ لوگ مجھے ترقی پسند کہتے ہیں، یا شاید اس لئے کہ میرے چند افسانے جنسی مسائل سے متعلق ہیں، یا پھر اس لئے کہ آج کے نئے ادیبوں کو بعض حضرات "جنس زدہ" قرار دینے کا انہیں ادب، مذہب اور سماج سے یکقلم خارج کر دینا چاہتے ہیں — وجہ کچھ بھی ہو، میں اپنا نقطۂ نظر بیان کئے دیتا ہوں۔

روٹی اور پیٹ، عورت اور مرد — یہ دو بہت پُرانے رشتے ہیں، ازلی اور ابدی — روٹی زیادہ اہم ہے یا پیٹ؛ — عورت زیادہ ضروری ہے کہ مرد — میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا، اس لئے کہ میرا پیٹ روٹی مانگتا ہے لیکن مجھے یہ معلوم نہیں کہ گیہوں بھی میرے پیٹ کے لئے اتنا ہی ترستا ہے جتنا کہ میرا پیٹ؛

پھر بھی جب میں سوچتا ہوں کہ زمین نے گیہوں کے خوشوں کو بیکار جنم نہیں دیا ہوگا تو مجھے خوش فہمی ہوتی ہے کہ میرے پیٹ ہی کے لئے وسیع و عریض کھیتوں میں سنہری بالیاں جھومتی ہیں اور پھر ہو سکتا ہے کہ میرا پیٹ پہلے پیدا ہوا ہو اور گیہوں کی یہ بچیاں کچھ دیر کے بعد۔

کچھ بھی ہو لیکن یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ دُنیا کا ادب صرفِ دو رشتوں ہی سے متعلق ہے — الہامی کتابیں بھی جن کو آسمانی ادب کہنا چاہئے، روٹی اور پیٹ، عورت اور مرد کے تذکروں سے خالی نہیں۔

مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ مسائل اتنے پُرانے ہیں کہ ان کا ذکر الہامی کتابوں میں بھی آچکا ہے، تو پھر کیوں آج کے ادیب اِن پر خامہ فرسائی کرتے ہیں — کیوں عورت اور مرد کے تعلقات

www.taemeernews.com

کو بار بار کہا جاتا ہے اور بقول شخصے عریانی پھیلائی جاتی ہے ـــــ جواب اس سوال کا یہ ہے کہ اگر ایک ہی بار جھوٹ نہ بولنے اور چوری نہ کرنے کی تلقین کرنے پر ساری دنیا جھوٹ اور چوری سے پرہیز کرتی تو شاید ایک ہی پیغمبر کافی ہوتا ـــــ لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں پیغمبروں کی فہرست خاصی لمبی ہے۔

ہم لکھنے والے پیغمبر نہیں، ہم ایک ہی چیز کو، ایک ہی مسئلے کو مختلف حالات میں مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں اور جو کچھ ہماری سمجھ میں آتا ہے دنیا کے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور کبھی مجبور نہیں کرتے کہ وہ اسے قبول ہی کرے۔

ہم قانون ساز نہیں، محتسب بھی نہیں جو ثواب اور قانون سازی دوسروں کا کام ہے ـــــ ہم حکومتوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ لیکن خود حاکم نہیں بنتے، ہم عمارتوں کے نقشے بناتے ہیں لیکن معمار نہیں۔ ہم مرض بتاتے ہیں لیکن دواخانوں کے مہتمم نہیں۔

ہم جنسیات پر نہیں لکھتے، جو سمجھتے ہیں کہ ہم ایسا کرتے ہیں۔ یہ اُن کی غلطی ہے۔ ہم اپنے افسانوں میں خاص عورتوں اور خاص مردوں کے جنسی حالات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ہمارے کسی افسانے کی ہیروئن سے اگر اس کا مرد صرف اس لئے متنفر ہو جاتا ہے کہ وہ سفید کپڑے پسند کرتی ہے اور سادگی پسند ہے تو دوسری عورتوں کو اسے اصول نہیں سمجھ لینا چاہیئے۔ یہ نفرت کیوں پیدا ہوئی اور کن حالات میں پیدا ہوئی؟ ـــــ اس استفہام کا جواب آپ کو ہمارے افسانے میں ضرور مل جائے گا۔

جو لوگ ہمارے افسانوں میں لذت حاصل کرنے کے طریقے دیکھنا چاہتے ہیں، انہیں یقیناً ناامیدی ہوگی ـــــ ہم داؤ پیچ بتانے والے خلیفے نہیں۔ ہم جب اکھاڑے میں کسی گرتا دیکھتے ہیں تو اپنی سمجھ کے مطابق آپ کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ کیوں گرا تھا؟

ہم رجائی ہیں ـــــ دنیا کی سیاہیوں میں بھی ہم اجالے کی لکیریں دیکھ لیتے ہیں۔ ہم کسی کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتے ـــــ چکلوں میں جب کوئی مکھیائی اپنے کوٹھے پر سے کسی راہ گذر پر پان کی پیک تھوکتی ہے تو ہم دوسرے تماشائیوں کی طرح نہ تو کبھی اُس رہ گذر پر ہنستے ہیں اور نہ کبھی اُس مکھیائی کو گالیاں دیتے ہیں۔ ہم یہ واقعہ دیکھ کر رُک جائیں گے۔ ہماری نگاہیں اُس غلیظ پیشہ ور عورت کے نیم عریاں لباس کو چیرتی ہوئی، اُس کے سیاہ عصیاں بھرے جسم کے اندر داخل ہو کر اُس کے دل تک پہنچ جائیں گی۔ اُس کو ٹٹولیں گی اور ٹٹولتے ٹٹولتے ہم خود کچھ عرصے کے لئے تصور میں وہی کریہہ اور متعفن رنڈی بن جائیں گے ـــــ صرف اس لئے کہ ہم اس واقعے کی تصویر ہی نہیں بلکہ اُس کے اصل محرک کی وجہ بھی پیش کر سکیں۔

ہم جب کسی ویشیا کو دیکھتے ہیں تو اُس کی ہستی سے عورت کو نوچ کر علیحدہ نہیں کر دیتے۔ ہم بادلوں کے اندر سے دیکھنے کے عادی ہیں۔

جب کسی اچھے خاندان کی جوان، صحت مند اور خوبصورت لڑکی کسی مریل، بدصورت اور قلاش لڑکے کے ساتھ

www.taemeernews.com

بھاگ جاتی ہے تو ہم اُسے ملعون قرار نہیں دینگے۔ دوسرے اُس لڑکی کا ماضی، حال اور مستقبل اخلاق کی پھانسی میں لٹکا دیں گے لیکن ہم وہ چھوٹی سی گرہ کھولنے کی کوشش کریں گے جس نے اُس لڑکی کے ادراک کو بے حس کیا۔

انسان ایک دوسرے سے کوئی زیادہ مختلف نہیں۔ جو غلطی ایک مرد کرتا ہے، دوسرا بھی کر سکتا ہے۔ جب ایک عورت بازار میں دکان لگا کر اپنا جسم بیچ سکتی ہے تو دنیا کی سب عورتیں ایسا کر سکتی ہیں لیکن غلط کار انسان نہیں، وہ حالات ہیں جن کی کھیتیوں میں انسان اپنی غلطیاں پیدا کرتا ہے اور اُن کی فصلیں کاٹتا ہے۔

زیادہ تر جنسی مسائل ہی آج کے نئے ادیبوں کی توجہ کا مرکز کیوں بنے ہیں، اس کا جواب معلوم کرنا کوئی زیادہ مشکل نہیں۔ یہ زمانہ عجیب و غریب قسم کے اضداد کا زمانہ ہے۔ عورت قریب بھی ہے، دور بھی۔ کہیں مادر زاد برہنگی نظر آتی ہے، کہیں سر سے لیکر پیر تک ستر۔ کہیں عورت مرد کے بھیس میں دکھائی دیتی ہے، کہیں مرد عورت کے بھیس میں۔

دنیا ایک بہت بڑی کروٹ لے رہی ہے۔ ہندوستان بھی جہاں آزادی کا ننھا منا بچہ غلامی کے دامن سے اپنے آنسو پونچھ رہا ہے، مٹی کا نیا گھروندا بنانے کے لئے ضد کر رہا ہے۔ مشرقی تہذیب کی چولی کے بند کبھی کھولے جاتے ہیں، کبھی بند کئے جاتے ہیں۔ مغربی تہذیب کے چہرے کا غازہ کبھی ہٹایا جاتا ہے، کبھی لگایا جاتا ہے۔ ایک افراتفری سی مچی ہے۔ نئے کھٹ مٹھے پرانی کھاٹوں کی مونج ادھیڑ رہے ہیں، پرانے کھٹ مٹھے چلا رہے ہیں۔ ملی ہوئی چولوں سے کہیں کھٹمل نکل رہے ہیں، کہیں پسّو ۔۔۔ کوئی کہتا ہے انہیں زندہ رہنے دو، کوئی کہتا ہے نہیں فنا کر دو۔ اس دھاندلی میں، اس شورش میں ہم نئے لکھنے والے اپنے قلم سنبھالے کبھی اس مسئلے سے ٹکراتے ہیں، کبھی اُس مسئلے سے۔

اگر ہماری تحریروں میں عورت اور مرد کے تعلقات کا ذکر آپ کو زیادہ نظر آئے تو یہ ایک فطری بات ہے۔ ملک، ملک سے سیاسی طور پر جدا کئے جا سکتے ہیں۔ ایک مذہب دوسرے مذہب سے عقیدوں کی بنا پر علیحدہ کیا جا سکتا ہے، دو زمینوں کو ایک قانون ایک دوسرے سے بیگانہ کر سکتا ہے لیکن کوئی سیاست، کوئی عقیدہ، کوئی قانون، عورت اور مرد کو ایک دوسرے سے دور نہیں کر سکتا۔

عورت اور مرد میں جو فاصلہ ہے اُس کو عبور کرنے کی کوشش ہر زمانے میں ہوتی رہے گی۔ عورت اور مرد میں جو ایک لرزتی ہوئی دیوار حائل ہے اُسے سنبھالنے اور گرانے کی سعی ہر صدی، ہر قرن میں ہوتی رہے گی ۔۔۔ جو اسے عریانی سمجھتے ہیں۔ اُنہیں اپنے احساس کے زنگ پر افسوس ہونا چاہیئے۔ جو اسے اخلاق کی کسوٹی پہ پرکھتے ہیں، اُنہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اخلاق، زنگ ہے جو سماج کے اُسترے پر بے احتیاطی سے جم گیا ہے۔ جو سمجھتے ہیں کہ نئے ادب نے جنسی مسائل پیدا کئے ہیں، غلطی پر ہیں، کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ جنسی مسائل نے اس نئے ادب کو پیدا کیا ہے۔ اس نئے ادب کو جس میں آپ کبھی کبھی اپنا ہی عکس دیکھتے ہیں اور جھنجھلا اٹھتے ہیں ۔۔۔ حقیقت خواہ شکر ہی میں لپیٹ کر پیش کی جائے اس کی کڑواہٹ دور نہیں ہوگی۔ ہماری تحریریں آپکو کڑوی اور کسیلی لگتی ہیں مگر اب تک جو مٹھاسیں آپکو پیش کی جاتی رہی ہیں ان سے انسانیت کو کیا فائدہ ہوا ہے؟ نیم کے پتے کڑوے سہی مگر خون ضرور صاف کرتے ہیں۔

www.taemeernews.com

عندلیب شادانی

اصلی اور بناوٹی ہندی

ہمارے ایک دوست ہیں پنڈت ہرنام داس۔ ہیں تو بہت اچھے انسان۔ مگر آج کل کی نفاق انگیز ہواؤں کے اثر سے وہ بھی نہ بچ سکے۔ کبھی اردو کے شیدائی تھے۔ آج کل ہندی پر جان دیتے ہیں۔ ایک دن مجھ سے ملنے آئے۔ مڑی ہوئی ایک کتاب اُن کے ہاتھ میں تھی۔ میں نے پوچھا "یہ کیا ہے پنڈت جی؟" کہا "آپ کے کام کی چیز نہیں۔ ہندی کا ایک رسالہ ہے۔ میں نے کہا "دیکھوں تو۔" انہوں نے رسالہ میری طرف بڑھا دیا۔ رسالے کے سرورق کی عبارت کو میں نے ذرا بلند آواز سے پڑھا۔ پنڈت جی حیرت سے میرا منہ دیکھنے لگے۔ اور مسکرا کر بولے، "اچھا! آپ کو ہندی آتی ہے؟" میں نے کہا ہاں تیس برس ہوئے جب ہندی پڑھی تھی اور امتحان بھی پاس کیا تھا۔ مگر پھر کبھی اس کے مطالعے کا اتفاق نہیں ہوا۔ قدرتی طور پر بہت کچھ بھول گیا۔ جی چاہتا ہے۔ پھر ایک بار اُسے تازہ کر لوں ہندی کا کوئی ایسا رسالہ بتائیے جس کی زبان آسان ہو۔ انہوں نے کہا "تو پھر یہ "مایا" پڑھا کیجیے یہ کوئی اونچے درجے کا رسالہ نہیں۔ معمولی لکھے پڑھے لوگوں کے لئے ہے۔ مگر اس کے مطالعے سے آپ کی ہندی تازہ ہو جائے گی۔

میں نے رسالہ اُٹھا کر رکھ لیا۔ پنڈت جی چلے گئے۔ جب کبھی وقت ملتا میں اس رسالے (مایا۔ الہ آباد بابت مارچ سنہ۴۶ء) کے چند صفحے پڑھ لیا کرتا۔ جوں جوں پڑھتا گیا، میری حیرانی بڑھتی گئی اور رسالہ ختم کرنے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ایک پردہ میری آنکھوں کے سامنے سے ہٹ گیا۔

ایک دن پنڈت جی پھر آئے۔ مئی کا مہینہ تھا۔ رسمی احوال پرسی کے بعد میں نے کہا "پنڈت جی! "مایا" کے لئے میں نے ایک افسانہ لکھا ہے جو درحقیقت میری زندگی کا ایک یادگار واقعہ ہے۔ آپ ذرا اُسے سُن لیں اور جو الفاظ آپ کے نزدیک ایسے ہوں کہ ہندی میں اُن کی کھپت نہ ہو سکے اُنہیں ایک پرچے پر نوٹ کرتے جائیں تاکہ میں اُنہیں بدل دوں۔ پنڈت جی نے کہا "سنائیے۔"

www.taemeernews.com

میں نے کاغذ اور فاؤنٹین پن ان کے سامنے رکھ دیا اور افسانہ پڑھنا شروع کیا۔

شاہی انعام

وطن اور قوم کی بھلائی چاہنے والوں کی کوششوں سے ہندوستانیوں میں ہندو مسلم فساد کا تماشا یوں تو ہمیشہ اور ہر جگہ ہی ہوتا رہتا ہے لیکن خدا نہ کرے کہ مارچ ۱۹۴۶ء کی سترھویں تاریخ کو پیر کے دن ڈھاکا میں، ہندو مسلم فساد کی بدولت اِن آنکھوں نے جو کچھ دیکھا وہ زندگی میں کبھی کسی کو دیکھنا نصیب ہو۔

یوں تو پریشان کرنے والی بازاری خبریں کئی روز سے اڑ رہی تھیں لیکن ایسا بھی خیال نہ تھا۔ کہ جوالا مکھی پہاڑ اس طرح اچانک پھٹ پڑے گا۔ اور آگ، خون اور موت کا طوفان سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ ہنگامہ تو دوپہر سے پہلے ہی شروع ہوگیا تھا۔ لیکن دن کے چار بجتے بجتے یہ حالت ہوگئی جیسے برٹش راج ختم ہوگیا اور امن و امان کا نشان تک باقی نہیں رہا۔ زمین سے آسمان تک جدھر دیکھئے آگ ہی آگ دکھائی دیتی تھی۔ دھوئیں کے بادل سارے شہر پہ چھا گئے تھے گھر جل رہے تھے۔ دکانیں جل رہی تھیں۔ تالوں پر ہتوڑے بج رہے تھے۔ دروازے توڑے جا رہے تھے۔ بازار لٹ رہے تھے۔ پوری حیوانیت کے ساتھ ہر چیز برباد کی جا رہی تھی۔ معصوم انسان قتل ہو رہے تھے۔

کسی نے پیچھے سے چھری بھونک دی۔ کسی نے لوہے کے ڈنڈے سے سر پھاڑ دیا۔ کوئی خون میں نہایا ہوا آہ کرکے یہاں گرا۔ کوئی وہاں گرا۔ کسی کی آنتیں پیٹ سے نکل پڑیں۔ کہیں کوئی زخمی پڑا سسک رہا ہے۔ کہیں کوئی لاش پڑی ہے۔ کتنے بدنصیبوں کو کفن تک میسر نہ ہوا۔ ہر طرف بھگدڑ مچی ہوئی تھی تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اللہ اکبر اور بندے ماترم کے نعرے سنائی دیتے تھے۔ شام ہو رہی تھی۔ ہنگامہ بڑھتا ہی جاتا تھا۔ لوگ اپنے گھروں میں بیٹھے کانپ رہے تھے۔ کسی کی جان، مال، عزت کوئی چیز محفوظ نہ تھی۔ گورنمنٹ کی تمام ذمہ داریاں ختم ہوچکی تھیں۔ ہر شخص کو پوری پوری آزادی تھی کہ جو اس کا جی چاہے سو کرے۔ انسان جنگلی جانوروں سے بدتر ہوگئے تھے۔ دوست دشمن میں کوئی فرق باقی نہیں رہا تھا۔ اکّا دکّا مسلمان یا ہندو، بھولا بھٹکا، دشمنوں کے محلے میں پہنچا۔ اور موت کا شکار ہوا۔

اور پھر یہ مرنے والے تھے کون؟ اکثر بے خطا، بے قصور لوگ۔ پردیسی۔ مسافر، غریبا۔ کوئی گھاس بیچنے والا۔ کوئی گاڑی ہانکنے والا۔ کوئی بھیک مانگنے والا۔ کوئی پاگل۔ کوئی اپاہج۔ ایک بدقسمت غریب۔ دیہاتی سرکاری ہسپتال سے مفت کی دوا لینے آیا تھا۔ نسخہ اور دوا کی ٹوٹی

www.taemeernews.com

ہوئی شیشی اس کی لاش کے پاس پڑی ہوئی ملی۔ دین داروں نے مذہب کی خاطر حیوانیت کے وہ کارنامے پیش کئے کہ رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے۔ انہوں نے فقط بوڑھے مردوں ہی پر ہاتھ صاف نہیں کیا۔ بلکہ بوڑھی عورتوں اور کم سن معصوم بچوں کا خون بہانا اپنا دینی فرض سمجھا اور سب سے زیادہ قیمتی یعنی انسانی قربانی پیش کر کے اپنے دیوتاؤں کو خوش اور اپنے خدا کو راضی کیا۔

ہندو مسلم بلوائیوں کے گروہ دشمن کی تلاش میں ادھر ادھر گھوم رہے تھے مگر اب تک انہوں نے جم کر ایک دوسرے کا مقابلہ کہیں نہیں کیا تھا۔ غنڈوں اور بدمعاشوں کی بن آئی تھی۔ ان شیطانوں کے زیر اثر بہت سے آوارہ، نالائق اور بیکار لوگ لوٹ مار میں شامل ہو گئے تھے۔ اور مردوں کا تو ذکر ہی کیا، عورتیں تک لٹی ہوئی دکانوں سے چھوٹی موٹی چیزیں اٹھائے جا رہی تھیں۔ پھر لطف یہ کہ پولیس اور فوج کے سپاہی ہر خطرناک جگہ پر تعینات تھے اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ یہ کھڑے دیکھتے ہی رہے اور دکانوں میں سے مال غائب ہو گیا۔ دن دہاڑے ان کی آنکھوں کے سامنے خون ہو رہے تھے وہ نہایت بے پروائی بلکہ بے دردی کے ساتھ یہ تماشا دیکھتے تھے اور کسی سے کچھ نہ کہتے تھے۔ یہ ہنگامہ ان کے لئے ایک اچھا خاصا مذاق اور تفریح کا شغل تھا۔ جیسے وہ ہمیشہ سے اس کے عادی ہیں۔ اور ان کا فرض اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ لوٹ مار کر کے جب کوئی چوری کا مال لے کر ان کے سامنے سے گذرے تو اُسے روک لیں اور جو چیز انہیں اچھی لگے وہ بے تکلف اس سے رکھوا لیں۔ اس سے انہیں کچھ بحث نہ تھی کہ لانے والا کہاں سے لایا اور کس طرح لایا۔

میں اس وقت مٹکے بیگم بازار روڈ پر رہتا تھا۔ بیگم بازار مسلمانوں کا محلہ ہے۔ اس لئے میرا گھر ہر قسم کے خطرے سے بچا ہوا تھا۔ میرے مکان کی بغل ہی میں بنئے کی ایک دکان تھی۔ چودہ پندرہ آدمی اس دکان پر کام کرتے تھے۔ اسی سے سمجھ لیجئے کہ کاروبار کتنا بڑا تھا۔ گھر میں اس وقت ہم صرف دو آدمی تھے۔ ایک میں اور دوسرا میرا نوکر "سلارو"۔ مکان کی دوسری منزل میں ہم لوگ رہتے تھے۔ رات ہو گئی۔ اندھیرے میں آسمان تک پہنچنے والی آگ اور بھی زیادہ بھیانک معلوم ہوتی تھی۔ رات کے دس بج گئے۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کی چھتوں پر چڑھے پہرا دے رہے تھے۔ میں بھی برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ سلارو لالٹین ہاتھ میں لئے ہوئے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ادھر ادھر کی چھتوں پر نظر ڈال لیتا تھا۔ یکایک برابر کی چھت پر کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی میں نے کان کھڑے کئے۔ سلارو فوراً ادھر جھپٹا اور منڈیر پر سے جھک کر نیچے کی طرف دیکھا۔ کسی سے کچھ کھسر پھسر کی۔ پھر میرے پاس آیا اور کہا۔ "میاں! دکان والے لالا اور ان کے آدمی کہتے ہیں کہ ہماری جان خطرے میں ہے۔ اپنے صاحب سے کہو کہ رات ہمیں اپنے گھر میں چھپا لیں۔

www.taemeernews.com

عمر بھر احسان نہ بھولیں گے۔"

اس وقت یہ لوگ واقعی میری مدد کے مستحق تھے اور انسانی ہمدردی کا تقاضا بھی یہی تھا۔ کہ میں اُنہیں اپنے گھر میں پناہ دوں۔ لیکن یہ کام خطرے سے خالی نہ تھا میں نے کہا۔ "سلارو! اگر کسی نے ان لوگوں کو ہمارے گھر میں آتے دیکھ لیا تو غضب ہو جائے گا۔ یہ تو مارے جائیں گے لیکن ہم پر بھی آفت آئے گی۔ سارے محلے سے دشمنی ہو جائے گی۔ اور اس کا نتیجہ جو کچھ ہوگا۔ وہ تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو۔ اس کے علاوہ یہ لوگ ہمارے گھر میں آئیں گے کس طرح۔ دروازے کی طرف سے تو آ نہیں سکتے۔ سڑک پر نکلے اور مارے گئے۔ ہمارا مکان دو منزلہ، اُن کا ایک منزلہ۔ کوئی سیڑھی بھی نہیں جو چڑھ کر آ جائیں"۔ سلارو نے چپکے چپکے یہ باتیں اُن سے کہہ دیں۔ انہوں نے کہا۔ "ہماری چھت پر بہت سے خالی صندوق پڑے ہیں۔ انہیں کو نیچے اوپر رکھ کر اوپر چڑھ آئیں گے۔" میں اجازت دیتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ ان لوگوں کو میرے گھر میں دیوار پر سے اُترتے ہوئے کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔ سلارو نے کہا "میاں: خدا پر نظر رکھئے۔ ان لوگوں پر وقت پڑا ہے۔ ان کی ضرور مدد کیجئے۔ خدا آپ کی مدد کرے گا۔ آخر میں نے ہمت کی اور کہہ دیا کہ اچھا آنے دو۔

ان لوگوں نے نیچے اوپر صندوق رکھ کر ایک سیڑھی سی بنالی اور ایک ایک کر کے سات آدمی برآمدے کی چھت پر چڑھ کر آنگن میں اُتر آئے۔ آخری آدمی اترتے وقت گھبراہٹ میں گر پڑا۔ فوراً ایک محلے والے نے آواز دی "سلارو بھیا! یہ دھم سے کیا گرا؟" اس سوال سے میں تو سٹ پٹا گیا۔ لیکن سلارو کا دماغ حاضر تھا۔ اُس نے فوری جواب دیا۔ "بھیا! میں خود ہی گر پڑا۔ چھت پر چڑھ رہا تھا" بات ختم ہوئی۔ مجھے بھی اطمینان ہوا۔

یہ سب لوگ بھوکے تھے۔ میں نے کہا۔ میں جانتا ہوں آپ لوگوں کی غذا چاول ہے۔ مگر چاول اس وقت گھر میں موجود نہیں اور کہیں سے مہیا بھی نہیں ہو سکتا، البتہ دال آٹا، نمک مرچ، گھی تیل وغیرہ سب سامان موجود ہے۔ پکایئے اور کھایئے۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ میں نے دالان میں ردی کا فرش کرایا۔ اس پر وہ لوگ لیٹ گئے۔ سویا تو کوئی نہیں لیکن مُردوں کی طرح چپ چاپ پڑے تھے۔ رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی۔ سلارو نے کہا۔ "میاں! اب آپ بھی لیٹ جایئے میں جاگ رہا ہوں۔ نیند کے مارے میری بُری حالت تھی۔ بستر پر لیٹتے ہی سو گیا۔ شاید ایک گھنٹے سویا ہوں گا۔ اچانک آنکھ کھل گئی۔ دیکھا کہ وہ لوگ آپس میں کچھ کانا پھوسی کر رہے ہیں۔ اور سلارو دیوار کے پاس بیٹھا لالٹین ہاتھ میں لئے اونگھ رہا ہے۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ لوگ ہمارے خلاف کوئی سازش تو نہیں کر رہے ہیں۔ ہم دو ہیں اور یہ سات۔ اگر ان کی نیت بگڑ جائے تو ہم دونوں کو بڑی سہولت اور آسانی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیں۔ اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔

میری آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرے پلنگ کے قریب ہی کوئی شخص کھڑا ہے۔ میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ مگر میرا خیال غلط تھا۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ ہوا یہ کہ میرے کمرے میں قدِ آدم آئینہ رکھا ہوا تھا۔ ایک آدمی کسی ضرورت سے اُٹھا تھا۔ آئینے میں اس کا عکس پڑا۔ اُسی نے مجھے ڈرا دیا۔ توبہ! اس رات کو میں کتنا ڈرپوک ہو گیا تھا۔ اپنی بدگمانی پر مجھے خود ہی شرم آئی۔ میں نے اپنے جی میں کہا۔ کچھ بھی ہو۔ انسان آخر انسان ہے۔ اتنا ذلیل کبھی نہیں ہو سکتا کہ اپنی جان بچانے والے کے ساتھ دھوکا کرے۔ میں پھر لیٹ گیا۔ اور صبح کا انتظار کرنے لگا۔ باقی رات ...... آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی۔

ابھی اندھیرا ہی تھا اور پورے طور پر صبح نہ ہونے پائی تھی۔ کہ پھر وہی شور وغل، وہی ہنگامہ۔ شہر بھر میں ایک تہلکہ مچا ہوا تھا۔ رات ہی رات میں کئی خوبصورت اور شاندار عمارتیں راکھ کا ڈھیر بن چکی تھیں۔ شام کو محل، صبح کو کھنڈر۔ سچ مچ کتنے لاکھ کے گھر خاک ہو گئے۔ اسی وقت دیوار کے پیچھے پھر کچھ کھٹکا ہوا۔ سلادو نے جھانک کر دیکھا۔ سلالا کے باقی چھ آدمی ہاتھ جوڑ کر زمین پر ناک رگڑنے لگے۔ کہ خدا کے واسطے ہمیں بھی بچاؤ۔ اس وقت ان لوگوں کا چھت پر چڑھ کر ہمارے گھر میں آنا رات سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔ مگر خیریت یہ ہوئی کہ کچھ لوگ تو صبح کی نماز کے لئے مسجدوں میں گئے ہوئے تھے۔ اور کچھ اپنی دوسری ضرورتوں سے ابھی فارغ نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے ان آدمیوں کو دیوار پر چڑھتے اور ہمارے گھر میں اُترتے کسی نے نہیں دیکھا۔

اس وقت ان لوگوں کی حالت رحم کے قابل تھی۔ صورت دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کی آدھی جان نکل چکی ہے۔ چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ قدم ڈگمگاتے تھے۔ زبان لڑکھڑاتی تھی۔ صاف لفظ منہ سے نہیں نکلتے تھے۔ رنگت پیلی پڑ گئی تھی۔ ذرا سا کھٹکا ہوا اور کانپنے لگے۔ ہوش ٹھکانے نہ تھے۔ ایک آدمی نے بہت سے نوٹ دھوتی میں لپیٹ کر اپنی کمر سے باندھ رکھے تھے۔ گانٹھ شاید کچھ ڈھیلی تھی سو دیوار سے اُترنے میں کھل گئی اور نوٹوں کا مٹھا نکل پڑا۔ بس یہ معلوم ہوا جیسے کسی نے اس کی جان نکال لی۔ اُسے غش سا آ گیا۔ وہ خود بھی نوٹوں کے اس مٹھے پر گر پڑا۔ سلادو نے جھپٹ کر اُسے سہارا دیا۔ اور کھڑا کیا۔ پھر جھک کر نوٹوں کا مٹھا اُٹھانے لگا۔ نوٹوں کے مالک کے چہرے پر مردنی چھا گئی۔ اُف! کس قدر بھیانک ہو گئی تھی اُس کی صورت۔ شاید اُسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ لٹ گیا۔ میں نے وہیں سے پکارا۔ خبردار سلادو! تم ہاتھ نہ لگانا اس نے کہا میاں! میں تو اُٹھا کر دے رہا تھا۔ میں نے کہا تمہیں اٹھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لالا خود اٹھالیں گے۔ لالا نے نوٹوں کا بنڈل اٹھا لیا۔

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ان نوٹوں کے نکل پڑنے سے وہ سب لوگ بے حد پریشان ہو گئے۔ میرا

www.taemeernews.com

خیال ہے کہ اور بھی چند لوگوں کے پاس نوٹ تھے۔ ایک شخص کے ہاتھ میں ریشمی رومال کی ایک پٹلی اور چیک بک تھی۔ دوسرے کی قمیص کی جیب بہت پھولی ہوئی تھی۔ تیسرے نے کرتے کے دامن میں کچھ لپیٹ رکھا تھا۔ وہ گھبرا کر اوروں کے پیچھے جا چھپا۔ شاید انہیں یہ اندیشہ تھا کہ میں اور سلامو ان سب کا بھانڈا پھوڑ دیں گے کہ ان کی ساری دولت ان سے چھین لیں گے۔ اور لوٹنے کے بعد انہیں قتل بھی کر دیں گے۔ تاکہ لوٹ کا بھید کھلنے نہ پائے۔ ایک آدمی گردن جھکائے بیٹھا رو رہا تھا۔ میں نے کہا بھائی خدا کو یاد کرو۔ گھبراؤ نہیں۔ اس نے کہا جی حضور ہماری تو قسمت ہی خراب ہے۔ نوکری کرنے کانپور گئے تھے وہاں بھی رائٹ (RIOT) ہو گیا تھا۔

دن کی روشنی پھیلتی جا رہی تھی۔ میں نے کہا" اب آپ لوگ برابر والے کمرے میں چلے جائیے ممکن ہے برآمدے میں کوئی آپ کو دیکھ لے۔" وہ سب کمرے میں چلے گئے۔ لیکن کمرے میں داخل ہوتے وقت ڈر کے مارے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ میں نے کہا کمرے کا دروازہ اور کھڑکیاں سب بند کر لیجئے اور آرام و اطمینان سے بیٹھئے۔ اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ رات تو جوں توں کٹ گئی اور کسی کو کچھ پتا نہ چلا مگر دن کیونکر گذرے گا۔ اور کس طرح یہ لوگ صحیح سلامت یہاں سے کسی دوسری جگہ پہنچائے جا سکیں گے۔ میں نے بہت غور کیا۔ مگر اس مشکل کا کوئی حل سمجھ میں نہ آیا۔ یوں عجیب و غریب باتیں تو بہت سی دماغ میں آئیں لیکن معقول تدبیر کوئی نہ سوجھی۔ ان لوگوں نے کہا کہ کسی صورت سے آپ ہمیں اسٹیشن پہنچا دیجئے۔ ہم میمن سنگھ چلے جائیں گے۔ ان میں سے اکثر میمن سنگھ کے رہنے والے تھے۔ مگر اسٹیشن تک پہنچیں تو کیونکر۔

سلامو نے کہا" میاں! دو گھوڑا گاڑیاں لئے آتا ہوں۔ اُن کے پٹ چڑھا دیں گے۔ کوچبکس کے برابر میں بیٹھ جاؤں گا۔ لوگ سمجھیں گے کہ صاحب کے گھر کی سواریاں جا رہی ہیں"۔ میں نے کہا" ارے اُتو! لوگ کیا اتنے بیوقوف ہیں کہ اس طرح فریب کھا جائیں گے؟ انہیں یہ خیال نہ آئے گا۔ کہ صاحب تو اکیلے رہتے ہیں۔ رات ہی رات میں یہ اتنی پردہ نشین عورتیں گھر میں کہاں سے آگئیں؟ یہ سب تو بیکار باتیں ہیں۔ تو ایک کام کر۔ سائیکل لے اور وائس چانسلر صاحب کے یہاں چلا جا۔ میں خط میں بھی لکھے دیتا ہوں اور تو زبانی بھی کہہ دینا کہ تیرہ ہندو ہمارے گھر میں پوشیدہ ہیں۔ انہیں کسی طرح اسٹیشن پہنچائیے۔ اور اگر آپ کچھ نہ کر سکیں تو اپنی کار بھیج دیجئے تاکہ میں خود جا کر کمشنر اور کلکٹر سے ملوں۔ اور ان لوگوں کو کہیں بھیجنے کا انتظام کروں۔ اور ہاں اُن سے یہ بھی پوچھنا کہ آپ کی کیا رائے ہے۔ مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ جلدی میں کاغذ اور لفافہ بھی نہ ملا۔ اشتہار کا ایک پرچہ میز پر پڑا ہوا تھا۔ اٹھا کر اُسی کی پیٹھ پر خط لکھ دیا۔

سلامو نے بڑی ہمت اور حوصلے سے کام لیا۔ اس وقت اپنے محلے سے باہر جانے میں جان کا

www.taemeernews.com

خطرہ تھا۔ مگر اُس نے پرواہ نہ کی۔ دن کے آٹھ بجے تھے۔ سلارو کو اس طرف روانہ کرنے کے بعد میں لالا لوگوں کے پاس گیا۔ وہ بہت گھبرا رہے تھے۔ میں نے ان کی ڈھارس بندھائی اور پھر واپس میں آکر ٹہلنے لگا۔ تنہائی کی وجہ سے میرا جی بھی گھبرا رہا تھا۔ وائس چانسلر ڈاکٹر موجم دار کی کوٹھی کچھ ایسی دُور نہ تھی۔ سائیکل پر جانے آنے میں آدھے گھنٹے سے زیادہ خرچ نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر نو بج گئے اور سلارو کا کہیں پتا نہیں۔ ساڑھے نو بجے۔ دس بجے مگر سلارو نہ آج آتا ہے۔ نہ کل طرح طرح کے خیالات میرے دماغ میں آرہے تھے۔ میں حیران و پریشان بیٹھا تھا کہ دروازے پر کسی نے دستک دی۔ میں گیا۔ محلے کے چند بے فکرے سلارو سے ملنے آئے تھے کیا خوب ملاقات کا اچھا وقت نکالا۔ ساڑھے دس بج گئے۔ سلارو پر مجھے غصہ آرہا تھا کہ کم بخت کہاں جا کر بیٹھ رہا۔ پھر خود ہی جی میں کہتا، میں ناحق اس پر ناراض ہو رہا ہوں۔ خدا جانے کیا بات ہے اس کی جان کی خیر ہو۔ دل ہی دل میں اس کے لئے دعائیں مانگنے لگا۔

ٹھیک گیارہ بجے سلارو واپس آیا۔ وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ اور پسینے پسینے ہو رہا تھا اس نے کہا، جاتے وقت تو میں خیریت سے چلا گیا لیکن لوٹتے ہوئے راستے میں کئی بار ہندوؤں نے میرے اوپر حملہ کیا۔ حملہ کرنے والوں کی تعداد پندرہ بیس سے کم نہ تھی۔ میں بڑی تیزی سے بھاگا تب کہیں جان بچی۔ آخری بار تین ہندوؤں نے مجھے گھیرا۔ خدا کی شان! اسی دم نتو لال (ہمارا وصلی) اور اُس کے دونوں بیٹے وہاں آپہنچے۔ انہوں نے میری حمایت کی۔ پہلے تو ان لوگوں کو منع کیا۔ کہ میرے اوپر ہاتھ نہ چھوڑیں۔ مگر جب دیکھا کہ ان کا ارادہ کچھ اور ہے تو ہم سب نے قریب کی ٹال سے لکڑیاں اٹھالیں۔ اس پر وہ لوگ چلے گئے اور نتو لال اور اس کے بیٹے مجھے ہندو محلے کے ختم تک پہنچا گئے۔

ڈاکٹر مرجم وارد (وائس چانسلر) کو جس وقت میرا خط ملا وہ ناشتا کر رہے تھے۔ کچھ دیر تو اس میں لگی ناشتے سے فارغ ہو کر باغ کے بارے میں اپنے مالی کو کچھ سمجھانے لگے۔ اور اس کے بعد اسی قسم کے کسی دوسرے "ضروری" کام میں لگ گئے۔ ان کاموں سے جب فرصت ہوئی تو اطمینان سے کلکٹر کو ٹیلیفون کیا۔ آخر ایسی جلدی بھی کیا تھی۔ کلکٹر صاحب بہادر، اس خاص اور نازک موقع کے لحاظ سے وائس چانسلر صاحب سے بھی زیادہ مستعد ثابت ہوئے یعنی نو بجے انہیں اطلاع ملی اور پورے بارہ بجے انہوں نے ایک اعلیٰ افسر کو ہتھیار بند گارڈ کے ساتھ میرے یہاں بھیجدیا۔

کار جس وقت میرے مکان کے قریب آکر رُکی تو محلے کے بہت سے لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ اس موقع پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ محلے والے آج تک میرا بہت خیال کرتے تھے۔ افسر نے ایک سپاہی کو تو کار کی چوکسی کے لئے تعینات کیا اور باقی تین سپاہیوں کو لے کر میرے دروازے پر آئے۔ کنڈی کھٹکھٹائی۔ سلارو نیچے گیا اور آکر مجھے اطلاع دی کہ جنٹ صاحب ہیں۔ محلے والوں کی بھیڑ

بڑھتی جارہی تھی۔ وہ تعجب اور بدگمانی کی نگاہوں سے ان لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شاید میری بابت کسی نے مخبری کی ہے۔ مجھ پر کوئی تہمت لگائی ہے اور جنٹ صاحب مجھے گرفتار کرنے آئے ہیں۔ اسلامی ہمدردی کے جذبات ان کے سینے میں مچلنے لگے۔ اور انہوں نے قطعی طور پر طے کرلیا کہ اگر جنٹ صاحب مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہیں تو وہ اُن پر اور اُن کے ساتھیوں پر حملہ کردیں۔ میں نیچے آیا۔ لوگ اب سمٹ کر بالکل دروازے کے قریب آگئے۔ جنٹ صاحب نے مجھے دیکھتے ہی انگریزی میں کہا۔ "ہلو ڈاکٹر شامانی! یہ سب کیا ہنگامہ ہے۔ یہ اتنے ہندو تمہارے گھر میں کیسے آچھپے۔ اور یہ ہیں کون لوگ؟" میں سٹ پٹا گیا۔ میں نے کہا۔ خدا کے لئے چپ رہئے۔ اندر آکر باتیں کیجئے۔ وہ اور اُن کے دو ساتھی اندر آگئے۔ میں نے دروازہ بند کرلیا۔ بھیڑ بڑھتی جارہی تھی۔ یہ جنٹ مسٹر رائے، آئی، سی، ایس، تھے۔ میری ان کی ولائت کی ملاقات تھی۔ میں نے مسٹر رائے کو سارا قصہ سُنایا۔ انہوں نے کہا۔ "آپ نے تو کمال کردیا"۔ پھر کچھ ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں۔ آخر یہ طے پایا کہ ان لالا لوگوں کو موٹر میں بٹھا کر اسٹیشن پہنچا دیا جائے۔ ایک لالا جو دکان کے مالکوں میں سے تھے چلتے وقت میرے کمرے میں آئے۔ ہاتھ جوڑ کے سو روپے کا ایک نوٹ میرے سامنے رکھا اور کہنے لگے۔

عرض یہ ہے کہ حضور نے ہماری جان بچائی ہے۔ ہم آپ کے بہت احسان مند ہیں۔ ہم سب کی طرف سے یہ نذرانہ قبول فرمائیے"۔ میں نے کہا لالا! میں نے سو روپے کے لالچ سے آپ کی جان نہیں بچائی۔ نوٹ اپنے پاس رکھئے۔ آپ کے کام آئے گا"۔ کتنے کم حوصلہ اور پست خیال تھے یہ لوگ! سات روپے گیارہ آنے ایک پائی کو ایک جان کا معاوضہ یا قیمت سمجھتے تھے، خوب! اور بہت خوب! میرے مکان سے نکل کر یہ لوگ موٹر کی طرف اس طرح جھپٹے جیسے کوئی قیدی جیل سے رہا ہو کر اپنے گھر کی راہ لے موٹر میں چار آدمیوں سے زیادہ بیٹھنے کی جگہ نہ تھی۔ مگر مسٹر رائے نے زبردستی سات آدمیوں کو اس میں ٹھونس دیا۔ اس طرح دو پھیروں میں وہ لوگ اسٹیشن پہنچائے گئے۔

محلّہ والوں کو اب معلوم ہوگیا کہ بات کیا تھی۔ مسٹر رائے کے جانے کے بعد وہ لوگ اکٹھے ہوکر میرے پاس آئے۔ وہ بہت غصّے میں بھرے ہوئے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ لڑنے کے ارادے سے آئے ہیں۔ میں نے کہا اندر تشریف لے آئیے۔ مگر وہ دروازے ہی پر کھڑے رہے۔ ایک شخص بولا۔ کیوں جناب یہ آپ نے کیا کیا؟ ابھی میں کوئی جواب نہ دینے پایا تھا کہ دوسرا برابر سے بولا: بڑے رحمدل ہیں آپ۔ مسلمان تو کافروں کے ہاتھ سے کتے بلی کی طرح مارے جارہے ہیں اور آپ نے ان حرامزادوں کو اپنے گھر میں چھپایا۔ تیسرے نے آگے بڑھ کر کہا: کاش ہمیں پہلے سے خبر ہوتی۔ ہمیں تو اب معلوم ہوا ہے کہ یہی مردود "رائے" تھا۔ کل اسی کے حکم سے فائرنگ ہوا۔ اور خود اس نے چار بے گناہ مسلمانوں کو گولی کا نشانہ بنایا۔ اگر ذرا دیر پہلے بھی ہمیں پتہ چل جاتا تو قسم قرآن کی اس کافر بچے

www.taemeernews.com

کو یہیں ٹھنڈا کر دیتے ۔

میں نے کہا : اگر آپ ایسا کرتے تو غلطی کرتے ۔ طاقت کا استعمال ہر موقع پر صحیح نہیں ہوتا آپ لوگ نہتے تھے ۔ اُن کے پاس بندوقیں اور طمنچے تھے ۔ خدا جانے کتنوں کی جانیں جاتیں اور کتنے آباد گھر برباد ہو جاتے ۔ اس نے کہا ۔ خوب ۔ جیسے ہم تو مٹی یا گھاس پھونس کے بنے ہوئے ہیں ۔ مگر اب کچھ کہنا فضول ہے ۔ موقع ہاتھ سے نکل گیا ۔ ورنہ دکھا دیتے ۔ اس کو بھی دیکھ لیتے اور اُس کے حمایتی کو بھی دیکھ لیتے " ۔ ایک اور شخص سب کے پیچھے سے بولا : " ہائے ، وہ منڈا یوسف کیسا مارا گیا کمبخت پہ ابھی پوری جوانی بھی تو نہیں آئی تھی ۔ ماں نے کیسے ارمان سے شادی کی تھی ۔ دوسرے نے کہا : ہاں ، مگر عقد ہی ہوا تھا ۔ رخصت نہیں ہوئی تھی ۔ دلہن بے چاری تو بیاہ ہونے سے پہلے ہی بیوہ ہو گئی ۔ ان باتوں سے لوگوں کے جذبات اور بھی بھڑک اُٹھے ۔ میں چپ کھڑا سن رہا تھا ۔

ایک بزرگ میری طرف گھور کر فرمانے لگے ۔ یہ تو جو کچھ ہوا سو ہوا مگر آپ نے بڑا دین کا کام کیا ۔ بڑی اسلام کی خدمت فرمائی ۔ اللہ رسول آپ سے بہت خوش ہوں گے ۔ آپ نے تو دنیا ہی میں جنت خرید لی ۔ دوسرا بولا ۔ اچھا یہ تو فرمایئے آپ کو اس سے فائدہ کیا ہوا ؟ کوئی تخت ملے گا ؟ ۔ تاج ملیگا ؟ عہدہ ملیگا ؟ آخر کیا ملے گا ؟ تیسرے نے کہا : فائدہ کیوں نہیں ہوا ۔ اخباروں میں نام چھپے گا ۔ ملکوں ملکوں مشہور ہو جائیں گے " ۔ ایک بدتمیز لڑکے نے کچھ اور بھی جہالت کی باتیں کیں ۔ غصہ تو مجھے بہت آیا ۔ جی چاہا کہ ایک تمانچہ اس کے منہ پر ماروں مگر موجودہ حالات کا لحاظ کرتے ہوئے میں نے صبر و برداشت سے کام لیا ۔ ان کے کسی اعتراض کا جواب دینا محض بے سود تھا ۔ ایسی بے معنی باتوں کا جواب دینے سے چپ رہنا ہی بہتر تھا ۔ میں نے اُنہیں دھیما کرنے کے لئے کہا ۔ مجھے بہت افسوس بلکہ رنج ہے کہ میں نے ایسا کیوں کیا ۔ آپ سچ کہتے ہیں ۔ بیشک مجھ سے زبردست غلطی ہوئی ۔ میں نے اس وقت غور نہیں کیا تھا ۔ اور خدا گواہ ہے یہ تو مجھے ابھی معلوم ہوا کہ اس کم بخت رائفل نے کل چار مسلمانوں کو شہید کیا ۔ مجھے اپنی اس حرکت پر خود شرم آ رہی ہے ۔ خدا میرے گناہ کو معاف کرے ۔ اور آپ لوگ بھی معاف کر دیجئے ۔ سچ کہتا ہوں اگر مجھے یہ خبر ہوتی کہ مسلمان اس طرح مارے گئے ، مارے جا رہے ہیں تو میں ان کافروں میں سے کسی ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑتا ۔ اور اب آپ سے گزارش ہے کہ اگر کہیں سے کوئی ہندو ہاتھ آ جائے تو اُسے یہاں لے آیئے ۔ میری دلی تمنا ہے ۔ میں اُسے اپنے ہاتھ سے قتل کروں ۔ اور میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اب زندگی بھر کسی ...

ایک شخص نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا : اب آپ ہمیں بہلایئے مت ۔ ہم بچے نہیں ہیں ۔ مگر آپ نے اچھا نہیں کیا ۔" وہ لوگ بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے ۔ اور میں بھی دروازہ بند کر کے واپس آ گیا ... روز کے بعد ایک حد تک شہر میں امن و امان ہو گیا ۔ لوگ اپنے معمولی کاروبار میں لگ گئے ۔ جلد

www.taemeernews.com

ہی میں نے محسوس کیا کہ محلے والوں کے دلوں میں میری جو عزت تھی وہ اس بیان کے بعد سے کافور ہو چکی تھی۔ میں نے جس چیز کو انسانی فرض سمجھا تھا وہ میرے لئے بلا سے جان ہو گئی۔ اور مجھے اس کی بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ جب میں باہر نکلتا تو ایک دکان دار دوسرے کو آواز دے کر کہتا: سُنا ہے کافروں کو اپنے گھر میں چھپانے والوں کو جاگیر ملے گی۔ دوسرا جواب دیتا۔ ہاں، اور خان بہادری کا خطاب بھی۔ اور پانچ سو روپیہ ماہوار تنخواہ۔ تیسرا کہتا اسے تنخواہ نہیں پنشن (Pension) چوتھا کہتا: اور خدا کے یہاں جنت بھی۔ پھر سب مل کر قہقہہ لگاتے۔ میں چپ چاپ اس کوچے سے گذر جاتا۔

روزمرہ محلے والے کوئی نہ کوئی حرکت میرے خلاف ضرور کرتے تھے مگر میں نے گوارا نہ کیا۔ کہ بزدلوں کی طرح گھر چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ ان لوگوں نے جب دیکھا کہ یہ شخص بڑا ہی ڈھیٹ اور ضدی ہے تو میرے بائیکاٹ کی ٹھہرائی اور اس بارے میں دو چار مسئلے جاننے والے ایک ٹٹ پونجیے مولوی سے جس کے بزرگ کسی زمانے میں شہر کے قاضی رہ چکے تھے۔ فتوے بھی لکھوا لائے مسجد کے مُلّا نے اس پر مُہر کر دی۔ چلئے بائیکاٹ کا انتظام مکمل ہو گیا۔ اب ایک منٹ کے لئے بھی اس محلے میں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہ تھا اس لئے اس سے پہلے کہ وہ لوگ اس قسم کی کوئی کارروائی کریں میں وہاں سے اُٹھ گیا اور اچھا مکان نہ ملنے کی وجہ سے کئی سال تک بہت تکلیف اُٹھائی۔

فساد کی آگ جب ذرا دھیمی ہوئی تو گورنمنٹ کی طرف سے اعلان ہوا کہ سارے شہر پر تعزیری ٹیکس (PunitiveTax) لگایا جائے گا۔ یونیورسٹی کے پروفیسروں نے کمشنر کے یہاں عرضی دی کہ ہم لوگوں کو فساد سے کیا واسطہ۔ ہم نے تو فساد کو دبانے اور مٹانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس لئے ہم لوگوں سے یہ ٹیکس وصول نہ کیا جائے۔ جواب ملا کہ ہر شخص الگ الگ ٹیکس کی معافی کے لئے عرضی دے۔ اس پر ہمدردی کے ساتھ غور کیا جائے گا۔ سرکار کے اس وعدے سے یہ امید کچھ بیجا نہ تھی کہ کم سے کم یونیورسٹی والے اس جرمانے سے بچ جائیں گے۔ میں نے بھی عرضی دی اور اس میں یہ لکھا کہ: میں نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر تیرہ ہندوؤں کی جان بچائی۔ سارے محلے کو اپنا دشمن بنایا۔ اور اسی کی بدولت مجھے محلہ چھوڑ کر بھاگنا اور بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ گواہی اور ثبوت کی ضرورت ہو تو ڈاکٹر موتی چند دار، وائس چانسلر ڈھاکا یونیورسٹی اور مسٹر رائے جائنٹ کلکٹر موجود ہیں"۔ عرضی پر پوری ہمدردی کے ساتھ غور کرنے کے بعد سرکار نے جو فیصلہ کیا۔ اس کی اطلاع میرے پاس بھیج دی۔ لکھا تھا: "تمہیں آدھا ٹیکس معاف کیا گیا"۔

میں اس شاہی انعام کی اطلاع پا کر دنگ رہ گیا۔ بلکہ مزہ آ گیا۔ واقعی گورنمنٹ نے بڑی ہی بڑی عنایت کی کہ آدھا ٹیکس یعنی جرمانہ معاف کر دیا۔ ورنہ جو قصور میں نے کیا تھا اس کی سزا اس

www.taemeernews.com

سے زیادہ بھی ہو سکتی تھی۔ آخر میں نے تیرہ ہندوؤں کو ساری رات اور آدھے دن اپنے گھر میں بند رکھا تھا۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ میرے اوپر حبس بیجا کا الزام قائم کر کے مجھ پر مقدمہ چلایا جاتا اور مجھے قید یا بھاری جرمانے کی سزا دی جاتی۔ آخر گورنمنٹ کا قانون کس دن کے لئے اور کس مرض کا علاج ہے اگر بے قصور لوگوں سے جرمانے وصول نہ کئے جائیں تو گورنمنٹ کے خزانے کس طرح بھریں۔ میں نے اپنے دل میں سرکار کی قدردانی کا شکریہ اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ میں بہت سستا چھوٹا۔ ورنہ خدا جانے مجھ پر کیا مصیبت آتی اور میں کہاں کہاں کھنچا کھنچا پھرتا۔

جن لوگوں کو زندگی کا کوئی تجربہ نہیں انہیں اس معاملے سے سبق لینا چاہیئے۔ میں تو اپنی اولاد کو وصیت کر جاؤں گا۔ کہ انسانی ہمدردی کے جذبے سے مجبور ہو کر اگر کبھی ان کے دل میں کسی کی جان بچانے کی خواہش پیدا ہو تو انہیں کم سے کم جرمانے کی سزا بھگتنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ کیونکہ ہماری مہربان گورنمنٹ اپنے قانون کے مطابق سوشل سروس کا اتنا ہی معاوضہ دیتی ہے اور حق یہ ہے کہ اس سے بہتر انعام اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔

افسانہ ختم کرنے کے بعد میں نے پنڈت جی کا کاغذ دیکھا تو دونوں طرف سے سیاہ۔ شمار کیا تو دو کم چار سو الفاظ نکلے۔ میں نے کہا ”پنڈت جی اس طرح تو یہ افسانہ بالکل بیکار ہے۔“ انہوں نے کہا ہاں ”مایا“ کے لئے تو بیکار ہی ہے۔ نہ کوئی پڑھ سکے گا۔ نہ سمجھ سکے گا۔ آپ نے بھی تو غضب ہی کیا کہ چن چن کے عربی فارسی کے بھاری بھاری پتھر ہندی کی نازک پھلواری میں لڑھکا دیئے۔ لفظ تو لفظ فارسی اضافتیں اور ترکیبیں تک ٹھونس دیں۔ بھلا ”بلائے جان“ ”زیر اثر“ اور ”قدم آدم“ اور ”احسان مند“ وغیرہ کی ہندی میں کہاں گنجائش ہے۔ میں نے کہا آپ فرما چکیں تو میں کچھ عرض کروں۔ کہا ”میں کہہ چکا۔ اب آپ فرمایئے۔“ میں نے کہا۔ یہ تمام الفاظ اور ترکیبیں جن پر آپ کو اعتراض ہے میں نے ”مایا“ کے ان پرچوں سے لی ہیں جو اس دن آپ میرے پاس چھوڑ گئے تھے۔ میں نے عربی فارسی کے ان تمام الفاظ کی ایک فہرست بنا لی ہے جو ”مایا“ میں مجھے ملے۔ یہ کہہ کر مندرجہ ذیل فہرست پنڈت جی کے سامنے رکھ دی۔

عربی اور فارسی کے اُن لفظوں کی فہرست جو ہندی کے رسالے ”مایا“ الہ آباد بابت مارچ ۱۹۴۷ء سے انتخاب کئے گئے۔ اس فہرست میں جو الفاظ جلی قلم سے لکھے گئے ہیں وہ افسانے میں استعمال نہیں کئے گئے ورنہ ”شدھ“ یا نقلی ہندی والوں کے نزدیک افسانہ کی عبارت اور بھی ناقابلِ برداشت ہو جاتی۔

تعداد

ا۔ اعتراض۔ آفت۔ آخر۔ اخبار۔ آباد۔ ادب۔ انکار۔ انتظار۔ اطمینان۔ انتظام۔ آرام

www.taemeernews.com

اُ ت۔ استقبال۔ ارمان۔ افسر۔ ادا۔ اندیشہ۔ اشارہ۔ امانتہً۔ امانت۔ احسان مند
امان۔ آزادی۔ آہ۔ آزاد۔ الزام۔ اگر۔ اللہ۔ اسلام۔ اجابت۔ اعلیٰ۔ افسانہ گم تھا
آواز۔ البتہ۔ افسوس۔ آوارہ۔ ایمان دار۔ اکثر۔ امتحان۔ امیرانہ۔ ابتر۔ اشتہار
۱ | ۵۲ ارادہ۔ آسمان۔ اعلان۔ اطلاع۔ اجازت۔ امید۔ آئندہ۔ آسانی۔ اسلامی۔

ب۔ بعد۔ بدمعاش۔ بہادری۔ بحث۔ بے وقوف۔ برآمد۔ بازار۔ بالشت۔ بیرحم۔
بے حد۔ بغل۔ بتول۔ بے شک۔ بدتر۔ بیکار۔ بازی۔ بابت۔ بے خبر۔ بخدا۔
برباد۔ بیوہ۔ بے کس۔ بالائے طاق۔ بے سود۔ بدنصیب۔ بدہضمی۔ بجائے
بازاری۔ بغل گیر۔ بے ایمان۔ باقی۔ بہار۔ بلائے جان۔ باریکی۔ بسر کرنا۔ بدولت
بستر۔ بارے میں۔ بے دردی۔ بنیاد۔ بزرگ۔ بخار۔ بددعا۔ بے فکرا۔ بے پروائی۔
بے تکلف۔ بہانہ۔ بلندیاں۔ بازی (شطرنج کی)۔ بدگمانی۔ بے ہوشی۔ بندگاہ۔
۲۲ | ۵۹ بلوائی۔ بقیہ۔ بے کار۔ بدتمیز۔ بے معنی۔ بہتر۔ برداشت۔

پ۔ پریشان۔ پیروکار۔ پرنا۔ پوشیدہ۔ پاک۔ پردہ نشین۔ پیش۔ پیدا۔ پردہ۔ پشتون۔ پست۔
ت۔ تکلیف۔ تشریف۔ تاریخ۔ تازہ۔ تعجب۔ تجربہ۔ تیز۔ تمنا۔ تیزی۔ تنہائی۔ تاج۔ تفرقہ۔
تعداد۔ تہمت۔ تربتر۔ تعلیم۔ تلاش۔ تفریح۔ تماشا۔ تمام۔ تصویر۔ تمانچہ۔ تقاضے۔
تازگی۔ تدبیریں۔ تاکہ۔ تعینات۔ تھلکہ۔ تنخواہ۔ تعلق۔ تندرست۔

ث۔ ثابت۔ ثبوت۔

ج۔ جمع۔ جلدی۔ جواب۔ جعلی۔ جہالت۔ جوانی۔ جذبہ۔ جہیز۔ جدا کرنا۔ جناب۔ جادو۔
جیب۔ جنگ۔ جذبات۔ جواب طلبی۔

چ۔ چیز۔ چک۔ چراگاہ۔ چند۔ چراغ۔ چہرہ۔ چشمے۔

ح۔ حیران۔ حملہ۔ حالت۔ حد۔ حمایتی۔ حاضر۔ حال آنکہ۔ حرکت۔ حل۔ حائل۔ حکم۔
۱۵ | ۴۳ حرام زادی۔ حیثیت۔ حُسن۔ حرج۔ حوصلہ۔ حق۔ حیوانیت۔ حمایت۔

خ۔ خوب۔ خاک۔ خیال۔ خواہش۔ خوب صورت۔ خدمت۔ خوش نصیب۔ خیالات۔
خلاف۔ خداداد۔ خبط۔ خاطر۔ خوش۔ ختم۔ خط۔ خیریت۔ خطرہ۔ خون۔ خبر۔ خطا
خلوت۔ خود۔ خدا فاقراں۔ خرچ۔ خراب۔ خوبی۔ خطرناک۔ خاص۔ خاصہ۔ خریدا۔
خدا۔ خبردار! ۔ خیالی۔

د۔ داخل۔ دین۔ دنیا۔ دلچسپی۔ دوری۔ دولت خانہ۔ دسترخوان۔ دل۔ دماغ۔
دشمن۔ دل دادہ۔ دوست۔ دعائیں۔ معما۔ دیوار۔ دنگ۔ دولت۔ دستک۔ دیہاتی۔

www.taemeernews.com

دامن ۔ دل کش ۔ دخل کرنا ۔ دشمنی ۔

ذ ۔ ذلیل ۔ ذمہ دار ۔ ذکر ۔ ذمہ داری ۔ ذرا ۔

ر ۔ روداد ۔ رائے ۔ روز ۔ راضی ۔ رائی ۔ رخصت ۔ رات ۔ ریگستان ۔ رسال ۔ ریشمی ۔
روشنی ۔ رشتہ ۔ ریاست ۔ رنج ۔ روزمرہ ۔ رحم ۔

ز ۔ زیادہ ۔ زبردست ۔ زبان ۔ زنانہ ۔ زیر اثر ۔ زبردستی ۔ زمین ۔ زیادتی ۔ زکام ۔
زندگی ۔ زخمی ۔ ۵۵ | ۱۴

س ۔ سینہ ۔ سوار ۔ سال ۔ سما ۔ سنجیدہ ۔ سلام ۔ سرخ ۔ سپرد ۔ سند ۔ سرتاج ۔
سرکار پرستی ۔ سبق ۔ سامان ۔ سائے ۔ سبزپری ۔ سبز ۔ سفید پوش ۔ سوال ۔ سادگی ۔
سایہ دار ۔ سیاہی (دوات کی) ۔ سرگرمی ۔ سہولت ۔ سرِعام ۔ ساز و سامان ۔
سرمایہ دار ۔ سلسلہ ۔ سلح ۔

ش ۔ شامیانہ ۔ شاہ ۔ شہنشاہ ۔ شان ۔ شوکت ۔ شیشہ ۔ شورخ ۔ شاید ۔ شخص ۔
شیطانی ۔ شکل ۔ شام ۔ شروع ۔ شاندار ۔ شادی ۔ شکریہ ۔ شیر ہندوستان ۔
شہر ۔ شرم ۔ شکار ۔ شرط ۔ شغل ۔ شکایت ۔ شوق ۔ شکن ۔ شہری ۔ ۵۴ | ۲۰

ص ۔ صبح ۔ صاحب زادے ۔ صحیح ۔ صورت ۔ صرف ۔ صراحی ۔ صبر ۔ صاف ۔ صدر مقام ۔

ض ۔ ضدی ۔ ضرور ۔ ضرورت ۔ ضلع ۔

ط ۔ طرح ۔ طیار ۔ طرف ۔ طوائفین ۔ طشت ۔ طشتری ۔ طاق ۔ طاقت ۔ طے ۔ طور ۔
طوفان ۔

ظ ۔ ظلم ۔

ع ۔ عجیب ۔ عادی ۔ عزت ۔ عمارتیں ۔ عرض ۔ عذاب ۔ عجیب و غریب ۔ عقیدہ ۔
عادت ۔ عمر ۔ علاوہ ۔ علاج ۔ علت ۔ عرصہ ۔ عنایت ۔ عہدہ ۔

غ ۔ غلطی ۔ غصہ ۔ غریب خانہ ۔ غضب ۔ غذا ۔ غریب ۔ غور ۔ غائب ۔ غلط ۔ غش ۔ ۵۱ | ۱۰

ف ۔ فرمایا ۔ فقط ۔ فرق ۔ فوراً ۔ فضول ۔ فائدہ ۔ فوج ۔ فوری ۔ فیشن پرست ۔ فرش
فیصلہ ۔ فارغ ۔ فرنیچر ۔ فتویٰ ۔ فولاد ۔

ق ۔ قانون ۔ قریب ۔ قربانی ۔ قصبہ ۔ قیمتی ۔ قسمت ۔ قرضہ ۔ قرض ۔ قلم ۔ قبضہ ۔ قطار ۔
قید ۔ قوم ۔ قیدی ۔ قصور ۔ قدرت ۔ قاضی ۔ قدم ۔ قرآن مجید ۔ قسم ۔ قمیص ۔ قبول ۔ قیمہ ۔
قلعی ۔ قد آدم ۔ قہقہہ ۔ قدردانی ۔ قیمت ۔ قائم ۔ قصہ ۔ قتل ۔ ۴۶ | ۹

ک ۔ کافی ۔ کم سخن ۔ کاغذ ۔ کسر ۔ کافر ۔ کوشش ۔ کاش ۔ کارنامے ۔ کرچھ ۔ کافور ۔ کفن ۔

www.taemeernews.com

کم بخت۔ کمی۔ کمال۔ کاروبار۔ کتاب۔ کمزوری۔ کامیابی۔ کم سِن۔
گ۔ گذارش۔ گروہ۔ گرم۔ گناہ۔ گواہ۔ گذرنا۔ گوارا۔ گواہی۔ گردن۔ گمان۔ گنبد نما۔
ل۔ لیکن۔ لاجواب۔ لاش۔ لفافہ۔ لحاظ۔ لفظ۔ لائق۔ لاپروائی۔ لطف۔ ۳۹ | ۱۰

م۔ معلوم۔ مذاق۔ میز۔ معمولی۔ مجلس۔ مسافر۔ مستعد۔ مہربان۔ معاملہ۔ معاف۔ مکار۔
معقول۔ مشہور۔ موقع۔ محرم۔ مرثیہ۔ مدد۔ مردانہ۔ مورچہ۔ مذہب۔ ممکن۔ مدت۔
مہیا۔ مالک۔ مسئلے۔ مہر۔ معصوم۔ مجبور۔ مطابق۔ مطلب۔ مکمل۔ معنی۔ مزہ۔ مارہ۔
مشغلہ۔ مفت۔ ماہ۔ مست۔ محسوس۔ ملائم۔ محنت۔ منع۔ مدہوشی۔ مرضی۔
موجود۔ مضمون۔ ملاقات۔ میدان۔ مکان۔ مقابلہ۔ مہربانی۔ مصیبت۔ موجودہ
محتاج۔ مشقت۔ میسر۔ محل۔ معاوضہ۔ مردہ۔ ماہوار۔ مستی۔ مہلت۔ موت۔
مرہم۔ موجودگی۔ ۶۴ | ۲۰

ن۔ نوکر۔ ناحق۔ ناراض۔ نقلی۔ نایاب۔ نظریں۔ نسبت۔ نازنین۔ نظر مہر۔ نصیب
نورانی۔ نکاح۔ نکاح شدہ۔ نعرہ۔ نسخہ۔ نتیجہ۔ نثار کرنا۔ نالائق۔ نشان۔ نفاست
پسند۔ نگاہیں۔ نونہال۔ نازک۔ ناکامیاب۔ نیت۔ نامزد۔

و۔ وقت۔ واقعی۔ والدین۔ واپس۔ والدہ۔ وطن۔ وصیت۔ وارث۔ وعدے۔
ورنہ۔ وصول۔ وعدے۔ وغیرہ۔ واسطہ۔

ہ۔ ہرش۔ ہنگامہ۔ ہمیشہ۔ ہمت۔ ہمدردی۔

ی۔ یقین۔ یادگار۔ یعنی۔ ۴۸ | ۱۵

۵۸۶ | ۱۹۲

پنڈت جی نے بغور اس فہرست کا مطالعہ کیا۔ چند لفظوں کے سوا اُن کی فہرست کا کوئی لفظ ایسا نہ تھا۔ جو اس میں موجود نہ ہو۔ جب وہ شروع سے آخر تک اچھی طرح اسے دیکھ چکے تو میں نے کہا آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ اس فہرست میں پانچ سو چھیاسی الفاظ ہیں۔ جن میں سے فقط تین سو چورانوے میں نے افسانے میں استعمال کئے ہیں۔ باقی ایک سو بانوے چھوڑ دیئے۔ اگر ان سب کو بھی شامل کر لیتا تو غالباً افسانہ کی زبان آپ کے خیال کے مطابق ہندی والوں کے لئے عبرانی اور یونانی زبانوں کی طرح ناقابلِ فہم ہو جاتی۔ مگر در حقیقت ایسا نہیں ہے "مایا" کے جو الفاظ میں نے افسانے میں استعمال کئے ہیں۔ اُنہیں جلی قلم سے لکھا ہے۔ تاکہ پڑھنے والے کو اندازہ ہو جائے۔ کہ میں نے اپنی طرف سے عربی اور فارسی کے کتنے الفاظ برتے ہیں۔

www.taemeernews.com

پنڈت جی نے کہا: میں نے مانا کہ "مایا" کے اس پرچے میں یہ سب الفاظ موجود ہیں۔ اور بہت سے ہندو انہیں بولتے اور سمجھتے بھی ہیں مگر یہ اصلی ہندی نہیں۔ میں نے کہا اب مجھے عرض کر لینے دیجئے۔ پنڈت جی نے کہا۔ اچھا فرمائیے۔ میں نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا:

"مایا" الہ آباد سے نکلتا ہے۔ اشاعت کے لحاظ سے ہندی کا ایک کامیاب پرچہ ہے۔ صرف افسانے اس میں شائع ہوتے ہیں۔ غرض اس کی تجارت ہے۔ شدھ ہندی کا پروپیگنڈا اس کا مقصود نہیں۔ آپ ہی کے بقول معمولی لکھے پڑھے ہندی جاننے والے اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں لازمی طور پر اس کی زبان ایسی ہونی چاہئے کہ اس کے پڑھنے والے سمجھ سکیں اور انہیں پسند بھی ہو ورنہ تجارت میں نفع کے بجائے ٹوٹا ہوگا۔ "مایا" کا مارچ [illegible] نمبر جو آپ مجھے دے گئے تھے میں نے غور سے پڑھا۔ اس میں بارہ افسانے ہیں۔ لکھنے والے سب ہندو ہیں۔ نو مرد، تین عورتیں، لیکن اس کے باوجود عربی اور فارسی کے تقریباً چھ سو ایسے الفاظ اس میں استعمال کئے گئے ہیں۔ جن سے ہندی کا پروپیگنڈا کرنے والوں کو بیر ہے۔ یہ حال صرف ایک نمبر کا ہے۔ اگر "مایا" کے سال بھر کے بارہ پرچوں کا مطالعہ کیا جائے تو غالباً اس قسم کے کئی ہزار الفاظ ان میں سے نکل آئیں اور نہ بھی نکلیں تو یہ چھ سو ہی کیا کم ہیں۔

یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ الفاظ عام طور پر ہندی میں رائج ہیں (اور رائج ہونے کا اس سے بڑھ کر ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ ہندی کے ایک عام پسند پرچے میں ہندو پڑھنے والوں کے لئے، ہندو لکھنے والوں نے استعمال کئے ہیں)۔ تو پھر کیا سبب ہے کہ ہندی والے ان الفاظ کو اچھوتوں سے زیادہ ناپاک سمجھ کر ان سے بھاگتے ہیں اور دوسروں کو بھی ان سے دور رہنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ اصلی مروجہ ہندی تو یہی ہے جو "مایا" اور اس قسم کے دوسرے ہندی رسالوں میں لکھی جاتی ہے اور جس میں عربی فارسی کے مانوس اور مروجہ الفاظ نہایت آزادی کے ساتھ استعمال کئے جاتے ہیں۔ لیکن شدھ (اور درحقیقت بناوٹی) ہندی کا پروپیگنڈا کرنے والے جو ان الفاظ کو ہندی سے خارج کر دینے پر تلے ہوئے ہیں وہ ایک طرف تو مذہبی تعصب کا شکار ہیں اور دوسری طرف سیاسی اغراض ان کے پیش نظر ہیں ورنہ اس کے کوئی معنی نہیں کہ ادھر تو ہندی والے آل انڈیا ریڈیو کی زبان کے خلاف ہر طرح کا شور و شر مچائیں۔ ادھر ہندی کے عام پسند رسالے ایسی زبان لکھیں جس میں عربی فارسی کے ہزاروں مروجہ الفاظ بلا تکلف استعمال کئے جائیں۔ پنڈت جی! واقعہ یہ ہے کہ آپ کی قوم کے لوگ سیاست اور تجارت دونوں کو نہایت کامیابی کے ساتھ چلانا جانتے ہیں"— پنڈت جی لاجواب ہو گئے اور ہنس کر بات کو ٹالتے ہوئے بولے: ارے میاں چھوڑو ان جھگڑوں کو، کوئی کام کی بات کرو۔ اور پھر ہم کام کی باتیں کرنے لگے۔ یعنی کچھ پبلک کی بیزاری کا ذکر، کچھ گرمی اور گرانی کی شکایت، کچھ کنٹرول، راشن اور بلیک مارکیٹ کا۔ پھر شربت کا ایک گلاس پی کر پنڈت جی رخصت ہو گئے۔

www.taemeernews.com

فراق گورکھپوری

رُوپ

زلفِ پرخم عنانِ شب موڑتی ہے
آواز طلسمِ نیند کی توڑتی ہے
دنیا نئی ہو جاتی ہے جلووں سے ترے
ناگن جس طرح کینچلی چھوڑتی ہے

کیا کہیے جبینِ نور کی تابانی
ایک ایک جھلک رشکِ مہِ کنعانی
آنکھیں ہیں کہ پڑتے ہی جھپک جاتی ہیں
ہے صاعقہ یا ہنستی ہوئی پیشانی

جو روحِ نشاط ذرّہ ذرّہ میں بھرے
پرتو سے جس کے روئے فطرت نکھرے
تری وہ نظر ہے اے حیاتوں کی حیات
شائستہ زندگی جو عالم کو کرے

نورس کلی مسکراتے ہونٹھوں کی مہک
منڈلائی ہوئی گھٹائیں زلفوں کی لٹک
ہے جوبن۔ مدھ۔ کلس بھی چھلکا چھلکا
ماتھے کے چندر لوک کی نرم دمک!!

پلکوں کی اوٹ میں ہیں اسرارِ حیات
سانسوں کی نرم لے میں روحِ نغمات،
اے جانِ بہار حسنِ کافر کی ترے
مستی ہے کہ بال کھولے برسات کی رات!

www.taemeernews.com

احمد ندیم قاسمی

تفاوت

سنہ ۱۹۱۸ء

آسماں پر ہیں رقصاں ستارے وہی　　نقرئی چاندنی کے ہیں دھارے وہی
پربتوں پر ندی کے طرارے وہی　　ریگزاروں میں رخشاں شرارے وہی
ساری دنیا وہی، سب نظارے وہی

آدمیت بدستور مجبور ہے　　اور مشیت بدستور مغرور ہے
جینا مرنا ہی دیرینہ دستور ہے　　زندگی اُن سوالات سے چور ہے
تشنگی ہی ابھی جن کا مقدور ہے

رائی کی کوہ پر برتری بھی وہی　　بادہ سازوں کی تشنہ لبی بھی وہی
خانقاہوں کی یزداں گری بھی وہی　　خواجگی بھی وہی، بندگی بھی وہی
آدمی کو "غمِ آدمی" بھی وہی

زندگی کے پرانے تقاضے وہی　　سارے چہرے وہی سارے غازے وہی

www.taemeernews.com

سنہ ۱۹۴۶ء

آسماں پر نمایاں نئے رنگ ہیں   تارے گلرنگ ہیں (آدمی دنگ ہیں)
ان کی پروازیں کتنی ہم آہنگ ہیں   ایک آواز ہے ان گنت چنگ ہیں
ایک تقدیر ہے لاکھ ارژنگ ہیں

ایک ذرّہ، جہنم بدوش! الاماں   ایک بندہ خدائی فروش! الاماں
زندگی کا یہ جوش و خروش! الاماں   آسماں پر مشیت خموش! الاماں
اور قدرت پراگندہ ہوش! الاماں

برتری کا تصور ہوا ہو گیا،   آدمیت کا مقصد ادا ہو گیا
آدمی، آدمی آشنا ہو گیا   آدمی، آدمی پر فدا ہو گیا
آدمی کبریا آزما ہو گیا

نوعِ انساں نے اب روپ دھارے نئے   ساری دنیا نئی، سب نظارے نئے

www.taemeernews.com

منیب الرحمٰن

مراجعت

حسین خوابوں کے تانے بانے شکستہ ہو ہو کے گر رہے ہیں
حسین خوابوں کی جلوہ سامانیاں حقیقت کی تلخیوں میں بدل گئی ہیں
میں دیکھتا ہوں
میں دیکھتا ہوں تجلیاتِ سحر نے پھیلا دیا ہے اک جال سا فضا میں
میں سوچتا ہوں
میں سوچتا ہوں کہ دستِ ہستی اجل کی شیرازہ بندیوں کو بکھیرنے پر تلے ہوئے ہیں۔
میں سُن رہا ہوں
میں سُن رہا ہوں صدائے ماتم بلند ہوتے ہوئے ہر اک کوچہ و مکاں سے!
مری نگاہوں کو تابِ نظارگی نہیں ہے
مرا تخیل لٹا چکا ہے متاعِ احساس، دولتِ غم
مری سماعت پہ بار ہوتا ہے بزمِ ہستی کا شور و غوغا
مگر میں موت و حیات کی کشمکش میں اب تک پھنسا ہوا ہوں
میں جی رہا ہوں کہ میرے جینے میں کوئی سود و زیاں نہیں ہے

www.taemeernews.com

میں مر نہیں سکتا کیونکہ ڈر ہے مجھے ہزاروں قیامتوں کا!

مجھے نہ چھیڑو!
شریر کرنوں مجھے نہ چھیڑو!
میں رات بھر کا جگا ہوا ہوں، شریر کرنوں مجھے نہ چھیڑو!
کبھی وہ دن تھے کہ میں تمہاری جدائی میں بے قرار رہتا
مجھے اگر کوئی آرزو تھی تو یہ کہ تم میرے پاس آؤ
میں تم سے باتیں کروں، تمہاری برہنہ رعنائیوں سے کھیلوں۔
اور ایک وارفتگی کے عالم میں پھر تمہیں ہمکنار کر لوں
مگر وہ دن داستانِ ماضی کے حرفِ آغاز بن چکے ہیں!
مجھے اب ایسی طویل راتوں کی جستجو ہے
جو میری بیتابیوں کو وقفِ سکوت کر دیں!

بہار آتی ہے صحنِ گلزار میں خزاں کی نقیب بن کر
یہ پھول کھلتے ہیں تاکہ مرجھا کے شاخِ نازک سے ٹوٹ جائیں۔
مرا تبسم بھی اشک ریزی کا ہے بہانہ
ملی ہوئی ہے مری مسرت میں نیشِ ہستی کی تلخ کامی!!
وہ پوچھتے ہیں تمہارے نغموں میں اس قدر حزن و یاس کیوں ہے؟

www.taemeernews.com

بتاؤ کیا تم ہمیشہ آہ و فغاں کے یوں خوشہ چیں رہو گے ؟
ذرا نگاہیں اٹھا کے دیکھو
سحر کے انوار نقشِ فردا کا اک ہیولیٰ بنا رہے ہیں
چمن میں مرغانِ خوشنوا چہچہا رہے ہیں
وہ اپنے کندھوں پہ ہل اٹھائے کسان کھیتوں کو جا رہے ہیں
وہ انقلابی جواں بغاوت کے تند نغموں سے ایک طوفاں اٹھا رہے ہیں
وہ مرد و زن فصلِ گل کی آمد سے شاد ہو ہو کے گا رہے ہیں ——
تمہاری ہستی کو اس کا احساس کیوں نہیں ہے ؟"

میں کیا بتاؤں !
میں اُن سے کیسے کہوں کہ یہ بازگشت ہے میرے دورِ ماضی کے ہاؤ ہو کی
یہی ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے، یونہی ہوتا رہیگا پیہم !
یہ نوجواں گاتے گاتے تھک جائیں گے تو اُن کے شرر فشاں، برق پاش نغمے
انہیں حقیقت سے دور خوابوں کی ظلمتوں میں دھکیل دیں گے
اسی کو سمجھیں گے وہ کمالِ وجود و معراجِ آدمیت
اسی پہ رکھیں گے چار و ناچار پھوہ بنیادِ قصرِ ہستی !!

یہ سونے چاندی کے چند سکّے

www.taemeernews.com

یہ گندم و جو کے چند دانے
مرے لئے مشتِ خاک سے بیشتر نہیں ہیں!!
مگر کسی کی نگاہِ الفت
وہ اشک جن کو کسی نے میرے غموں کا ہمراز کر دیا تھا
وہ اک تبسم، لطیف و شیریں
مرے خیالوں میں تا ابد جاگزیں رہیں گے،
میں جب بھی چاہوں انہیں اٹھالاؤں منظرِ عام پر تصور کی خلوتوں سے
میں جیسا چاہوں اُنہیں بنا دوں ——!

نرسوں کی محافظ

جوانی اپنی گذاری ہے کس طرح تو نے
کہ اب ہر اٹھتی جوانی سے بدگمان ہے تو
یہ فرد جرم کسی اور کی زباں پہ نہیں
خود اپنے عہدِ گذشتہ کی ترجمان ہے تو
وہ چہرے جن میں فروزاں ہے عصمتِ مریم
تو ان پہ اپنے گناہوں کے عکس ڈالتی ہے
ترا ضمیر ہے تیرہ، مہ و نجوم نہیں،
مہ و نجوم پہ تو تیرگی اچھالتی ہے

مٹا دیا ترے چہرے کی جھریوں نے جسے
تو اس نکھار کی اب تاب لا نہیں سکتی
ہنسی کو جرم سمجھنے کا یہ سبب تو نہیں
کہ اب ہنسی ترے ہونٹوں پہ آ نہیں سکتی
بٹھا دیئے تو ہیں پہرے قدم قدم پہ مگر
جھجک کے چلنے میں لغزش ضرور ہوتی ہے
گناہ ہوتے ہیں داخل وہیں سے فطرت میں
جوانی اپنا جہاں اعتبار کھوتی ہے۔

یہ تتلیاں جنہیں مٹھی میں بھینچ رکھا ہے
جو اُڑنے پائیں تو الجھیں کبھی نہ خاروں سے
تری طرح کہیں یہ بھی بجھ کے رہ جائیں
تپش بچوڑ نہ ان ناچتے شراروں سے

کیفی اعظمی

 www.taemeernews.com

مجید امجد

امروز

ابد کے سمندر کی اک موج جس پر مری زندگی کا کنول تیرتا ہے!
کسی ان سُنی، دائمی راگنی کی کوئی تان ــــ آزردہ، آوارہ، برباد
جو دم بھر کو آ کر مری الجھی الجھی سی سانسوں کے سنگیت میں ڈھل گئی ہے!
زمانے کی پھیلی ہوئی بے کراں وسعتوں میں یہ دو چار لمحوں کی میعاد!
طلوع و غروب مہ و مہر کے جاودانی تسلسل کی دو چار کڑیاں!
یہ کچھ تھرتھراتے اجالوں کا روماں، یہ کچھ سنسناتے اندھیروں کا قصہ!
یہ جو کچھ کہ میرے زمانے میں ہے اور یہ جو کچھ کہ اس کے زمانے میں میں ہوں!
یہی میرا حصہ ــــ ازل اور ابد کے خزانوں سے ہے بس یہی میرا حصہ!

مجھے کیا خبر، وقت کے دیوتا کی حسیں رتھ کے پہیوں تلے پس چکے ہیں،
مقدر کے کتنے کھلونے، زمانوں کے ہنگامے، صدیوں کے صدہا ہیولے!
مجھے کیا تعلق: مری آخری سانس کے بعد بھی دوش گیتی پہ مچلے،
مہ و سال کے لازوال آبشارِ رواں کا وہ آنچل جو تاروں کو چھو لے!

www.taemeernews.com

مگر آہ یہ لمحۂ مختصر جو مری زندگی، میرا زادِ سفر ہے!
مرے ساتھ ہے! میرے بس میں ہے! میری ہتیلی پہ ہے یہ لبالب پیالہ!
یہی کچھ ہے لے دے کے میرے لئے اس خراباتِ شام وسحر میں! یہی کچھ،
یہ اک فرصتِ کاوشِ دردِ ہستی! یہ اک مہلتِ کوششِ آہ و نالہ!

یہ صہبائے امروز، جو صبح کی شاہزادی کی مست انکھڑیوں سے ٹپک کر
بہ دورِ حیات آگئی ہے! یہ ننھی سی چڑیاں جو چھت میں چہکنے لگی ہیں!
ہوا کا یہ جھونکا جو میرے دریچے میں تلسی کی ٹہنی کو لرزا گیا ہے!
پڑوسن کے آنگن میں پانی کے نلکے پہ یہ چوڑیاں جو چھنکنے لگی ہیں، !!
یہ دنیائے امروز میری ہے، میرے دلِ زار کی دھڑکنوں کی امیں ہے!
یہ اشکوں سے شاداب دو چار صبحیں، یہ آہوں سے معمور دو چار شامیں،
انہی چلمنوں سے مجھے دیکھنا ہے وہ جو کچھ کہ نظروں کی زد میں نہیں ہے!

فکر تونسوی

جنئیس

(GENIUS)

میں صدیوں سے تنہا چلا آرہا ہوں
میں صدیوں سے غولِ بیاباں کے زنداں میں گھبرا رہا ہوں،
میں خاموش ہوں، جیسے معبد کے گوشے میں کوئی بُتِ ایستادہ
مرے ذہن پہ میری اپنی ہی عظمت کی مہریں لگی ہیں

— یہ کونین پر کیوں مسلّط ہے اک ہُو کا عالم؟
یہ سیمیں ستارے ہیں یا چاند نے اپنی تنہائیوں پہ بہائے ہیں آنسو؟
ہوا کی پری سانس روکے، پروں کو سمیٹے ہوئے تھم گئی ہے۔
مگر دو لاکھوں صدائیں بگولا صفت گھومتی ہیں۔
ابھارے چلی جا رہی ہیں مرے گرد زنداں کی سنگیں فصیلیں
بڑھائے چلی جا رہی ہیں مرے دل کی سنسانیوں کو
میں تنہا ہوا جا رہا ہوں۔

www.taemeernews.com

مرا غم — تمہارے تحیّر کے بس کا نہیں ہے۔
نکلنے دو مجکو — ابگولوں کے زنداں میں دم گھٹ رہا ہے
یہ اک چپکا چپکا تبسم جو میرے لبوں پہ اُبھرتا رہا ہے — تبسم نہیں ہے
کہ یوں بھی مری چشمِ عظمت نے آنسو بہائے
یہ آنسو — یہ طنزِ مسلسل کہاں تک مرا ساتھ دیں گے؟
کہاں تک میں یوں اپنے اوپر ستم ڈھاسکوں گا؟
کہاں تک تمہارے لئے خود کو بہلا سکوں گا؟
کہ میری صدا، جو بُتِ خامشی بن گئی ہے،
اسے چاند، تاروں، بہاروں سے نسبت رہی ہے۔
نکلنے دو مجکو — ستاروں بہاروں سے ملنے دو مجکو۔
تمہارے تحیّر کو میں چھوڑ جاؤں گا زنداں کے در پہ
میں گھبرا رہا ہوں — میں تنہا ہوا جا رہا ہوں۔
میں تنہا نہیں رہ سکوں گا — !

www.taemeernews.com

ظہیر کاشمیری

عورت

گلہ بانوں کی خداوندی میں — خط و رخسار پہ تعزیریں تھیں
کُند تھا جذبۂ تحسینِ جمال — حُسن کے پاؤں میں زنجیریں تھیں

ہر زمیندار، شہنشاہ کے پاس — کئی ناسفتہ گہر ہوتے تھے
محفلِ شب میں اُجالا بن کر — وقفِ اندوہ سحر ہوتے تھے

آگ اور بھاپ کے دوراہے پر — زیست لوہے کی طرح ڈھلنے لگی
جب ہوسکار نے سکّے دکھلائے — ایک انجن کی طرح چلنے لگی

کسی ان دیکھے ہوئے بازو پر
ریشمی جسم ڈھلک جاتا ہے
بادۂ شرم سے لبریز شباب
ایک ٹھوکر میں چھلک جاتا ہے

www.taemeernews.com

اختر الایمان

سرِ رہگذارے

شبِ ماہ تو ہے سحر بھی تو
کہ فغاں بھی تو ہے اثر بھی تو
یہ تری بہار کے دن سہی
یہ ترے نکھار کے دن سہی
نہ مٹا کسی کو سنبھل سنبھل
سرِ راہ یوں نہ بہک کے چل
کہ زمیں پہ رہتے ہیں اور بھی
جنہیں حسن سے بھی لگاؤ ہے
جنہیں زندگی بھی عزیز ہے!

www.taemeernews.com

شاد عارفی

فلمی محبّت

خود گرا دی جائے گی کوئی کتاب! آپ اُٹھا دیں گے۔ تو شکریہ جناب!
مل گیا رستہ محبت ٹھن گئی!

آپ؟ واللہ۔ کیا ہوا؟ کیوں گر پڑے؟ بچ گئے لاری سے! کھمبے سے لڑے
اے! ادھر تانگہ! محبت ٹھن گئی!

کس لئے لیٹے ہوئے ہو خاک پر؟ مکھیاں لپٹی ہوئی ہیں ناک پر!
کس کے اک بلّا۔ محبت ٹھن گئی

مال پر زن سے گئی موٹر نکل نصف ماتھے تک "کٹی چوٹی کے بل"
بس نہیں چلتا۔ محبت ٹھن گئی!

سائیکل ٹکرا کے۔ "ساری" دھول پر گنتگو نرمی سے بڑھ کر۔ فول پر
پھر جو رُخ بدلا۔ محبت ٹھن گئی!

سیب سے رخسار پر مچھر۔ ارے! تِل! مگر سرمے کا ہے رہیے پرے
کھُل گیا دھوکا۔ محبت ٹھن گئی!

www.taemeernews.com

بہ رہا ہے مے فشاں ہونٹوں سے خوں پان! لبِ اشک! تو چھو کر دیکھ لوں
گال پہ چانٹا۔ محبت ٹھن گئی!

ریل کی پٹری پہ یا دریا کے پاس پھر رہی یا پھر رہے ہیں کیوں اُداس
خودکشی۔ توبہ! محبت ٹھن گئی

بھوک سے تیری بہن ہے نیم جاں! جو بھی مل جائے ابھی لاتا ہوں ماں!
کار سے دبنا۔ محبت ٹھن گئی!

—

جمیل الدین عالی

دوہے

کدھر ہیں وہ متوالے نینا کدھر ہیں وہ رنتار
نس نس کھنچے ہے تن کی جیسے مدرا کرے اُنار

ایک تو یہ گھنگھور بدریا پھر برہا کی مار
بوند پڑے ہے بدن پہ ایسے جیسے لگے کٹار

ساجن ہم سے ملے بھی لیکن ایسے ملے کہ ہائے
جیسے سوکھے کھیت سے بادل بن برسے اڑ جائے

بیتے دنوں کی یاد ہے کیسی ناگن کی پھنکار
پہلا وار ہے زہر بھرا اور دوجا امرت دھار

www.taemeernews.com

ساحر لدھیانوی

جاگیر

پھر اسی وادیٔ شاداب میں لوٹ آیا ہوں
جس میں پنہاں مرے خوابوں کی طرب گاہیں ہیں
میرے احباب کے سامانِ تعیش کے لئے
شوخ سینے ہیں جواں جسم حسیں بانہیں ہیں

سبز کھیتوں میں یہ دبکی ہوئی دوشیزائیں
ان کی شریانوں میں کس کس کا لہو جاری ہے
کس میں جرأت ہے کہ اس راز کی تشہیر کرے
سب کے لب پر مری ہیبت کا فسوں طاری ہے

ہائے وہ گرم و دلآویز ابلتے سینے
جن سے ہم سطوتِ آبا کا صلہ لیتے ہیں
جانے اُن مرمریں جسموں کو یہ مریل دہقاں
کیسے ان تیرہ گھروندوں میں جنم دیتے ہیں

یہ لہکتے ہوئے پودے، یہ دمکتے ہوئے کھیت
پہلے اجداد کی جاگیر تھے، اب میرے ہیں
یہ چراگاہ، یہ ریوڑ، یہ مویشی، یہ کسان
سب کے سب میرے ہیں، سب میرے ہیں، سب میرے ہیں

www.taemeernews.com

ان کی محنت بھی مری، حاصلِ محنت بھی مرا
ان کے بازو بھی مرے، قوتِ بازو بھی مری

میں خداوند ہوں اس وسعتِ بے پایاں کا
موجِ عارض بھی مری، نکہتِ گیسو بھی مری

میں اُن اجداد کا بیٹا ہوں جنہوں نے پیہم
اجنبی قوم کے سائے کی حمایت کی ہے

غدر کی ساعتِ ناپاک سے لیکر اب تک
ہر کڑے وقت میں سرکار کی خدمت کی ہے

خاک پر رینگنے والے یہ فسردہ ڈھانچے
ان کی نظریں کبھی تلوار بنی ہیں نہ بنیں

ان کی غیرت پہ ہر اک ہاتھ جھپٹ سکتا ہے
اِن کے ابرو کی کمانیں نہ تنی ہیں نہ تنیں

ہائے یہ شام، یہ جھرنے، یہ شفق کی لالی
میں ان آسودہ فضاؤں میں فراموش نہ ہوں؟

وہ دبے پاؤں اُدھر کون چلی جاتی ہے!
بڑھ کے اس شوخ کے تشنے ہوئے لب چوم نہ لوں؟

www.taemeernews.com

مخمور جالندھری

تسلسل

کتنا خوش بخت ہے انسان — یہ اندھا انسان
کہ ستاروں کے جہاں میں ہے سکونت اس کی
پھول کو چھوڑ کے کانٹے سے اُلجھ جاتا ہے
اسے ناشاد ہی رکھے گی عفونت اس کی
جانتا ہے کہ بیاباں سے ہے گلزار حسیں
مگر انسان — بہاروں کے جہاں کا باسی
دیوِ تخریب ہے صورت گرِ تعمیر نہیں

کھیل کر جان پہ اپنی کئی انسانوں نے
نسلِ آدم کا بھبکتا ہوا باطن دھویا —
اس کے سینے میں محبت کا کنول بھی بویا
لیکن، جلتی ہوئی دلدل تھی سرشتِ آدم
جس میں اک بھی نہ مہکتی ہوئی کونپل پھوٹی
موجزن جس میں رہا سیلِ تعفن پیہم
"جتنا اپنے سے ہے اُتنا ہی پڑوسی سے ہو عشق
خوو جیو — جینے دو اوروں کو بھی آسانی سے"
اپنے زخموں پہ نہ مرہم بھی کسی نے رکھا،
اور انسان نہ باز آیا ستم رانی سے،
اس کا دل سچ ہے صبا کی گزرگاہ نہیں

www.taemeernews.com

آج بھی ٹھوکریں کھایا ہوا انساں کا دل
ظلم و بیداد کے اشغال کا گرویدہ ہے
"جنگ، شمشیر و سناں، تیغ ہے تقدیر امم"
یہ اور ایسے ہی کچھ اقوال کا گرویدہ ہے
وہی املاک کا خبط اور وہی منصب کا جنوں
یہ تسلسل ابھی ٹوٹا نہیں انسانوں سے
جب کبھی اس کے تفوق کا سنگھاسن ڈولا
اُس نے خوں چوس لیا غیظ میں شریانوں سے
ہونے دیتا ہے کوئی ادنےٰ کو اعلیٰ؟ لیکن
حد سے بڑھتی ہے فلاکت تو غضب ڈھاتی ہے
باندھ کر سر سے کفن گھر سے نکل آتی ہے —
فرش پر زور سے بچوں کو پٹک دیتی ہے
ریشمی زلفوں کو نفرت سے جھٹک دیتی ہے
غیظ میں ہار پہن لیتی ہے پستانوں کا —
آگ لگتی ہے نشاں مٹتا ہے ایوانوں کا
نئے گھر بنتے ہیں بنیاد وہی رہتی ہے
لے بدل جاتی ہے فریاد وہی رہتی ہے
شاہ بنتا ہے گدا، بنتا ہے نادار ملک
بے کسی حد سے پھر اک بار گذر جاتی ہے
پھر وہی پہلی سی بیداد نظر آتی ہے
یہ تسلسل ابھی ٹوٹا نہیں انسانوں سے

آدمی چاند ستاروں کے جہاں کا باسی
کیا بہاروں میں بھی ناشاد رہے گا یونہی
ایک مجموعۂ اضداد رہے گا یونہی —؟
کبھی طبقات کی لعنت سے رہا بھی ہوگا —؟

www.taemeernews.com

علی سردار جعفری

خیالات

میری دنیا میں محبت نہیں کہتے ہیں اسے
یوں تو ہر سنگ کے سینے میں شرر ملتا ہے
سیکڑوں اشک جب آنکھوں سے برس جاتے ہیں
تب کہیں ایک محبت کا گہر ملتا ہے

شمع کی طرح پگھلتے ہوئے دل دیکھے ہیں
اشک بن بن کے نکلتے ہوئے دل دیکھے ہیں
تو نے دیکھی ہی نہیں گرمیٔ رخسارِ حیات
میں نے اس آگ میں جلتے ہوئے دل دیکھے ہیں

ماں کے آغوش میں ہنستا ہوا اک طفلِ جمیل
جس طرح ذہنِ ازل میں ہو ابد کی تخئیل
دیکھ لیں وہ جو سمجھتے ہیں کہ فانی ہے حیات
زندگانی کے طربناک تسلسل کی دلیل

آدمی لاکھ ہو مایوس، مگر مثلِ نسیم
رقص کرتا ہے تمناؤں کے گلزاروں میں
راستے وادی و صحرا میں بنا لیتے ہیں
چشمے رُک کر نہیں رہ جاتے ہیں کہساروں میں

www.taemeernews.com

قتیل شفائی

تجدید

وہی جھنکار ــــ وہی ناچتی گاتی تلوار،
وہی للکار ــــ وہی پھیلتا بڑھتا سا غبار

وہی سیلاب ــــ وہی سینۂ دریا کی امنگ
وہی گرداب ــــ وہی فطرتِ امواج کی جنگ
وہی طوفان، ــــ وہی عزمِ بغاوت کی دلیل
وہی ہیجان، ــــ وہی خوف کا احساسِ ملیل
وہی تدبیر ــــ وہی زر کا چمکتا ہوا جام
وہی تعبیر ــــ وہی خواب کا پھیلا ہوا دام

وہی پیغام ــــ وہی صلح کا مبہم اقرار
وہی انجام ــــ وہی ریت کی گرتی دیوار

www.taemeernews.com

وہی تمہید ـــــ وہی کہنہ رسومات کی رٹ
وہی تجدید ـــــ وہی پھر سے مراعات کی رٹ

وہی دمسانہ ـــــ وہی روح پہ چلتے نشتر
وہی اعزاز ـــــ وہی کھوٹ کے پیلے زیور
وہی قانون ـــــ وہی موم کی مڑتی ہوئی ناک
(وہی معجون ـــــ وہی شہد میں لپٹی ہوئی خاک
وہی سوغات ـــــ وہی نکتۂ ناقابلِ غور
وہی دن رات ـــــ وہی وقت کے بدلے ہوئے طور
پھر وہی ذکر ـــــ کہ یہ چوٹ بھی کھائیں کیوں کر
پھر وہی فکر ـــــ کہ تلوار اٹھائیں کیونکر

دو شعر

چاہوں کسے کہ تجھ سا جہاں میں کوئی نہیں
دیکھوں کسے کہ دور تلک روشنی نہیں

او محوِ ناز! پرسشِ خاطر کو جلد آ!
بیمارِ غم میں جاں ابھی ہے ابھی نہیں

ناصر کاظمی

www.taemeernews.com

مقبول حسین احمد پوری

چکور اور چاند

چاند کو دیکھ کے اک دن بیکل ہو کے چکور لگا یہ کہنے
تیرے اس سُندر مکھڑے بدَ[1] سیکھ لئے ہیں نے دکھ سہنے
کھُل جاتی ہیں دونوں انکھیاں، دیکھ کے گورا چہرہ تیرا
اس شیتل پرکاش کو پا کے لہریں لیتا ہے دل میرا
کیا میں اور کیا میری چاہت، مٹھی بھر یہ میری کایا،
جبھی تو میں نے اس جیون میں کبھی ترا سنجوگ نہ پایا،
بڑے چاؤ سے میں نے ہِردے[2] بیچ اس تیری چاہت کو پالا
دیپ جلا کر جوت سے تیری دل کو بنایا ایک شوالا
پھر بھی نین چھپا کے، لجا کے، ہو جاتا تو آنکھ سے اوجھل
یوں اے پیارے چندرما کر دیتا کیوں میرا جیون بوجھل؟"

[1] باعث
[2] دل

www.taemeernews.com

چاند یہ سن کے، دبی مسکان سے کہنے لگا "سن سکھی پیارے
تیرے ننھے نین بنے ہیں پریت اگن کے دو انگارے
کر کے بھسم اس آگ میں اپنے سروپ کو مجھ سے آگے ہو جا
میں تو ہوں اک سپنے کی مایا، پریم امر ہے اسی میں سمو جا
میری کھوج میں پاگل بن کے، ملن کی مدرا کبھی نہ چکھنا
پریت کا دم جو تو نے بھرا ہے سدا برہ کی کلپن رکھنا!!"

تمثیلِ حیات

دیکھ ان برق صفت لہروں کے ٹکراؤ سے
سینکڑوں کانپتے افسردہ سے اٹھتے ہیں حباب
اور سن ان کے چٹخنے کی غم اندوز صدا
جس طرح دور کہیں ٹوٹتے ہوں تارِ رباب!

اس الم خیزیٔ منظر میں نہاں ہے اے دوست!
زندگانی کی مہیب اور بھیانک تمثیل،
تند اجسام ــــ برانگیخت ــــ تصادم تخلیق
اور پھر ــــ ایک شکست ــــ اور نتیجہ ــــ تحلیل

عبدالمتین عارف

www.taemeernews.com

گوپال مِتل

شیطان کی موت

دیر ویراں ہے، حرم ہے بے خروش
برہمن چُپ ہے، موذن ہے خموش
سوز ہے اشلوک میں باقی نہ ساز
اب نہ خطبے میں وہ جِدّت ہے نہ جوش

ہو گئی بے سود تلقینِ ثواب
اب ڈرائیں بھی تو کیوں خوفِ عذاب
اب حریفِ شیخ کوئی بھی نہیں
ختم ہے ہر ایک موضوعِ خطاب

آج مدھم سی ہے آوازِ درُود
آج جلتا ہی نہیں مندر میں عُود
کیا قیامت ہے یکایک ہو گیا
محفلِ زہّاد پر طاری جمود

ربِ برحق، خالقِ عالی جناب
ہو گئے اپنے مشن میں کامیاب
سلسلہ رُشد و ہدایت کا ہے ختم
آسماں سے اب نہ اُترے گی کتاب

مر گیا، اے وائے شیطاں مر گیا

www.taemeernews.com

ظہیر کاشمیری

غزل

آندھیاں اُٹھیں، فضائیں دور تک کجلا گئیں
اتفاقاً دو چراغوں کی لَویں ٹکرا گئیں

آہ یہ مہکی ہوئی شامیں، یہ لوگوں کے ہجوم
دل کو کچھ بیتی ہوئی تنہائیاں یاد آگئیں

اس فضا میں سرسراتی ہیں ہزاروں بجلیاں
اِس فضا میں کیسی کیسی صورتیں سنولا گئیں

اے خزاں والو! خزاں والو!! کوئی سوچو علاج
یہ بہاریں پاؤں میں زنجیر سی پہنا گئیں

پھر کسی نے چھیڑ دی عذرِ جفا کی داستاں
دل پہ جیسے بھیگی بھیگی بدلیاں سی چھا گئیں

www.taemeernews.com

اثر لکھنوی

غزل

ہر چند کلیجا پھنکتا ہے ساقی سے تقاضا کون کرے
اے حد سے گزرتی تشنہ لبی یہ ننگ گوارا کون کرے

جس راز سے واقف ہو نہ کوئی اُس راز کو افشا کون کرے
خود حسن اگر غماز نہ ہو تو عشق کا چرچا کون کرے

اس رنگ رنگیلی دنیا کا ہر لمحہ سنہری سپنا ہے
ہر سپنا پگھلتا سونا ہے، انجام کی پروا کون کرے

اب شوق بھڑکتا شعلہ ہے دیتی ہے جسے ہر سانس ہوا
بیتابی سی بیتابی ہے، اظہارِ تمنا کون کرے

جلتی ہے پلک تپتی ہے نظر، اک آگ لگی ہے سینے میں

www.taemeernews.com

مشتاق سے اپنے تیرے سوا اس حال میں پروا کون کرے

رنگین پروں کے کچھ طائر یا خواب یہاں پرواز میں ہیں

تعبیر میں الجھا کون رہے تفسیر کا دعویٰ کون کرے

یک جلوہ و صد حیراں نظری، شوریدہ سری پھر بے خبری

اس عشقِ تماشا دشمن کو مانوسِ تماشا کون کرے

جب حال یہ ہے بے مہری کا ہم ڈوبتے ہیں وہ ہنستے ہیں

ساحل کی تمنا ایک طرف، ساحل کا نظارا کون کرے

جو کچھ بھی گزرنی ہے گزرے انجام وہ ہو جو ہونا ہے

جو آپ خریدا جائے اثرؔ اُس غم کا مداوا کون کرے

www.taemeernews.com

حفیظ ہوشیارپوری

غزل

کب اُن کی نظر میں نہ پرسش تھی اور لب پر اُنکے سوال نہ تھا
ہم عرضِ حال جو کر نہ سکے کچھ حاصلِ عرضِ حال نہ تھا

گر اہلِ وفا کا بس چلتا کچھ اور ابھی وہ جی لیتے
اُس جانِ تمنا کا ملنا مشکل تھا ضرور محال نہ تھا

جو صبح تھی صبحِ گریاں تھی جو شام تھی شامِ ہجراں تھی
کیا اس کے سوا دامن میں لے گردشِ ماہ و سال نہ تھا

احساس مرے غم کا تھا اُنہیں آخر یہ حقیقت کھل کے رہی
خود وہ بھی پریشاں خاطر تھے اک میں ہی پریشاں حال نہ تھا

دیکھا جو پریشاں حال مجھے اُس جانِ محبت نے یہ کہا
ہم نے بھی کیا ہے عشق مگر ایسا تو ہمارا حال نہ تھا

www.taemeernews.com

عبد الحمید عدم

سنگ ریزے

چاکِ دامن مرا رفو نہ کرو
یہ کسی دوست کی نشانی ہے

یہ کس رنگ کی گردشیں کھا رہا ہے
ارے او زمانے! ارے او زمانے!!

ابھی سطحِ دریا بہت پُرسکوں ہے
سفینہ لئے چل کنارے کنارے

اک حسیں آنکھ کے اشارے پر
قافلے راہ بھول جاتے ہیں

زندگی کے اداس لمحوں میں
بے وفا دوست یاد آتے ہیں

ہم کو فرصت نہیں ہے سننے کی
اے غمِ روزگار! بات نہ کر

کشتیاں یوں بھی ڈوب جاتی ہیں
ناخدا کس لئے ڈراتے ہیں؟

ارے او کارپردازانِ محشر! کیا تمسخر ہے؟
ابھی سوئے تھے ہم، جاؤ، نہیں بیدار ہوتے ہیں!

www.taemeernews.com

کسی کی آنکھ میں ہیں سُرخ ڈورے اس طرح جیسے
گلوں میں ریشہ ہائے انگبیں بیدار ہوتے ہیں

—

غرورِ میکشی کی کونسی منزل ہے یہ ساقی!
کھنک ساغر کی آوازِ خدا معلوم ہوتی ہے

—

آفتاب احمد

غزل

یہ کیا کہ تابِ لذتِ پرسش نہ لا سکوں
یوں دیکھئے کہ بارِ کرم بھی اٹھا سکوں

یاد آئیں ہر نگاہ پہ سو سو کہانیاں
ایسی کہانیاں جو تمہیں کو سُنا سکوں

یہ شوخیٔ شکستِ تمنّا بھی دیکھئے!
ہے اب بھی اس قدر کہ گھروندے بنا سکوں

اس اجنبی حیات کے بدلے میں اے خُدا
وہ ایک لمحہ دے جسے اپنا بنا سکوں

ہاں اے نگاہِ ناز تری ساحری کی خیر — یہ اور بات ہے کہ میں مطلب نہ پا سکوں

www.taemeernews.com

جاں نثار اختر

نیرنگیاں

کبھی چمن کی لطافت بھی بارِ گذری ہے
نظر پہ پھول کی رنگت بھی بارِ گذری ہے

ہُوا ہے دل میں وہ شعلہ کبھی کبھی روشن
کہ چاندنی کی صباحت بھی بارِ گذری ہے

کبھی کسی کی متانت سے دم بھی الجھا ہے
کبھی کسی کی شرارت بھی بارِ گذری ہے

وہ انہماک رہا کاروبارِ دل میں کبھی
کہ سانس لینے کی فرصت بھی بارِ گذری ہے

کبھی خود اپنی وفا سے ہوا ہے دل بیزار
کبھی خود اُن کی محبت بھی بارِ گذری ہے

کبھی رہا ہوں میں اس درجہ بے سر و ساماں
کسی کی چشمِ عنایت بھی بارِ گذری ہے

غمِ جہاں کو کبھی ہمتوں نے اپنایا
کبھی خود اپنی مسرت بھی بارِ گذری ہے

کبھی نظر جو اٹھائی ہے آدمیت نے
جبیں پہ مہرِ شرافت بھی بارِ گذری ہے

کبھی طلسمِ فریبِ خیال یوں ٹوٹا،
کہ زندگی کی صداقت بھی بارِ گذری ہے

کبھی لطافتِ احساس نے ستایا ہے
خود اپنے دل کی نزاکت بھی بارِ گذری ہے

کبھی کبھی مرا ادراک یوں بھی جاگا ہے
کہ مجھ پہ خود مری فطرت بھی بارِ گذری ہے

کسی کی یاد قیامت سہی مگر اخترؔ
کبھی کبھی یہ قیامت بھی بارِ گذری ہے

www.taemeernews.com

اُپندر ناتھ اشک

قیدِ حیات

افراد

احسان ریاض

سلطان سرور

عقیل نعیم

ذکیہ نجمہ رحیمن بیگاں نسو مجی

مقام

جموں سے اٹھارہ میل دور اکھنور کے قصبہ میں ذکیہ کا گھر

وقت

صبح سے شام تک

(ذکیہ کا گھر اکھنور کے قدیم قصبہ میں دریائے چناب کے کنارے ایک پہاڑی پر بنا ہوا ہے۔ چونکہ اکھنور کا قصبہ جموں (کشمیر) سے اٹھارہ میل کے فاصلے پر ہمالیہ کی ترائی میں واقع ہے اور ذکیہ کا گھر اس قصبہ میں سب سے اچھی جگہ بنا ہوا ہے۔ اسلئے اس کی کھڑکیوں سے دریا اور پہاڑوں کے نہایت دلچسپ اور دلفریب مناظر دکھائی دیتے ہیں۔

پردہ اسی گھر کے سونے کے کمرے میں اٹھتا ہے۔ اور پہلی نظر میں کمرے کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ کیونکہ باہر سے گھر کی شان کو دیکھ کر کبھی خواب میں بھی یہ خیال نہیں ہوتا کہ یہ اندر سے اتنا بدنما ہوگا۔ لیکن قصور شاید مکان بنانے والے کا نہیں، کیونکہ یہ کمرہ بھی کافی کشادہ ہے اور پرانی وضع کا ہونے کے باوجود کافی ہوادار اور روشن ہے۔ سامنے کی دیوار میں تین دروازے ہیں جو آنگن کی بالکونی پر کھلتے ہیں

www.taemeernews.com

ان دروازوں میں سے بالکونی کا جنگلہ، اس سے پرے نیلا آسمان، وشنو دیوی کی تینوں چوٹیاں اور ہمالیہ کے برفانی پہاڑ نظر آتے ہیں۔ اس بالکونی سے ایک طرف باورچی خانے اور سیڑھیوں کو اور دوسری طرف غسلخانے اور دوسرے کمروں کو راستہ جاتا ہے۔ اُدھر سے آنے جانے والے ان تینوں دروازوں سے نظر آجاتے ہیں۔ بائیں دیوار میں دو کھڑکیاں اور ان کے درمیان ایک الماری بنی ہوئی ہے۔ یہ کھڑکیاں دریا کی طرف کھلتی ہیں۔ ان سے نہ صرف دریا کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ ہر وقت ٹھنڈی ہوا کا لطف بھی اُٹھایا جا سکتا ہے۔ دائیں دیوار کے پرلے کونے میں ایک دروازہ ہے جو دوسرے کمرے کو جاتا ہے، اس کے ورے کو دیوار میں ذرا اونچے دو بڑے بڑے طاق بنے ہوئے ہیں۔ انہیں طاقوں کے نیچے ذکیہ کا پلنگ لگا ہوا ہے۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے درمیان دیوار میں کھونٹیاں بھی لگی ہوئی ہیں لیکن ان دروازوں کھڑکیوں، الماریوں اور کھونٹیوں کے باوجود کمرہ تنگ اور تاریک نظر آتا ہے پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اس وقت کھڑکیاں اور سامنے کی بالکونی پر کھلنے والے دو دروازے بند ہیں۔ درمیان کا بھی آدھا کھلا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کھونٹیوں، طاقوں اور الماری کے باوجود اتنی چیزیں ایک ساتھ کمرے میں گڈمڈ پڑی ہیں کہ کمرے کی وسعت اس بے ترتیبی میں گم ہو کر رہ گئی ہے — معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ کمرہ سونے کا ہے کہ کھانے یا نہانے کا — بالکونی پر کھلنے والے بائیں طرف کے دروازے کے نزدیک موری اور چھوٹا سا گھڑا بنا ہوا ہے۔ اس گھڑے کے برابر لوٹے اور بالٹیاں پڑی ہوئی ہیں۔ ادھر کو بائیں دیوار کے ساتھ الماری کے برابر چرخہ اور کاتنے اٹیرنے کا دوسرا سامان پڑا ہے۔ الماری کے پٹ کسی بے شرم کی بیباک آنکھوں کی طرح کھلے ہوئے ہیں اور اس کے خانے آٹے سے لیکر سینے پرونے کے سامان تک بیشمار چیزوں سے اٹے پڑے ہیں۔ ان سب پر مٹی کی ایک ہلکی تہ جمی ہوئی ہے۔ کونے میں موری کے اوپر چھت کے ساتھ ٹنگنا ہے جس پر رضائیاں اور دلائیاں بے ترتیبی سے ایک دوسری کے اوپر ٹنگی ہوئی ہیں۔ کھونٹیاں اور طاق بھی اسی طرح مختلف چیزوں سے اٹے پڑے ہیں۔ ذکیہ کے پلنگ کی بائیں طرف کو کمرے کے درمیان ایک اور چارپائی بچھی ہوئی ہے جس کا بستر آدھا الٹ دیا گیا ہے۔ ذکیہ کے اپنے پلنگ پر بستر تکیہ اور چادریں ریشمی ہونے کے باوجود گندی اور میلی کچیلی ہیں۔ چارپائیوں کے علاوہ جو فرش خالی ہے اس میں تپائی اور چند کرسیاں بے ترتیبی سے پڑی ہوئی ہیں۔ فرش پر بچوں کے کھلونے بکھرے ہوئے ہیں۔ اس سب بے ترتیبی نے کمرے کو اور بھی تنگ بنا دیا ہے اگرچہ دن کے دس بج چکے ہیں اور کھڑکیاں اور دروازے بند ہونے کے باوجود کمرا خاصہ روشن ہے، لیکن ذکیہ ابھی تک اپنے پلنگ پر پڑی کروٹیں بدل رہی ہے۔

پردہ اُٹھنے کے کچھ لمحے بعد بائیں طرف کے بند دروازے کو پٹاخ سے کھولتے ہوئے نستو اور مجی بے تحاشہ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے آتے ہیں۔

www.taemeernews.com

دروازہ کھلنے کی آواز سے ذکیہ چونکتی ہے لیکن اٹھتی نہیں کروٹ بدل کر لیٹی رہتی ہے۔

نستو اور مجی میں ایک ڈیڑھ سال کا فرق ہے۔ مجی سات برس کا ہے اور نستو چھ کی، لیکن دونوں ہم عمر دکھائی دیتے ہیں۔ دونوں کے کپڑے میلے اور چہرے ناصاف ہیں۔ نستو کے ہاتھ میں ایک گیند ہے، جسے سینے سے لگائے وہ مجی کے آگے آگے بھاگی آتی ہے)

مجی۔ میرا گیند...... میرا گیند۔

نستو۔ کیوں ہم نہ کھیلیں گے۔

مجی۔ تم کیوں کھیلو گی۔ میں تمہاری گڑیوں سے کھیلتا ہوں۔

(زبردستی گیند چھین لیتا ہے)

نستو۔ میرا گیند..... دے میرا گیند.....

(مجید کو پیٹتی ہے)

مجی۔ (برابر پٹتا ہوا) لے یہ لے..... یہ لے..... پھر پیٹے گی۔

(نستو روتی ہے)

ذکیہ۔ (صرف کروٹ بدلکر) ارے کوئی ہے! ان کمبختوں کو نکالے میرے کمرے سے، پل بھر کا چین حرام ہو گیا ان بدذاتوں کے مارے۔ خدا ایسی اولاد دشمن کو بھی نہ دے۔

(احسان صاحب داخل ہوتے ہیں۔ دوہرے جسم کے بھاری بھرکم آدمی ہیں، لیکن انہیں مضبوط اور توانا نہیں کہا جا سکتا، معلوم ہوتا ہے جیسے جسم نے بے دل ہو کر گوشت چھوڑ دیا ہے۔ ان کی چال میں ایک عجیب طرح کا اضمحلال ہے۔ کپڑے بھی صاف نہیں معلوم ہوتا ہے جیسے ان کا وجود بھی اسی کمرے کا ایک حصہ ہے۔ اس پر بھی وہی بے دلی اور بے حسی طاری ہے جو کمرے پر)

احسان۔ (بچوں کو دبے لہجے میں سرزنش کرتے ہوئے) جاؤ بیٹیا، بھاگو، ادھر جا کر کھیلو! (نزدیک آکر) ارے بھئی، ابھی تک لیٹی ہوئی ہو، پھر طبیعت کچھ خراب ہے آج؟

ذکیہ (اسی تھکی تھکی آواز میں) یونہی سر میں ہلکا ہلکا درد تھا، جسم ٹوٹ سا رہا تھا۔

(احسان آکر اس کے قریب بیٹھ جاتے ہیں، اس کے بکھرے ہوئے بالوں پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتے ہیں)

احسان۔ (لمبے سانس کو دباتے ہوئے) وہ دن کتنی خوشی کا ہوگا ذکیہ، جب میں تمہیں تندرست دیکھونگا پیٹ مروڑ، کوئی نہ کوئی درد لگا ہی رہتا ہے تمہیں۔

ذکیہ۔ اب بیماری پر انسان کا کیا زور ہے۔

احسان۔ لیکن جہاں بیماری ہے، وہاں علاج بھی تو ہے، تمہاری بیماری کا تو کوئی علاج ہی نہیں، کاش تمہارے درد کی دوا میرے بس میں ہوتی!

www.taemeernews.com

ذکیہ۔ آپ..... لو بھلا..... آپ.....

(اُٹھنے کی کوشش کرتی ہے، لیکن لیٹی رہتی ہے۔)

احسان۔ (لمبا سانس بھرتے ہیں) کاش میں تمہیں خوش رکھ سکتا!

ذکیہ۔ بھلا مجھے کیا غم ہے، میں ہر طرح خوش ہوں۔

احسان۔ خوش ہو (درد سے ہنستا ہے) خوشی کی کوئی علامت تو تمہارے چہرے پر دکھائی نہیں دیتی۔ مجھے ساون کی وہ شام یاد ہے، جب میں رضیہ کی موت کے بعد دلی گیا تھا۔ تمہی نے قطب چلنے کی تجویز کی تھی۔ بین نکہت، تم اور ریاض۔ چاروں قطب دیکھنے گئے تھے۔ کتنی خوش تھیں تم ان دنوں کتنی شوخ اور چنچل؟ کتنا ہنسا کرتی تھیں۔ تمہارے گالوں کے گلاب ہر وقت کھلے رہتے تھے (لمبا سانس بھرتا ہے) یہاں آکر نہ جانے وہ کیوں مرجھا گئے؟

ذکیہ۔ (چپ رہتی ہے)

احسان۔ اور میں سوچتا تھا یہاں آکر ان کی سرخی میں اضافہ ہوگا، یہ خوبصورت فضا، یہ سبزہ، یہ پہاڑ، یہ دریا — صبح و شام ہم سیر کو جایا کریں گے۔

ذکیہ۔ آپ جانتے ہی نہیں، میں کتنی بار کہہ چکی ہوں۔

احسان۔ میں نہیں جاتا (طنز سے ہنستے ہوئے کمرے میں گھومتے ہیں) میں سیر کو جایا کرتا تھا جب تمہاری بہن زندہ تھی۔

ذکیہ۔ (کروٹ بدل کر) آپ اب بھی جا سکتے ہیں، آپ کو فرصت بھی ملے۔

احسان۔ فرصت (اسی طنز سے ہنستے ہیں) تمہارے آنے کے بعد (تمہیں شاید یاد بھی نہیں) میں نے تمہارے ساتھ صبح صبح سیر کو جانے کی کوشش کی تھی۔ سورج نکلنے سے کہیں پہلے دریا کے نیلگوں پانی میں سونا ملجاتا، کنول کے پیلے پیلے پتوں سے دائرے دریا کی لہروں میں بنتے مٹتے چلے جاتے، ادھر سورج کی پہلی کرن جھانکتی ادھر اس زردی میں سرخی تحلیل ہونے لگتی (کھڑکی میں جا کھڑے ہوتے ہیں) صبح کی اس پاکیزہ کنواری فضا میں میرا دل ایک عجیب مسرت سے معمور ہو جاتا۔ یوں محسوس ہوتا، جیسے دنیا نے پہلی بار، نہ جانے کتنی لمبی نیند کے بعد، آنکھیں کھولی ہیں اور صرف ہمیں دو اس بیدار حسن کو دیکھنے کے لئے پہنچ گئے ہیں (ذکیہ کی طرف مڑ کر) لیکن میں غلطی پر تھا، دو نہیں، اس خوبصورتی کا نظارہ کرنے والا تو صرف میں اکیلا ہوتا، تم تو نہ جانے کہاں ہوتی تھیں۔ گم سم سی بیٹھی نہ جانے ماضی کا کونسا خواب دیکھا کرتی تھیں۔ پھر میں سیر چھوڑ کر مصروف رہنے کی کوشش کیوں نہ کرتا۔

ذکیہ۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے، آپ جایا کیجئے ابھی اور نستو کو لے جایا کیجئے۔

www.taemeernews.com

احسان۔ جمی اور نستو (درد سے ہنستے ہیں) اب تو کبھی سیر کو جانے کی خواہش ہی نہیں ہوتی۔ ایک عجیب طرح کی بے حسی طاری رہتی ہے۔ زندگی سردیوں کے اسی چناب کی طرح اپنی جوانی کھو چکی ہے، کیا سوکھا سمٹا کھویا کھویا سا بے آواز بہہ رہا ہے۔ نہ جانے اس کو اپنی جوانی کی یاد آتی ہے یا نہیں ؟

(واپس ذکیہ کی چارپائی کی طرف آتے ہوئے) میں تو قریب قریب بھول ہی گیا ہوں۔ یہ تو ریاض کے آنے کی خبر سن کر کچھ پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔

(لمبا سانس لیکر برابر کی چارپائی پہ بیٹھ جاتے ہیں۔ رضیہ اچانک چونک کر اٹھتی ہے)

ذکیہ۔ ریاض! کون ریاض ؟ ریاض بھائی کیا یہاں آئے ہیں ؟

احسان۔ سنا ہے جموں آئے ہیں۔

ذکیہ۔ (چارپائی چھوڑ کر ان کے قریب آجاتی ہے) جموں، کیوں، آپ کو کیسے پتہ چلا۔

احسان۔ (اس کی بات کا جواب دیئے بغیر اپنے جذبات کی رو میں) میں کبھی کبھی سوچا کرتا ہوں ذکیہ ۔۔۔ پچھلے آٹھ برس ہیں، میں برابر سوچتا چلا آیا ہوں ۔۔۔ اگر میں تمہاری بہن کی موت کے بعد دلی نہ گیا ہوتا تو تمہاری ہنسی خوشی کا سوتا بھی یوں نہ سوکھ جاتا اور میری زندگی کی پہاڑی بھی یوں صندلاہٹوں کی گود میں نہ جا سوتی۔

ذکیہ۔ رضیہ آپا اتنی اچھی تھیں، ان کی جدائی کسے محسوس نہیں ہوتی، میں پوچھتی تھی کہ رہا.....

احسان۔ اور خالہ نے کہا تھا۔ ذکیہ رضیہ کے غم کو تمہارے دل سے بھلا دے گی۔ اگر خالہ میرا حوصلہ نہ بڑھاتیں تو میں شاید کبھی تمہیں مانگنے کی جرأت بھی نہ کر سکتا۔

ذکیہ۔ (دوسری چارپائی کا بستر اکٹھا کرنے لگتی ہے) یہ آج آپ کیا گڑے مردے اکھیڑنے لگے ہیں ۔۔۔ آٹھ برس ہو گئے ہماری شادی کو۔ اچھی بھلی بسر ہو رہی ہے۔ میں اگر بیمار نہ ہو جاتی.....

(بستر اپنی چارپائی پر رکھ کر چارپائی اٹھانا چاہتی ہے۔
احسان صاحب اس کی چارپائی پر جا بیٹھتے ہیں۔)

احسان۔ تم کبھی بیمار نہ رہتیں۔ اگر تم یہاں نہ آتیں۔ آج ریاض کے جموں آنے کی خبر سن کر میرے سامنے قطب کی وہی شام اور اس شام کی وہی ذکیہ گھوم گئی ہے۔

ذکیہ۔ (چارپائی اٹھا کر ایک طرف رکھتے ہوئے) یہ آپ کو ہو کیا گیا ہے۔ چھوڑیئے بھی اس قصے کو دیکھئے میں اٹھ تو بیٹھی ہوں طبیعت خراب بھی، نہیں تو مجھے کیا لطف آتا ہے دن دن بھر لیٹے رہنے میں رومانس کی بابت پوچھ رہی تھی اور آپ.....

(ٹنکتی ہوئی الماری ٹھیک کرنے چلی جاتی ہے)

احسان۔ اب تم تو یونہی ناراض ہوتی ہو، میں نے کبھی کچھ کہا ہے؟ میری طرف سے آٹھوں پہر لیٹی رہو سدا یش

www.taemeernews.com

کے آنے کی خبر سن کر یونہی خیال آگیا کہ جمعوں آیا ہے تو ہو سکتا ہے یہاں بھی چلا آئے۔

ذکیہ۔ (الماری صاف کرنا چھوڑ کر واپس آتے ہوئے) یہی تو پوچھ رہی ہوں پہر بھر سے اور آپ ہیں کہ بات کا جواب ہی نہیں دیتے۔

(پھر واپس الماری کی طرف جاتی ہے)

احسان۔ (اس کے پیچھے جاتے ہوئے) یہی تو بتانے آیا تھا، لیکن نہ جانے کیوں، تمہیں بیمار اور پژمردہ دیکھ کر مجھے افسوس سا ہونے لگتا ہے۔

ذکیہ۔ اب تو میں اٹھ بیٹھی ہوں، کام بھی کرنے لگی ہوں، طبیعت جب ٹھیک نہ ہو تو..... کیا کرنے آئے ہیں ریاض بھائی جمعوں؟ آپ کو کیسے معلوم ہوا ان کے آنے کا۔

احسان۔ رات قسیم آیا ہے وہاں سے، کہہ رہا تھا کہ ریاض میاں جمعوں آئے ہوئے ہیں۔ ان کے تو خوب چرچے ہیں وہاں۔ پرسوں ان کے اعزاز میں پارٹی ہوئی، مشاعرہ بھی ہوا اور وہ تو کہتا ہے جمعوں کے تینوں مقامی اخباروں میں ان کا تذکرہ ہے۔

(ذیل کے مکالمے میں ذکیہ نادانستہ طور پر کمرے کی بکھری ہوئی چیزوں کو ترتیب سے رکھنے لگتی ہے۔ جوں جوں وہ ریاض کا ذکر کرتی ہے اس کی بے حسی دور ہوتی جاتی ہے اور ترتیب کے کام کی رفتار بڑھتی جاتی ہے)

ذکیہ۔ کتنی عزت حاصل کی ہے ریاض نے اور خالو ہمیشہ کوسا کرتے تھے کہ خاندان کے نام کو داغ لگائیگا۔

احسان۔ آوارہ جو رہے تھے بچپن میں۔

ذکیہ۔ نہیں آوارہ تو کیا تھے، الٹے آٹھوں پہر گھر میں پڑے رہتے تھے۔ لیکن درسی کتابوں سے انہیں چڑ تھی۔

احسان۔ تو پھر پڑھتے کیا تھے؟

ذکیہ۔ پریوں اور دیوں کے قصے کہانیاں اور کیا، ــــ نہ جانے کہاں کہاں سے خرید لاتے۔ خالو کو چڑ تھی ان سب کتابوں سے۔ وہ انہیں مخرب الاخلاق سمجھتے تھے۔ ایک بار کا ذکر ہے۔ بھائی ریاض کے دشمنوں کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ خالو انہیں دیکھنے گئے تو الف لیلےٰ پڑھ رہے تھے۔ خون ہی تو اتر آیا ان کی آنکھوں میں۔ باہر سے تو آئے ہی تھے، چھڑی ہاتھ میں تھی، دھڑا دھڑ پیٹنے لگے۔

احسان۔ بڑے جابر تھے تمہارے خالو۔

ذکیہ۔ اگر یہ معافی مانگ لیتے تو ان کا غصہ فرو ہو جاتا۔ دودھ کا ابال ہی تو ہوتا تھا ان کا غصہ، آیا اور اتر گیا۔ لیکن ریاض میاں تو گویا پتھر کے تھے۔ ٹس سے مس نہ ہوئے، آنکھوں میں آنسو تک نہ آئے جھلا کر خالو جان نے کان سے پکڑ کر باہر کر دیا۔

احسان۔ خالو نے نہیں روکا۔
ذکیہ۔ خالو جان غصّے میں ہوں تو کس کا حوصلہ تھا کہ ان کے سامنے دم بھی مارے۔ لیکن ریاض بھائی بھی نہ جانے کس مٹی کے بنے تھے، نہ روئے نہ چلائے، جا کر نیم کے تلے بیٹھ گئے، جب رات کے بارہ بجے خالو جان باہر سے لوٹے تو انہیں کان سے پکڑے ساتھ لیتے آئے، لا کر بستر پہ پٹک دیا اور بولے۔ یہ کمبخت خاندان کے نام کو داغ لگائے گا۔ خدا کی شان دیکھو، وہی خاندان کے نام کو روشن کر رہے ہیں۔
احسان۔ بڑا نام حاصل کیا ہے ریاض میاں نے۔
ذکیہ۔ لیکن چھوڑ تھوڑی دیا تھا ان حضرت نے ان قصوں کا پڑھنا، پڑھتے رہے اور بیچ بیچ گیت پڑھتے رہے۔ ایک بار خالہ نے امی جان سے ریاض کو اپنی غلامی میں لینے کے لئے کہا۔
احسان۔ (ہنس کر) خالہ کی نظر بھی تم پہ تھی!
ذکیہ۔ امی تو شاید تیار بھی ہو جاتیں۔ لیکن خالو یہ سنتے ہی آگ بگولا ہو گئے، مجھ سے بڑا پیار کرتے تھے بولے ــــ کیوں اس غریب لڑکی کا گلا کاٹنے کے درپے ہو۔ جو آدمی چار پیسے نہیں کما سکتا وہ بیوی کی ناز برداری کیا کر سکتا ہے اور ابا جان خالو سے متفق تھے۔
احسان۔ (ذرا ہنس کر) تمہارا کیا خیال تھا؟
ذکیہ۔ میرا ..... لو بھلا میں ..... بڑی اچھی ہوں جیسی ہوں۔
احسان۔ لیکن شادی تو پھر شاید ریاض نے نہیں کی۔
ذکیہ۔ خالہ تو کئی جگہ بات پکی کر آئیں، لیکن پہلے خالو جان کی رائے میں ان کے طور نہ بدلے اور پھر جب طور بدلے تو سنتی ہوں ریاض بھائی نے شادی ہی سے انکار کر دیا اور پھر (لمبا سانس بھر کر) خالہ اور خالو دونوں اللہ کو پیارے ہو گئے۔
احسان۔ لیکن وہ کسی نجمہ کے متعلق ..... کچھ بھنک ..... کان میں پڑی تھی۔
ذکیہ۔ ایک نجمہ کیا بیسیوں نجمہ ان کے قدموں پہ نثار ہونے کے لئے تیار ہیں، وہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھیں بھی۔ نکہت آئی تھی تو شکایت کرتی تھی کہ وہی رنگ ڈھنگ ہیں بھائی جان کے۔ عام لوگوں کی طرح رہتے ہی نہیں۔ بس شعر و نغمہ کی خیالی دنیا میں بستے ہیں ...... اب جموں کیا کرنے آتے ہیں۔
احسان۔ ہو سکتا ہے کسی مشاعرے اُشاعرے میں آئے ہوں۔
ذکیہ۔ جموں آ گئے، لیکن یہاں نہیں آئے۔
احسان۔ وہ مصروف آدمی ہیں، ان کا پل پل بندھا ہو گا۔

ذکیہ۔ ہاں مصروف آدمی ہیں!

احسان۔ یہی تو میں کہنے آیا تھا کہ آنہ جائیں یہاں! جب جمیل آئے ہیں تو یہاں بھی آ سکتے ہیں اور گھر میں اتنی بے ترتیبی پھیلی ہوئی ہے

ذکیہ (امید و بیم کے ملے جلے جذبات سے) ہاں آ گئے ...... اس آٹھ برس کے عرصے میں کتنی بار لکھا۔ نزہت، نکہت، ارشد سب کے ہاتھ کہلا بھیجا۔ خطوں کی تو کبھی رسید نہیں دی۔ اب آئیں گے

(رحیمن دروازہ سے جھانکتی ہے)

رحیمن۔ سرکار ایک صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں، سلطان انہیں دفتر میں بٹھا آیا ہے۔

احسان۔ میں جاتا ہوں۔ تم ذرا یہ جگہ صاف کر دو رحیمن۔ معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی یہاں بھوت ناچ کر گئے ہیں۔ تم لوگ کرتے کیا رہتے ہو سارا دن؟ جانتی ہو کہ بیگم کی طبیعت خراب رہتی ہے (جاتے جاتے زمین پر پڑی ہوئی ایک دو چیزوں کو ٹھوکر مارتے ہیں) اٹھاؤ یہ سب کوڑا کرکٹ اور صاف کرو اس کمرے کو۔

(چلے جاتے ہیں لیکن استہزا آمیز ہنسی کے ساتھ کہے ہوئے ان کے الفاظ برابر کان میں پڑتے ہیں۔)

میں یہاں کا رینجر ہوں، میرے تین تین ملازم ہیں اور میرے گھر کی یہ حالت ہے۔

(رحیمن ذکیہ کے ساتھ کمرہ صاف کرنے میں مدد دیتی ہے کچھ لمحے بعد مجی ہنستا ہوا بھاگتا آتا ہے، نستو چیختی چلاتی اس کے پیچھے بھاگتی داخل ہوتی ہے)

نستو۔ دے میری گڑیا، دے میری گڑیا (اسے پکڑ کر پیٹتے ہوئے) دے میری گڑیا۔ دے ... دے ... دے

مجی (برابر اسے پیٹتا ہوا) پھر مارے گی مجھے۔ لے ...... یہ لے ...... یہ لے ......

ذکیہ۔ (کام چھوڑ کر) ایں ہیں، نستو، مجی، یہ کیا ہو رہا ہے۔

نستو۔ (سسکتے ہوئے) گڑیا چھین لی میری۔

مجی۔ پھر مجھے چڑاتی کیوں تھی۔

ذکیہ۔ چڑاتی تھی تو پھر کیا ہوا، تیری چھوٹی بہن ہے۔ اچھے لڑکے اپنی چھوٹی بہنوں سے ایسا ہی سلوک کرتے ہونگے۔ تیرے ماموں جان ہمیشہ مجھے پیار کرتے تھے۔ کبھی نہ پیٹتے تھے۔

نستو۔ (سسکنا کچھ کم کر کے) نسیم ماموں جان امی

ذکیہ۔ وہ تو اسی مجی کی طرح تھے۔ میں تمہارے ریاض ماموں جان کا ذکر کر رہی ہوں۔

نستو۔ (سسکنا اور بھی کم کر کے) بڑے امیر آدمی ہیں

ذکیہ۔ نہیں بیٹی، ان کا نام بڑا ہے۔ وہ شاعر ہیں، ملک بھر میں ان کی عزت ہے۔ جہاں وہ جاتے ہیں۔ لوگ ان کے راستے میں آنکھیں بچھاتے ہیں۔ ابھی تمہارے آبا کہہ رہے تھے کہ وہ مجھوں آنے والے ہیں (مجید سے) اگر وہ تمہیں دیکھ لیں بھی تو کیا کہیں؟ شکل تو دیکھو کیسی بھنگیوں سی بنا رکھی ہے۔
(رحیمن سے) رحیمن یہ کمرہ پھر صاف کرنا۔ پہلے اسے لیجا کر نہلا اور اس کے کپڑے بدل دے یا لفیا اور لوٹے اٹھا لیجا یہاں سے۔

مجی۔ (ماں کے اس اچانک جاگ اٹھنے والے پیار سے فائدہ اٹھا کر منمناتا ہوا) امی ۔۔۔ ی ۔۔۔ ی۔
ذکیہ۔ (ڈانٹ کر) جاتا بھی ہے کمبخت! (پھر سنبھل کر) جا، جا بیٹا، تیرے ماموں جان آئیں گے تو تجھے اس طرح میلے کپڑے پہنے دیکھ کر ناراض ہونگے اور مٹھائی نہ دیں گے، جا۔۔۔۔ جا۔۔۔ میرا راجہ بیٹا!
مجی۔ پھر میں دو پیسے کی برفی لوں گا۔
ذکیہ۔ (دانت پیستے ہوئے لیکن پیار سے) ہاں ہاں لینا برفی۔
رحیمن۔ چلو۔ چلو۔

(رحیمن مجید کو لیجاتی اور ذکیہ نسیمہ کو گود میں
لے کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔۔۔)

ذکیہ۔ (بڑے پیار سے) اور کیوں نستو بیٹیا، اس طرح بڑے بھائیوں سے پیش آتے ہیں۔
(ماں کے اس غیر متوقع سلوک سے چونک کر نسیمہ چپ رہتی ہے)

— کہو بٹیا!
نستو۔ چھینی کیوں اس نے میری گڑیا؟
ذکیہ۔ گڑیا چھین لی تھی تو تُو مجھ سے کہتی۔ یہ کیا کہ دھول دھپا شروع کر دیا۔ یہ تو چینی کے لچھن ہیں۔ منی کبھی ایسا نہ کرتی۔
نستو۔ (فطری تجسس سے) منی کون تھی امی؟
ذکیہ۔ مُنی چینی کی چھوٹی بہن تھی۔ کہنے کو وہ ننھی منی تھی۔ لیکن بڑی بہن کے مقابلے میں اتنی ہوشیار، سمجھدار اور نیک کہ سب اس سے پیار کرتے تھے، چینی دن چڑھے تک سوئی رہتی اور جب اٹھتی تو بہن بھائیوں سے لڑتی، لیکن منی بہن بھائیوں سے پیار کرتی اور اماں آپا کے کاموں میں ہاتھ بٹاتی گھر تو گھر محلہ بھر اس سے پیار کرتا تھا۔ اب میری نستو بیٹی چینی بنے گی یا مُنی؟
نستو۔ (ماں کی گود میں اچھل کر) میں تو منی بنوں گی۔
ذکیہ۔ لے پھر اپنی گڑیا کے جوڑے اور کھلونے سنبھال کر رکھ دے، تیری امی کی طبیعت ٹھیک نہیں اور دیکھ تو کمرے کو کس طرح گندہ کر دیتی ہے۔

www.taemeernews.com

(نسّو کو پیار سے چوم لیتی ہے)

نسّو۔ (محجوب ہو کر) ابھی اٹھا لیتی ہوں۔

ذکیہ۔ (نسّو کو ایک بار پھر پیار سے چوم کر) بڑی اچھی ہے میری منّی بیٹی!

سلطان۔ (باہر سے) دلہن بیگم سرکار نے کہلا بھیجا ہے کہ ریاض میاں جموں سے آئے ہیں۔

ذکیہ۔ (بیٹی کو پیار کرنا بھولکر اسے فوراً گود سے اتارتے ہوئے) ریاض بھائی آ گئے۔۔۔۔ رحیمن! (اور بھی زور سے) رحیمن!

رحیمن۔ (غسلخانے سے) جی بیگم آئی (گیلے ہاتھ لئے بھاگی آتی ہے) جی۔

ذکیہ۔ (مسرت بھرے جوش سے) دیکھو مجّی کو چھوڑو! اسے میں نہلاتی ہوں، ریاض بھائی آئے ہیں۔ تم اس کمرے کو فوراً صاف کر ڈالو، یہ چارپائی ہٹاؤ، جتنی فالتو چیزیں یہاں پڑی ہیں، تم اس کمرے کو فوراً صاف کر ڈالو، یہ چارپائی ہٹاؤ، جتنی فالتو چیزیں یہاں پڑی ہیں، سب اٹھا کر ادھر کمرے میں رکھ دو، میں نئی دری اور چادر نکال دیتی ہوں۔ کمرہ جھاڑ کر پلنگ پر نیا بستر بچھا دو۔۔۔۔ سونے کے لئے نہ جانے وہ کونسی جگہ پسند کریں گے؟

(سوچتی ہے)

رحیمن۔ بارہ دری اچھی رہے گی۔

ذکیہ۔ ہاں بارہ دری اچھی رہے گی۔ تم ذرا جلدی جلدی اس کمرے کو صاف کر کے اوپر جا کر بارہ دری کا فرش دھو ڈالو۔ نیچے فرش پر دری ولائی اور جاجم بچھا دینا اور کھڑکی کے برابر میز کرسی لگا دینا۔ میز کے لئے میز پوش اور کرسی کے لئے گدّی میں ابھی دیتی ہوں۔

رحیمن۔ (اتنا کام سن کر ٹالنے کی غرض سے) لیکن رات برف پڑی ہے پہاڑوں پر، بارہ دری میں سردی ہو گی۔

ذکیہ۔ تم بارہ دری صاف کرو، میں سلطان سے بجلی بیٹھک صاف کرنے کو کہتی ہوں۔۔۔۔ معلوم نہیں وہ کونسی جگہ پسند کریں گے۔۔۔۔۔ ذرا سلطان کو آواز تو دو۔

رحیمن۔ (بالکونی کے دروازے پر جا کر سلطان کو آواز دیتی ہے) سلطان۔۔۔۔ سلطان۔

سلطان۔ (نیچے آنگن سے) کیا بات ہے، چلائے جاتی ہو۔

رحیمن۔ بیگم بلا رہی ہیں۔

سلطان۔ آیا۔

ذکیہ۔ (رحیمن کے اترے ہوئے چہرے کی طرف دیکھے بغیر بالکونی پر جاتے ہوئے) اور دیکھو بارہ دری کو صاف کر کے ذرا انگنائی کو بھی ٹھیک کر دو، یہ جھلنگے جو کمبخت پڑے ہیں انہیں کوٹھڑی میں بند کر دو، مرغیوں کو ڈربوں میں ٹھونسو، بدبختوں نے جگہ جگہ گڑھے کھود رکھے ہیں (ذرا دھیمی آواز میں)

www.taemeernews.com

اور دیکھ ریاض بھائی کو پھول بے حد پسند ہیں۔ سلطان کے چھوکرے کو بیگاں کے باغ میں بھیج کر دو گلدستے منگا لو، شیشے کے گلاس میں دیدینگی، ایک اُوپر بارہ دری میں اور دوسرا نیچے بیٹھک کی میز پر لگا دینا..... ذرا سی بھی سستی سے کام لیا تو دیکھنا.....

رحیمن۔ جی ابھی بھیجتی ہوں۔

ذکیہ۔ اور اس کہار سے کہنا وہ گھڑے کنویں کا پانی لائے، دریا کا پانی شاید پسند نہ آئے ریاض بھائی کو

سلطان۔ (بائیں دروازے کی اوٹ میں) جی بیگم فرمایئے۔

ذکیہ۔ (درمیان کے دروازے میں ذرا پیچھے ہٹ کر) بھائی ریاض آئے ہیں سلطان، اور میں پریشان ہوں کہ ان کے لئے کونسی جگہ اچھی رہے گی، بارہ دری یا بیٹھک!

سلطان۔ جی..... جی

ذکیہ۔ میں نے رحیمن سے بارہ دری صاف کرنے کے لئے کہا ہے، تو ذرا نیچے بیٹھک میں جا کر فرش دھو دے۔ تخت جھاڑ پونچھ کر صاف کر دے اور میز پوش بدل ڈال، بس اب بھاگ جا تخت کی چادر اور میز پوش بھیجدو نگی۔

(سلطان جانے لگتا ہے)

— اور سن! ذرا ان سے جا کر کہنا کہ ریاض بھائی کو کچھ دیر کے لئے دفتر ہی میں بٹھائیں۔ اتنے میں ذرا یہ صفائی وغیرہ ہو جائے۔ باہر بلا کر کان میں کہنا ان کے یہ بات!

سلطان۔ جی بہتر!

ذکیہ۔ اور دیکھ وہیں نہ بیٹھے رہنا۔ آ کر جلدی سے بیٹھک صاف کر، میں اتنے میں بچوں کو نہلاتی دھلاتی ہوں (نسیمہ سے) چل نسو، تو بھی نہا کر کپڑے بدل (رحیمن سے) تو اب تم جاؤ اور جلدی سے یہ کام نمٹا ڈالو، ماما کو ساتھ لے لو اور ریاض بھائی کے آنے تک اس جگہ کو بیٹھنے لائق بنا دو (جاتے جاتے) کنویں سے پانی اور بیگاں کے باغ سے پھول منگانا مت بھولنا۔

(نسیمہ کو ساتھ لے کر چلی جاتی ہے۔ رحیمن چپ چاپ کمرے کی صفائی کرنے لگتی ہے)

(پردہ گرتا ہے)

www.taemeernews.com

دوسرا منظر

(ایک گھنٹہ بعد اسی کمرے میں)

(اس ایک گھنٹے میں اگرچہ اس بے ترتیب کمرے میں کوئی زبردست انقلاب پیدا نہیں ہو سکا، لیکن اس کی ظاہرہ صورت میں خاصی تبدیلی رونما ہو گئی ہے۔ چیزوں کی افراط میں کمی نہیں آئی (شاید ان سب کو دوسرے کمرے میں رکھنے کا وقت نہیں ملا) لیکن ان میں ایک ترتیب ضرور آگئی ہے۔
— بستر پر دودھ جیسی سفید چادر بچھی ہے، تکیے کا غلاف بھی بدل دیا گیا ہے، کھلونے طاق میں چن دیئے گئے ہیں، کپڑوں کی گٹھڑیاں باندھ کر کھونٹی سے لٹکا دی گئی ہیں، بالٹیاں اور لوٹے شاید باورچی خانے یا غسل خانے میں چلے گئے ہیں، چرخہ ایک کونے میں دھر دیا گیا ہے، تپائی اور چار کرسیاں ایک طرف سجادی گئی ہیں، کرسیوں کی گدیاں اور تپائی کا کور سب کچھ بدل دیا گیا ہے الماری کی چیزیں جھاڑ پونچھ کر سجادی گئی ہیں۔ غرضیکہ ہر چیز اپنی اپنی جگہ قرینے سے چن دی گئی ہے
پردہ اٹھنے پر نسو اور رجی کتابیں لئے دو کرسیوں پر بیٹھے نظر آتے ہیں۔ برابر ہی تیسری کرسی پر بیٹھی ہوئی ذکیہ لیس بُن رہی ہے — لیس بُن رہی ہے، لیکن اس کا دھیان لیس بننے میں نہیں رہ رہ کر اس کی آنکھیں بالکونی کی طرف اٹھ جاتی ہیں، لیس بنتے بنتے اٹھ کر کبھی کمرے کا ایک چکر لگاتی ہے اور پھر بیٹھ جاتی ہے۔

اس ایک گھنٹے کے عرصے میں خواہ کمرے میں کوئی خاطر خواہ انقلاب نہ پیدا ہوا ہو۔ لیکن ذکیہ اور دونوں بچوں کی صورت شکل میں زبردست تبدیلی آگئی ہے — وہ ایک گھنٹہ پہلے کی مغموم، اداس، اور جوانی کے باوجود ادھیڑ عمر کی نظر آنے والی ذکیہ، جیسے بجلی کی سی شوخی اور چمک پا گئی ہے — آٹھ برس پہلے جس جاں سوز حسن کے ایک شعلے نے احسان صاحب کی مردہ خواہشوں میں آگ بھر دی تھی، اس کی ایک جھلک اس وقت ذکیہ کے چہرے پر لرزاں اور خنداں ہے۔

پردہ اٹھنے کے کچھ لمحے بعد ریشمی جمپر اور فرش کو چھوتا ہوا غرارہ پہنے، کھسکتے ہوئے دوپٹے کو گردن کے گرد بل دیتی ہوئی وہ بالکونی کے بائیں دروازے کے پاس جاکر رحیمن کو آواز دیتی ہے)

ذکیہ۔ رحیمن ابھی آئے نہیں ریاض بھائی؟

(اور پھر جواب سنے بغیر واپس آکر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے، لیکن پھر اٹھتی ہے اور کمرے میں گھومنے لگتی ہے نسو اور رجی کتابوں کی طرف نہ دیکھ کر کھڑکیوں میں دیکھتے ہیں۔)

www.taemeernews.com

ذکیہ۔ (انتظار سے جھنجھلا کر) اب اچھے بچوں کی طرح پڑھو بیٹھ کر!

(نستو اور مجی پھر نگاہیں کتابوں پر جما لیتے ہیں)

— (ان کے قریب جا کر ملائمت سے) دیکھو ابھی تمہارے ماموں جان آئیں گے، آتے ہی انہیں سلام کرنا اور بہت شور نہ مچانا (مجی سے جو پھر کھڑکی میں دیکھنے لگا ہے) سُنا رے مجی!

مجی۔ پھر میں برف لوں گا ملائی کی۔

ذکیہ۔ (دانت پیستے ہوئے) پاجی!

(مجی رونے کے لئے ہونٹ لٹکاتا ہے)

— (جلدی سے اپنے آپ کو سنبھال کر پیار سے) ہاں ہاں لینا برف، لینا برف!

(احسان اور ریاض باتیں کرتے ہوئے داخل ہوتے ہیں)

(ریاض تیس تئیس برس کا نوجوان شاعر ہے۔ جذباتی، بےچین اور بےپروا، اس کے چلنے میں، باتیں کرنے میں پارے کا سا اضطراب ہے۔ اس کی آنکھوں میں، چہرے میں اور بالوں میں ایسی کشش ہے جو بے طرح دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے، اس نے سوٹ پہن رکھا ہے، لیکن اس کا لاابالی پن اور اس کی بے پروائی اس میں سے پھوٹی پڑتی ہے)

احسان بھلا دہلی اور لاہور کے محلوں کے مقابلے میں آپ کو لکھنؤ کا یہ مکان کیا پسند آئے گا۔

ریاض۔ مجھے تو یہ چھوٹا سا قصبہ بےحد پسند آیا، پھر جو پاکیزہ ہوا اسے میسّر ہے وہ لاہور اور دلی کے نصیب میں کہاں؟ (ذکیہ کو دیکھ کر) کہو ذکیہ اچھی تو ہو۔

ذکیہ۔ سلام بھائی جان، آپ کی دعا ہے۔

احسان۔ یہ تو جب سے آئی ہیں، بیمار رہتی ہیں۔

ریاض تم تو کافی کمزور ہو گئی ہو ذکی۔

ذکیہ۔ اپنے ماموں جان کو سلام کرو بیٹا۔

نستو۔ ماموں جان سلام

مجی۔ ماموں جان سلام

ریاض۔ (انہیں پیار کرتے ہوئے) سلام بھتی، سلام بھئی (نسیمہ کو گود میں اٹھا کر) کیا نام ہے تمہارا۔

نستو۔ نستو۔

ریاض۔ بیٹی تو آپ کی بڑی پیاری ہے (مجی سے) اور تمہارا کیا نام ہے

مجی۔ مجی۔

ریاض۔ پڑھتے ہو۔

مجی۔ دوسری جماعت میں پڑھتا ہوں۔
ریاض۔ (ننتو کو گود سے اتارتے اور مجی کو پیار کرتے ہوئے) شاباش! بڑا اچھا بیٹا ہے۔

(سلطان بالکونی کے بائیں دروازے سے سنگتروں
کی ٹوکری اندر رکھتا ہے۔)

سلطان۔ سرکار یہ سنگترے رکھے ہیں۔
ریاض۔ اور کچھ ملا ہی نہیں، راستے سے......
ذکیہ۔ اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔
ریاض۔ میں اور تکلف! راستے میں بس کھڑی ہوئی تو ایک سنگترے والا سر پہ سوار ہو گیا، سو بچوں کے لئے لیتا آیا۔

(ننتو اور مجی اپنی جگہ سے اُٹھ کر ایک ایک سنگترہ اُٹھا لیتے ہیں
ذکیہ قہر کی نگاہوں سے بچوں کیطرف دیکھتی ہے اور پھر ضبط سی کہتی ہے)

ذکیہ۔ دیکھو بیٹا، یہاں نہ بکھیرنا چھلکے!

(نیچے آنگن سے رحیمن کی گھبرائی ہوئی آواز آتی ہے)

رحیمن۔ لے گیا..... سلطان..... سلطان..... وہ جا بیٹھا موا منڈیر پہ!

(احسان، ریاض، ذکیہ اور بچے بھاگ کر بالکونی پر جاتے ہیں۔)

احسان۔ کیا بات ہے، کیا بات ہے؟
مجی۔ (جو سب سے پہلے بالکونی پہ پہنچا ہے) امی بندر چادر لے گیا ہے۔
ذکیہ۔ اُف یہ بندر! ناک میں دم آ گیا اِن کے مارے (بالکونی کے جنگلے پہ جا کر رحیمن کو پکارتے ہوئے) کیسے چھین کر لے گیا رحیمن!
رحیمن۔ (جو گھبرائی ہوئی اوپر بھاگی آئی ہے) میں اسے تخت پر رکھ کر سلطان کو دری بچھانے میں مدد دے رہی تھی کہ اُٹھا کر لے گیا۔
ذکیہ۔ ٹھہر مجی، اسے ڈرانا مت، تار تار کر کے رکھ دے گا چادر، جا ننتو بھاگ باورچی خانے سے روٹی کا ایک ٹکڑا اُٹھا لا۔

(ننتو بھاگ جاتی ہے)

احسان۔ (ٹوکری سے ایک سنگترا اُٹھا کر ذکیہ کو دیتے ہوئے) ارے بھئی یہ سنگترہ لے لو، اس وقت تک کہیں برابر ہی نہ کر دے چادر!
ذکیہ۔ (سنگترہ لیکر بندر کو دکھاتے ہوئے) لے..... لے..... پچ پچ!..... بندر کیا

 www.taemeernews.com

کنگ کانگ ہے۔

احسان۔ کنگ کانگ!

ذکیہ۔ (بدستور بندر کو سنگترہ دکھاتے ہوئے) میں جب بھی اس کو دیکھتی ہوں، مجھے کنگ کانگ کی یاد آجاتی ہے۔

احسان۔ کنگ کانگ!

ریاض۔ ایک بھیانک فلم کا نام ہے، جس میں ایک بن مانس ایک خوبصورت لڑکی کو اٹھا کرلے جاتا ہے اسی جیسا بھیانک اور نڈر ہے یہ بھی۔ (بندر سے) لے..... لے..... پچ..... پچ!

رحیمن۔ ایسا دلیر ہے موا کہ سامنے سے اٹھا کرلے گیا۔

ذکیہ۔ جانتی ہو کہ یہ وقت ہے ان کی چڑھائی کا، پھر بھی بے پروا ہو جاتی ہو۔

احسان۔ ارے بھئی ہاتھ میں دکھانے سے کیا ہوگا، کچھ چاہکیں ادھر پھینکو تو چھوڑ کر جائے۔

(نستو روٹی کا ٹکڑا لیکر بھاگی آتی ہے)

نستو۔ امّی یہ لو روٹی۔

ذکیہ۔ (روٹی نستو سے لیکر بندر کو دکھاتی ہے) لے....... لے..... (روٹی کا ٹکڑا توڑ کر پھینکتی ہے) یہ لے..... (لمبا سانس لیتی ہے) چلا گیا، کتنا چالاک ہے۔

احسان۔ کنگ کانگ، کیا نام دیا ہے تم نے اسے۔

ذکی۔ مجی بیٹا، جاتو ذرا بھاگ کر چادر اٹھالا۔

مجی۔ پھر میں چلغوزے لوں گا دو پیسے کے۔

ذکیہ۔ (بیزاری سے) ہاں ہاں لینا چلغوزے (جنگلے پر سے نیچے آنگن میں سلطان کو ڈانٹتے ہوئے) ارے سلطان اس طرح تو گرد نہ اڑا کہ سانس لینا مشکل ہو جائے۔

(سب کمرے میں واپس آجاتے ہیں۔ نستو اپنی کرسی پر جا کر کتاب لیکر بیٹھ جاتی ہے، لیکن دھیان اس کا سنگترے میں ہے۔)

احسان۔ (واپس کمرے میں آتے آتے) اچھا بیگم تم ان کے نہانے دھونے کا انتظام کرو۔ میں ذرا دفتر ہو آؤں۔ دیکھو گرم پانی.....

ذکیہ۔ پانی تو بھئی یہاں دریا ہی کا آتا ہے، تمہیں شاید کچھ جھجک محسوس ہو، ہم تو پیتے بھی وہی ہیں۔ لیکن تمہارے لئے میں نے کنوئیں کا پانی منگایا ہے۔ دو میل دور ہے کنواں، وہیں سے کہار لاتے ہیں۔

احسان۔ کہیئے تو نہانے کے لئے بھی پانی وہیں سے منگالیا جائے۔ ہم تو چنگری ڈال لیا کرتے ہیں۔

ریاض۔ جی آپ فکر نہ کیجئے میں نہا کر چلا جاؤں۔

www.taemeernews.com

احسان۔ اچھا چائے پانی پلاؤ ریاض میاں کو، میں ہو آؤں دفتر تک۔

(چلے جاتے ہیں)

ریاض۔ (چارپائی پر لیٹتے ہوئے) چائے میں صبح ہی پیتا ہوں، سچ، پی کر چلا تھا۔ اب تو بارہ بجنے والے ہیں۔

ذکیہ۔ (کرسی کو چارپائی کے نزدیک کھسکا کر اس پر بیٹھتے ہوئے) تم تو اس طرح تکلف کر رہے ہو۔ جیسے یہ کسی دوسرے کا گھر ہو۔

ریاض۔ سچ میں پی کر چلا تھا، ورنہ کبھی آجتک تکلف کیا جو اب کرونگا۔

ذکیہ۔ آج تک، جیسے بیسیوں دفعہ آچکے ہو یہاں؟

ریاض۔ بھئی میں چائے پی کر چلا تھا ذکی، اب تو کھانا کھانے کا وقت ہے۔

ذکیہ۔ کھانا بھی تیار ہوا چاہتا ہے۔ گھر میں کچھ بے ترتیبی پھیلی ہوئی تھی، میں نے نوکروں کو ادھر لگا دیا۔ (نوکرانی کو آواز دیتی ہے) رحیمن..... رحیمن..... (بالکونی پر جا کر نیچے جھانکتے ہوئے) رحیمن!

رحیمن۔ (نیچے آنگن سے) جی بیگم!

ذکیہ۔ صفائی وغیرہ سلطان پر چھوڑ دو، تم جا کر کھانا پکانے کا انتظام کرو، وہ کہار پانی لایا کنوئیں کا یا نہیں

رحیمن۔ ابھی دو گھڑے دے گیا ہے بیگم!

ذکیہ۔ تو بس اب جھٹ سے باورچی خانے میں آگ واگ ٹھیک کرو، آٹا گوندھ کر رکھو۔ روٹیاں میں خود پکاؤں گی۔

ریاض۔ (اٹھ کر اس کے پاس جاتا ہوا) کوئی ایسی جلدی نہیں ذکی، میں تو یوں بھی ڈیڑھ دو بجے کھانے کا عادی ہوں، لیکن یہ لاری کمبخت جس راستے سے آتی ہے، اس میں اتنے ہچکولے لگتے ہیں کہ خدا کی پناہ ہفتوں کے لئے آنتوں کی ورزش ہو جاتی ہے۔ بھوک لگ ہی آئی ہے۔

ذکیہ۔ (ایک سنگترہ اٹھا کر چھیلتے ہوئے) تم اتنے میں ایک دو سنگترے کھاؤ، سالن تیار ہے، رحیمن ذرا آٹا گوندھ دے، میں روٹیاں خود پکاؤں گی۔

(ریاض پھر چارپائی پر جا کر لیٹ جاتا ہے۔ مجی آتا ہے۔ اور چپ چاپ نسو کے پاس آکر بیٹھ جاتا ہے۔ اپنا سنگترہ وہ ختم کر آیا ہے، لیکن اس کی نگاہیں برابر نسو کے سنگترے پر لگی ہوئی ہیں۔ ذکیہ تہر بھری نظر سے دیکھتی ہے، مجی نگاہیں کتاب میں جما دیتا ہے)

ذکیہ۔ (کرسی پر بیٹھ کر سنگترہ چھیلتے ہوئے) تم ڈاک لاری سے نہیں آئے۔ وہ تو نہر کے کنارے کنارے آتی ہے۔

ریاض۔ سواریوں نے تو کہا تھا نہر پر سے چلنے کے لئے، لیکن ڈرائیور بولا۔ پل ٹوٹ گیا ہے وہاں

www.taemeernews.com

سے لاری نہیں جا سکتی۔

ذکیہ۔ کوئی ڈرپوک ہوگا، برکت تو پینتالیس منٹ میں لے آیا کرتا ہے۔

ریاض۔ پینتالیس ــــ یہ تو پونے دو گھنٹے میں لایا ہے، اور پھر ایسے راستے سے کہ ہڈیاں چٹخ گئیں۔

ذکیہ۔ سڑک سے آئی ہوگی لاری۔

ریاض۔ اس اوبڑکھابڑ راستے کو آپ سڑک کہتے ہیں، اتنے پتھریلے نالے راستے میں پڑتے ہیں لیکن کسی پر بھی تو پل نہیں۔ میں سوچتا ہوں، برسات کے دنوں میں لوگ کیسے آتے جاتے ہونگے۔ مجھے پہلے سے معلوم ہوتا تو میں کشتی میں آتا۔

ذکیہ۔ (الماری سے ایک پلیٹ اٹھا کر سنگترے کو اس میں رکھتے ہوئے) اور شام کو لکھنو پہنچتے۔ آنتیں قل ہو اللہ پڑھتیں، لیکن جناب شاعر ہونے کے زعم میں اس طرف سے بے پروا لہریں گنتے، پلوں کے اُوپر نیچے سے گذرتے ہوئے چلے آتے۔

(آنکھوں ہی آنکھوں میں نستو اور مجی اشارے کرتے ہیں۔ اور نستو اُٹھ کر امی کے پاس آتی ہے)

نستو۔ امی، میں ذرا ہو آؤں صادقہ کے ہاں، اس کی گڑیا کی شادی ہے۔

ذکیہ۔ آجانا اپنے آپ، جیتی کی طرح تنگ نہ کرنا اپنی امی کو۔

نستو۔ ہاں ہاں میں آجاؤنگی۔

(نستو جاتی ہے اور جاتے جاتے مجی کو چھیڑتی ہے۔)

مجی۔ میں بھی گلی ڈنڈا کھیلنے جاؤں گا امی۔

ذکیہ۔ ہاں ہاں کھیل آؤ، لیکن آجائیو جلدی۔

مجید۔ (جاتے ہوئے) ہاں ہاں بس جلدی آجاؤں گا۔

(نستو کے پیچھے بھاگ جاتا ہے)

ذکیہ دیکھو۔

(مجید بالکونی پر رُکتا ہے)

ــ تمہارے ماموں جان کے ساتھ ہم سب مل کر اکٹھے کھانا کھائیں گے۔

(مجید بہت اچھا کہتا ہوا بھاگ جاتا ہے۔
اور ذکیہ ایک سکھ کی سانس دبا لیتی ہے)

ریاض۔ کتنے پیارے بچے ہیں، ذکیہ تم نے تو جنت بسا رکھی ہے۔

ذکیہ۔ (زہرخند کے ساتھ) جنت!

www.taemeernews.com

ریاض۔ (اٹھ کر بیٹھتے ہوئے ارمان بھرے لہجے میں) آٹھ برس گذر گئے، جب ہم نے بھی ایکبار ایسی ہی جنت بسانے کا عہد کیا تھا۔

ذکیہ۔ (ویسے ہی ارمان بھرے لہجے میں) صدیوں سے آٹھ برس!

ریاض۔ تم نے اپنی جنت بسالی۔۔۔۔ لیکن میں۔۔۔ میں نہ جانے کن آتشوں میں سے نکل گیا۔۔۔۔۔ تمہارا ایک گھر ہے، شوہر ہے، بچے ہیں اور میں۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔

ذکیہ۔ آزادی کی آگ میں جل کر کندن بن گئے تم اور نہ ٹوٹنے والی بیڑیاں میرے پاؤں میں بندھتی چلی گئیں۔

ریاض۔ (حیرت سے) بیڑیاں۔۔۔۔ ذکی۔۔۔۔ تم خوش نہیں ہو۔

ذکیہ۔ میں سٹاکر ہوں۔

ریاض۔ بھائی صاحب کہتے تھے تم بیمار رہتی ہو۔

ذکیہ۔ مجھے تم بیمار نظر آتے ہو۔

ریاض۔ میں تو اچھا خاصا ہوں، سفر سے آرہا ہوں، اس لئے کچھ تھکن محسوس ہو رہی ہے۔

ذکیہ۔ (جیسے دوسری دنیا سے بول رہی ہے) مجھے بھی ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے میں ایک لمبا سفر طے کر کے آئی ہوں اور تھک گئی ہوں (ہنس کر) لیکن چھوڑو اس قصے کو، تھکے ہوئے ہو آرام کرو۔

ریاض۔ لیکن بھئی میں کپڑے تو بدل لوں۔

ذکیہ۔ میں نے تمہارے ٹھہرنے کا انتظام اوپر بارہ دری میں بھی کیا ہے اور نیچے بیٹھک میں بھی۔ تمہیں جو جگہ پسند آئے، وہیں تمہارا سامان رکھوا دوں۔

ریاض۔ سامان ہی کونسا ہے، بس یہی کپڑے ہیں۔ کوئی تہمد یا چادر دو تو انہیں بدل ڈالوں۔

ذکیہ۔ تو چلو اوپر بارہ دری میں جگہ پسند کر لو، تہمد نکالے دیتی ہوں، میں تو تمہارے آنے کی امید ہی کھو بیٹھی تھی۔ صبح ہی سنا۔۔۔ تم جموں آئے ہو، سوچا شاید ادھر بھی آنکلو، سو جلدی جلدی بارہ دری ٹھیک کرائی۔ بیٹھک ٹھیک ہو رہی ہے۔ چلو پہلے بارہ دری دیکھ لو۔

ریاض۔ بارہ دری۔۔۔۔ واہ۔۔۔۔

(اُٹھ کر چلتا ہے)

ذکیہ۔ (اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے) لیکن دروازوں کی بجائے اس میں صرف بارہ کھڑکیاں ہیں خدا کیلئے کھولکر نہ بیٹھنا۔ یہ موٹے بندر اتنے دلیر ہیں کہ ذرا آنکھ ادھر ہوئی اور یہ کچھ نہ کچھ لے اُڑے۔

ریاض۔ (قہقہہ لگاتا ہے) لیکن پھر کھڑکیوں کا فائدہ ہی کیا؟

ذکیہ۔ (ہنس کر) نچلے کواڑوں میں جالیاں لگی ہیں۔ آدھی کھڑکیاں ہر وقت کھل سکتی ہیں۔

(دونوں بالکونی کے دروازے میں پہنچتے ہیں کہ پردہ گر جاتا ہے)

www.taemeernews.com

تیسرا منظر

(دو گھنٹے بعد اسی کمرے میں)

(کمرا اور بھی دیدہ زیب ہو گیا ہے۔ کپڑوں کی گٹھڑیاں، ٹنگنے کے کپڑے اور دوسری فالتو چیزیں اندر کمرے میں پہنچا دی گئی ہیں۔ سلطان چرخہ لیے دوسرے کمرے میں جا رہا ہے جب رحیمن داخل ہوتی ہے)

رحیمن۔ اب مختم بھی کر اس کام کو سلطان، نیچے آنگن میں کمبخت مرغیوں نے قیامت کا اودھم مچا رکھا ہے۔ انہیں ڈربوں میں بند کرنا ہے۔

سلطان۔ بس یہ چرخہ رہ گیا ہے، باقی سب چیزیں تو میں نے اٹھا دی ہیں، دیکھو تو کمرے کی کیا صورت نکل آئی ہے۔

رحیمن۔ بیگم ادھر ہی آنے والی ہیں، اب چل آنگن . . . .

سلطان (چرخے کو وہیں زمین پر ٹکا کر) بس ابھی جاتا ہوں (سرگوشی میں) بیگم کا چہرہ روشن ہو گیا ہے۔ ان دو گھڑیوں میں، وہ ہمیشہ کی زردی ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔ یہ ریاض میاں اچھے آئے ہیں۔۔۔ گھر کی، بیگم کی، بچوں کی سب کی کایا پلٹ گئی ہے۔

رحیمن۔ (اسی طرح سرگوشی میں) یہاں آنے سے پہلے انہی کے ساتھ چل رہی تھی بیگم کی بات چیت لیکن رضیہ بیگم، خدا انہیں قدم قدم جنت نصیب کرے، بچی کو چھوڑ کر رحلت کر گئیں اور نواسی کے خیال سے نانی نے ان کو یہیں بیاہ دیا ہے۔

سلطان۔ دولت کا بھی تو خیال ہو گا۔

رحیمن۔ ہاں، اپنی آگ پرائے کیوں سینکیں . . . . . .

سلطان۔ لیکن نہ وہ دولت رہی اور نہ نواسی اور بیگم قید ہو گئیں اس سنسان جگہ میں، میں تو جب بھی ان کو دیکھتا ہوں، مجھے ان پر ہمیشہ رحم آ جاتا ہے۔ کہاں دلی اور کہاں یہ اکھنور۔۔۔ قسمت ہی ہے نا کہاں سے کہاں لا پھینکا۔

رحیمن۔ کیوں انہیں کس بات کی کمی ہے، اب بھی خدا رکھے ہزاروں لاکھوں سے اچھے ہیں، بھانجی مر گئی تو کیا ہوا، اللہ اپنا بچہ بھی سلامت رکھے۔

(باہر بالکونی پر ریاض اور ذکیہ کے باتیں کرنے کی آواز آتی ہے)

ریاض۔ ارے بھئی کیوں کانٹوں میں گھسیٹتی ہو، اتنا لذیذ تھا کھانا . . . . . مجھے تو مدت ہو گئی ایسا کھانا چکھے۔

رحیمن۔ (سرگوشی میں) اٹھاؤ چرخہ اور بھاگو، وہ ادھر ہی آ رہے ہیں۔

(سلطان چیز اٹھا کر دائیں دروازے سے نکل جاتا ہے۔ اور رحیمن
اس کے پیچھے پیچھے چلی جاتی ہے۔ بائیں دروازے سے
ریاض اور ذکیہ باتیں کرتے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔)

ذکیہ۔ کیا کروں، یہاں کوئی نئی چیز ملتی ہی نہیں، وہی نگوڑی مولی گاجریں اور وہی موا کرم کا ساگ (جاتی ہوئی رحیمن سے) رحیمن ذرا پاندان اٹھا لا، میں پان بنا دوں ریاض بھائی کے لئے۔

رحیمن۔ جی ابھی لائی بیگم!

ریاض۔ (جا کر چارپائی پر لیٹتے ہوئے) یہ کرم کا ساگ کیا بلا ہے، ہم نے تو کبھی نہیں چکھا۔

ذکیہ۔ (اس کے پاس کرسی پر بیٹھ کر پھر ہنستے ہوئے) کھا لینا، شام کو پکا لیں گے گوشت میں، کوئی ایسی سوغات کی چیز تو ہے نہیں۔ تمہیں کیا پسند آئیگا۔ تم پرتکلف دعوتیں کھانے کے عادی، میں نے جب سے سنا کہ تم آ رہے ہو برابر انہی ترکاریوں کی بات سوچ رہی ہوں۔ موٹر ڈرائیور سے کہلا بھیجا ہے کہ جموں سے آتا آتا کچھ سبزیاں اور پھل لیتا آئے۔

ریاض۔ ارے بھئی تم خواہ مخواہ پریشان ہوتی ہو ذکی، تم تصور ہی نہیں کر سکتیں، مجھے باورچی خانے میں کھانا کھا کر کتنا لطف آیا۔ دسترخوانوں اور ڈائننگ ٹیبلوں پہ کھا کھا کر تو جان ضیق میں آگئی ہے باورچی خانے میں چولہے کے آگے تمہارے سامنے بیٹھے ہوں تم روٹی پکاؤ، ہم کھائیں —— مجھے امید نہ تھی کہ زندگی میں دوبارہ یہ مسرت حاصل ہوگی۔

ذکیہ۔ مجھے تو بھول ہی گیا سب کچھ، اب تمہارے آنے پر برسوں بعد آج روٹیاں پکی ہیں۔

ریاض۔ (میٹھ کر) لیکن تمہارے کھانے میں مٹھاس تو پہلے سے بھی زیادہ ہے ذکیہ۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ کھانا پکانے میں تم نے پہلے سے بھی زیادہ مہارت حاصل کر لی ہے تو جیسے بھی ہوتا چلا آتا۔

ذکیہ۔ تم آئے ہی نہیں، بیسوں بار تم نے بلا بھیجا۔

ریاض۔ (اس کی طرف ایک ٹک دیکھتا ہے گویا اس کی آنکھوں میں ڈوب کر ان کی تھاہ پانا چاہتا ہے پھر لمبا سانس بھرتا ہے) ارے بھئی تم آ بیٹھیں یہاں کالے کوسوں دور —— کہاں دلی، علیگڑھ اور کہاں ریاست جموں و کشمیر —— اور پھر اس میں بھی یہ دور افتادہ قصبہ، جسے ڈھب کی ایک سڑک بھی تو حاصل نہیں۔

ذکیہ۔ آ بیٹھی (درد سے مسکراتی ہے) جیسے خود اٹھ کر آ بیٹھی یہاں —— ہم غریبوں کا کیا ہے، اماں ابا نے جہاں بٹھا دیا، جا بیٹھیں۔

(رحیمن پاندان لے کر آتی ہے)

رحیمن۔ لیجئے بیگم پاندان۔

www.taemeernews.com

ذکیہ۔ لاؤ، اور جاکر دیکھو، وہ سلطان کا چھوکرا پھولوں کے گلدستے لایا ہے یا نہیں۔

(ریاض اٹھ کر بالکونی کے درمیانی دروازے میں جا کھڑا ہوتا
ہے۔ ذکیہ چارپائی پر بیٹھ کر پان بنانے لگتی ہے۔)

ریاض۔ (کچھ لمحے دور پہاڑوں کو دیکھتا رہتا ہے، پھر سکھ کا لمبا سانس بھر کر مڑتا ہے) کچھ بھی ہو ذکیہ، اگر میں جانتا تم اتنی خوبصورت جگہ رہتی ہو تو سفر کی دقتوں کو بھول کر آ جاتا (کھڑکی کے پاس جاکھڑا ہوتا ہے) کتنا خوبصورت مقام ہے (بالکونی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) وہ تین طرف بیضوی دائرہ سا بناتے ہوئے پہاڑ اور یہ چوٹی طرف اپنی دھن میں مست سویا کھویا سا بہتا چناب۔

ذکیہ (اس کے پاس جاکر اسے پان کی گلوری دیتے ہوئے) تم کہیں گرمیوں میں آتے تو چناب کی بہار دیکھتے سویا کھویا افیمی سا معلوم نہیں ہوتا ان دنوں ——— ہزار پھنوں والے افعی کی طرح پھنکارتا ہوا بہتا ہے ——— پل لرزنے لگتا ہے کنارے کی پہاڑی پر بنے ہوئے یہ گھر تک لرزنے لگتے ہیں۔ انہی دنوں یہاں رونق بھی ہوتی ہے، اردگرد کے بازاروں سے اتنے آم آتے ہیں اور لوگ اتنے آم چوستے ہیں کہ چھلکوں سے بازار بھر جاتے ہیں، جموں تو کیا سیالکوٹ اور گوجرانوالہ تک سے لوگ یہاں آتے ہیں، آدھی آدھی رات تک بازاروں میں شور ہوتا رہتا ہے۔

(ریاض جاکر چارپائی پر لیٹ جاتا ہے اور ذکیہ کرسی
کھسکا کر پہلے کی طرح اس کے پاس بیٹھ جاتی ہے)

ریاض۔ شور دلی میں کم نہیں ہوتا، گئی رات تک ٹرامیں گھڑگھڑاتی رہتی ہیں اور پھر موٹریں، بسیں، کاریں، تانگے، چھکڑے ——— اتنا ہنگامہ برپا رہتا ہے کہ جی چاہا کرتا ہے، آدمی کہیں بھاگ جائے ——— کہیں ایسی جگہ، جہاں اتنا شور نہ ہو، اتنی آوازیں نہ ہوں، سکون ہو، طمانیت ہو، کچھ اونگھتی ہوئی سی، سوئی سوئی سی خواب آلود فضا ہو، تمہیں میں نے ایک نظم سنائی تھی تا لوٹس ایٹرز (Lotus Eaters)

ذکیہ۔ (دکھ کا لمبا سانس بھر کر) میں یہاں آکر سب نظمیں بھول گئی ہوں۔

ریاض۔ (اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے) ارے بھئی وہی ٹینیسن کی، جہاں اوڈیسس کے ساتھی جہاز کی تباہی کے بعد ایک ایسے جزیرے میں پہنچ جاتے ہیں، جہاں سکون ہی سکون ہے (اٹھ کر کمرے میں گھومنے لگتا ہے) اس جزیرے کی سوئی سوئی سی خوبصورت فضا کو دیکھ کر وہ چاہتے ہیں کہ وہ وہیں کے ہو رہیں۔ کنول کے پھول کھاتے رہیں اور سوتے رہیں (ذکیہ کے قریب آکر) کبھی کبھی میرا جی بھی ایسی ہی دنیا میں پہنچ جانے کو چاہا کرتا ہے ——— یہاں آکر معلوم ہوتا ہے کہ میں اس خطے میں پہنچ گیا ہوں، زندگی جیسے کسی ابدی نیند سوئی ہوئی ہے یہاں۔

(پھر لیٹ جاتا ہے ——— کہیں برابر کی گلی میں عورتوں کے جھگڑنے کی

www.taemeernews.com

آواز آتی ہے جس میں مردوں کی آوازیں بھی شامل ہیں۔)

ذکیہ۔ لیکن ہنگامے تو یہاں بھی ہوتے ہیں، دیکھو نیچے گلی میں شور ہو رہا ہے۔

ریاض۔ (کروٹ لیکر ذکیہ کے نزدیک ہوتے ہوئے کہنی کے بل لیٹے لیٹے) تم شاید دلی کی آوازوں کو بھول گئی ہو ذکی، اس پرسکوں جگہ پہنچکر تمہیں شاید یاد ہی نہیں رہا کہ شور ہوتا کیا ہے؟ میں تو جب سے آیا ہوں برابر یہ محسوس کر رہا ہوں کہ زندگی یہاں ایک ابدی نیند سو رہی ہے۔ یہ ہنگامے اور خرخشے تو محض اس کے خراٹے ہیں۔

ذکیہ۔ کیوں ریاض، کالے پانی میں بھی تو اتنا ہی سکون اور خاموشی ہوتی ہوگی۔

ریاض۔ (پھر اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہے) کالا پانی — کالے پانی کا کیا ذکر؟

ذکیہ۔ میں کبھی کبھی ایسے محسوس کرتی ہوں، جیسے یہ لکھنؤ میرا کالا پانی ہے اور میں یہاں عمر بھر کے لئے قید کر دی گئی ہوں۔

ریاض۔ (اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے) تم خوش نہیں ہو ذکیہ۔

ذکیہ۔ (درد بھری مسکراہٹ کے ساتھ) میں شاکر ہوں۔

ریاض (اُٹھ کر کمرے میں گھومتے ہوئے فلسفیانہ انداز میں) یہ ساری کی ساری زندگی ایک کالا پانی ہے ذکیہ۔ غالب نے ٹھیک ہی تو حیات کو قید کا نام دیا ہے (کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوتا ہے) یہ اتنی خوبصورتی۔ یہ بھی تو شاید آزاد نہیں، وقت کی قید میں بند ہے (پھر واپس آتے ہوئے) اور یہ روح جسے لوگ آزاد کہتے ہیں، جسم کی قید میں بند رہتی ہے اور جسم زندگی کی بیڑیوں میں جکڑا ہوا ہے — ان زنجیروں سے نجات نہیں، ایک حلقے سے نکل کر دوسرے میں اور دوسرے سے نکل کر تیسرے میں پھنسنا ناگزیر ہے — ہمیشہ ان جانی، ان دیکھی بیڑیاں جسم کو، روح کو، خوبصورتی کو، زندگی کو جکڑے رہتی ہیں۔

(پھر آکر چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے)

ذکیہ۔ (اداس مسکراہٹ کے ساتھ) تم ہمیشہ شاعری کی دنیا میں گھومو گے، کبھی حقیقی دنیا کی بات نہ کرو گے۔

ریاض۔ میں سوچتا ہوں، کہ قید جب ہر حال میں برحق ہے تو کیوں اس کی فکر کی جائے، کاٹ سکیں تو ان زنجیروں کو کاٹا جائے، نہیں تو کیوں ذہن میں جکڑے جکڑے انہیں فراموش کیا جائے۔

ذکیہ۔ تم شاعر ہو اور میں تم سے باتوں میں نہیں جیت سکتی۔

ریاض۔ لیکن تم بھی تو شاعر تھیں اور ہمیشہ مجھ سے باتوں میں جیت جایا کرتی تھیں۔

ذکیہ۔ میں جان گئی ہوں جیت کر بھی تم ہار جایا کرتے تھے۔ اور میری تُک بندیوں پر بھی سر دھنا کرتے تھے۔

(دھاگا ختم ہو جاتا ہے۔ الماری سے جاکر دھاگا لاتی ہے)

ریاض۔ (اس کے پیچھے جاتا ہوا) کتنے اچھے تھے وہ دن!

www.taemeernews.com

ذکیہ۔ تمہیں تو کبھی یاد بھی نہ آتی ہو گی ان کی۔

ریاض۔ اگر ان دنوں کی یاد میرا پیچھا چھوڑ دیتی تو میری زندگی یوں اکھڑی نہ ہوتی۔

ذکیہ۔ (آنکھوں میں چمک سی پیدا ہو جاتی ہے) ریاض۔

ریاض۔ (جذبات کو چھپانے کی کوشش میں بالکونی کی طرف جاتے ہوئے) سچ کہتا ہوں۔ اگر وہ یاد نہ رہتی تو آوارگی کی بیڑیاں یوں میرے پاؤں کو نہ جکڑے رکھتیں۔

ذکیہ۔ (اس کے پیچھے جاتے ہوئے، ہمدردی، درد اور محبت کے لہجے میں) ریاض۔

ریاض۔ (جذبات پر قابو پاتے ہوئے ذرا ہنس کر) وہ دیکھو تمہارا کنگ کانگ پھر تاک لگا رہا ہے۔

(ذکیہ ریاض کے بالکل قریب جا کر اس کی آنکھوں میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہے، لیکن ریاض بندر کی طرف دیکھ رہا ہے۔ ایک لمبا سانس بھر کر وہ بھی ادھر دیکھنے لگتی ہے۔ اس کا لب و لہجہ ایک عجیب درد سے بھر جاتا ہے۔)

ذکیہ۔ کنگ کانگ... (مسکراتی ہے) تمہیں یاد ہے نا، ہم ایک بار کنگ کانگ کی فلم دیکھنے گئے تھے۔ میں اس لڑکی کو کبھی نہیں بھول سکی۔ جسے کنگ کانگ اٹھا کر لے گیا تھا۔ (لمبا سانس لیتی ہے) وہ رہائی پا گئی تھی لیکن.....

(باہر سے احسان صاحب کی آواز آتی ہے)

احسان۔ ارے بھئی کدھر ہو؟

(اندر داخل ہوتے ہیں۔ ہاتھ میں مٹھائی کا دونا ہے)

ریاض۔ آیئے بھائی جان یہ کیا لائے ہیں؟

احسان۔ (اندر آتے ہوئے) یہاں ملتا ہی کیا ہے، میں نے کہا منہ میٹھا کرنے کے لیے مٹھائی ہی لیتا چلوں۔

ریاض۔ (ان کے پیچھے آتے ہوئے) ارے بھائی جان اس کی کچھ کسر رہ گئی تھی۔ گاجر کا حلوہ تو کھایا ہے۔

ذکیہ۔ (ان کے پیچھے آتے ہوئے ریاض کی بات کاٹ کر) کالا گاجر کا حلوہ بھلا کیا پسند آیا ہو گا۔

ریاض (ہنستے ہوئے) وہ کسی نے کہا ہے نا ــــ حسن صورت پر نہ جاؤ (احسان دونے کو تپائی پر رکھ کر جانے لگتے ہیں) ارے بھائی جان آپ کدھر جا رہے ہیں، بیٹھئے نا۔

احسان۔ نہیں بھئی دفتر میں کام ہے۔

ذکیہ۔ (چارپائی پہ بیٹھتے ہوئے) ذرا جلدی آیئے گا، ذرا گھما لائیں گے ریاض بھائی کو پاس کے گاؤں تک

احسان۔ کوشش کرونگا، لیکن نہ آسکا تو تم لوگ ہو آنا۔

(چلے جاتے ہیں)

 www.taemeernews.com

ریاض۔ بھائی جان کی صحت تو پہلے سے کہیں بہتر ہے۔
ذکیہ۔ پھول گئے ہیں، نہیں رنگ تو اندر لگا ہوا ہے۔
ریاض۔ یہ ان کے دانت کس طرح کے ہیں، اوپر کی قطار سفید ہے اور نچلی زرد۔
ذکیہ۔ دونوں زرد تھیں، پایوریا تھا۔ اوپر کی نقلی لگوا لی ہے، نچلے بھی نکلوانے کے لیئے زور دیئے رہی ہوں
لیکن مانتے ہی نہیں، اپنی صحت کا کچھ خیال ہی نہیں رکھتے۔
ریاض۔ لیکن پایوریا تو بڑا موذی مرض ہے۔
ذکیہ۔ (اب شاید بھی اس ذکر کو رسے انداز میں) مانیں بھی۔
(ایک بندر تیزی سے آتا ہے اور مٹھائی کا دونا لے جاتا ہے)
ریاض۔ (بے طرح چونک کر) ارے..... لے..... لے..... وہ لے گیا مٹھائی کا دونا۔ شاید
اسی وقت سے تاک لگائے بیٹھا تھا۔
(اُٹھ کر آنگن کے دروازے میں جاتا ہے۔)
— وہی ہے کنگ کانگ — کس مزے سے جا بیٹھا ہے منڈیر پر۔
ذکیہ (وہیں چارپائی پر بیٹھے بیٹھے) کنگ کانگ سے میں نے کب کا سمجھوتہ کر لیا ہے۔
ریاض۔ (دروازے کی چوکھٹ میں کھڑے کھڑے دور پہاڑوں کو دیکھتے ہوئے) یہ سامنے کے
گیروئے پہاڑوں پر بادلوں کے سائے کتنے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں سایسا دکھائی دیتا ہے۔
جیسے یہ پر سکون جگہ پا کر سو گئے ہیں اور یہ چنگبری پہاڑیاں، لیٹی، سوئی، نیم غنودہ سی کیسی اچھی لگ
رہی ہیں۔ میں اگر یہاں رہ جاؤں تو نہ جانے کن معرکۃ الآرا چیزوں کی تخلیق کر وں۔
ذکیہ (طعنے اور امید سے) رہ گئے تم!
(دزدیدہ نگاہوں سے اسکی طرف دیکھتی ہے — نیچے گلی سے
اونٹوں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آواز آتی ہے۔)
ریاض۔ کتنا سکون ہے اس دوپہر میں، یہ نیچے گلی سے گذرنے والے اونٹوں کے گلے میں بندھے ہوئے
گھنٹوں کی آواز کیسی پیاری معلوم ہوتی ہے۔
(کبوتروں کی غٹرغوں کی آواز آتی ہے۔)
— یہ بازار سے آنے والا مدھم سا شور، اور یہ جنگلی کبوتروں کی غٹرغوں!
(بندریا کے بچے کی کوُں کوُں کی آواز آتی ہے۔)
— لیکن یہ کوُں کوُں کی آواز نہ جانے کس پرندے کی ہے؟
ذکیہ۔ (اُٹھ کر ہنستی ہوئی کھڑکی کے پاس جاتی ہے) پرندے کی نہیں، یہ بندریا کے بچوں کی آواز ہے۔

www.taemeernews.com

ریاض۔(اس کے پاس آتا ہوا) کہاں ہیں یہ بندر یا کے بچے۔
ذکیہ۔ وہ دیکھو ادھر چھت پر۔ کیسی کوٹ کوٹ کر شوخی بھری ہوئی ہے ان میں، وہ دیکھو وہ سب سے کمبخت کس طرح لیٹا ہوا ہے اور وہ بندریا کس طرح اس کے جسم کو سہلا رہی ہے۔
ریاض۔ جی چاہتا ہے، اسی طرح دوپہر کی میٹھی میٹھی دھوپ میں لیٹ جاؤں اور کوئی میرے جسم کو سہلائے۔
ذکیہ۔ تم کب چاہتے ہو؟ تم نے کبھی نہیں چاہا۔

(لمبا سانس بھرتی ہے)

ریاض۔ کتنے شوخ اور چنچل ہیں یہ بندر اور ان کے بچے۔
ذکیہ۔ ہر طرح کی قید سے آزاد۔
ریاض۔ حیات کی قید میں تو یہ بھی بند ہیں۔ لیکن انہیں اس کا غم نہیں، شاید اُس کا احساس بھی ان کو نہیں۔
ذکیہ۔ یہ احساس کا کانٹا آدمی ہی کی قسمت میں کیوں ہے؟ یہ احساس کند کیوں نہیں ہو جاتا مر کیوں نہیں جاتا۔
ریاض (لمبے سانس کو سینے ہی میں دباتے ہوئے) مر بھی جاتا ہے آدمی کا احساس۔

(آکر چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے)

ذکیہ۔ (اس کے پیچھے پیچھے آتے ہوئے) مر کر بھی جی اُٹھتا ہے۔ میں گھنٹوں ان بندروں کو آزادی سے کودتے، پھاندتے، قلابازیاں لگاتے، درختوں کی شاخوں سے لٹکتے، جھولتے دیکھتی ہوں جہاں تک کہ اپنی قید کا یہ احساس کئی گنا ہو کر میری رگ رگ میں جاگ اٹھتا ہے کبھی ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے جسم کی تمام رگوں میں کچھ سلگنے سا لگا ہے، اور کبھی ایسے کہ جسم کی ہر دھڑکتی ہوئی رگ گویا بجھی ہوئی بھیگی لکڑی کی طرح مردہ ہو گئی ہے۔
ریاض۔ (اچانک اُٹھ کر ذکیہ کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر ذرا سا جھنجھوڑتے ہوئے) ذکیہ تم خوش نہیں ہو۔
ذکیہ۔ میں شاکر ہوں۔
ریاض۔ (اور بھی جھنجھوڑتے ہوئے) تم شاکر بھی نہیں ہو۔
ذکیہ۔ دنیا میں کون خوش ہے، کون شاکر ہے..... تم خوش ہو۔

(ریاض کچھ کہنا چاہتا ہے، اس کے چہرے پر ایک بادل سا آتا ہے، لیکن دوسرے لحظے میں وہ اپنے آپ پر قابو پا لیتا ہے)

ریاض۔ میں .... (ہنستا ہے).... میں شاعر ہوں۔ (اس کو کرسی پر بٹھاتے ہوئے) اور تم.... تم شاعر سے فلسفی بن گئی ہو۔

(خود بھی چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے)

ذکیہ۔ زندگی میں آدمی یا فلسفی بن جاتا ہے یا پتھر!

www.taemeernews.com

ریاض۔ دونو ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔
ذکیہ۔ شاید تم سچ کہتے ہو۔ پھر شاید سب سے بڑا فلسفی ہے۔
ریاض۔ (اُٹھ کر کمرے میں گھومتے ہوئے) لیکن ذکیہ اچھا تھا تم شاعر رہتیں۔ اپنی تمام ناامیدی اور یاس کے باوجود شاعر کے دل میں، دل کے کسی نامعلوم گوشے میں امید چھپی رہتی ہے۔ تم سوچ ہی نہیں سکتیں ذکیہ! کل شام میں کتنا مایوس تھا، رات میں نے کس ذہنی اذیت سے گذاری، اپنے پرشور لیکن کھوکھلے ماحول کی اس دم گھونٹ دینے والی قید سے کس طرح بھاگ کر یہاں آیا ہوں۔ لیکن اس چھوٹے سے خوبصورت قصبے کو دیکھ کر، تم سے ملکر، منتو اور رمجی کو پاکر۔ تمہاری اس ننھی سی جنت کا نظارہ کر کے میں جیسے پھر اپنی امید اور مسرت پا گیا ہوں، لیکن اسی جنت کی تخلیق کرنیوالی تم غمگین اور اداس ہو۔
ذکیہ۔ جنت!

(دردبھری ہنسی ہنستی ہے)

ریاض۔ (ذکیہ کی اس زہریلی، دردبھری، ہنسی کی طرف دھیان دیئے بغیر اپنے جذبات کی رو میں) اور میں سوچتا تھا، اگر میں یہاں کچھ دن بھی رہ جاتا تو نہ جانے کتنی خوبصورت چیزوں کی تخلیق کر دیتا۔ (پھر آکر چارپائی پر ذکیہ کے سامنے بیٹھ جاتا ہے) جس دن دنیا میں خوبصورتی پیدا ہوئی تھی ذکیہ شاید اس کے ساتھ ہی بدصورتی نے بھی جنم لیا تھا۔ فلسفی جب خوبصورتی کو دیکھتا ہے تو بدصورتی کو نہیں بھولتا، لیکن شاعر جب اس بدصورتی کو دیکھتا ہے تو خوبصورتی کو یاد رکھتا ہے۔ گئی بیتی خوبصورتی کو ماضی کے تاریک غاروں سے نکالکر اپنے ماحول کی بدصورتی پر طاری کر دیتا ہے، یہیں شاید وہ فلسفی سے فایدے میں رہتا ہے۔
ذکیہ (لمبا سانس بھرتے ہوئے) شاید تم سچ کہتے ہو، شاید یہ شاعری ہی کا جذبہ ہے جس نے اب تک مجھے زندہ رکھا۔ شاید میں بیتے دنوں کی خوشیوں میں اپنے موجودہ غم کو، ماضی کی خوبصورتی میں، حال کی بدصورتی کو بھولے رہی ہوں۔
ریاض (مسرت سے) بخدا تم اب بھی شاعر ہو ذکی۔ اگرچہ تم نے پچھلے آٹھ برس میں ایک بھی شعر نہیں کہا۔
ذکیہ تمہارے ساتھ رہ کر شاید میں پھر شاعر بن جاؤں، تم یہاں رہو تو شاید میں اپنی پرانی خوشی پھر واپس پا جاؤں۔
ریاض۔ (اٹھ کر پھر کمرے میں چکر لگاتے ہوئے) میں رہوں گا، مجھے برفباری سے کوئی دلچسپی نہیں۔
ذکیہ۔ برفباری؟
ریاض۔ ہم لوگ برفباری دیکھنے آئے تھے، لیکن جموں پہنچکر میں یہاں چلا آیا۔

www.taemeernews.com

ذکیہ۔ (اُٹھ کر اس کی آنکھوں میں حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے) تم کبھی آ ؤ گے شاید میں اسی امید پر زندہ تھی۔

(لمحہ بھر کے لئے دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے ہیں، ریاض کی آنکھوں میں ایک ثانیہ کے لئے ایک چمک سی کوند جاتی ہے معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ایک ہی بار ذکیہ کو اپنی آغوش میں بھر لیگا، لیکن پھر وہ بے پناہ ضبط سے (جس کے اثرات اس کے چہرے پر نمایاں ہو جاتے ہیں) اپنے آپ پر قابو پا لیتا ہے اور اس کی آنکھوں کی وہ چمک جیسے پیدا ہوئی تھی اسی طرح عنقا ہو جاتی ہے، اس کے ہونٹوں پر ایک اداس سی مسکراہٹ کھیلنے لگتی ہے، ذکیہ فوراً موضوع بدل دیتی ہے۔)

— تمہیں اپنا کمرہ پسند آیا۔

ریاض (خوش ہے کہ ذکیہ نے موضوع بدل لیا بڑے جوش و خروش سے) کمرہ ..... پسند...... (ہنستا ہے اور کمرے میں گھومتا ہے) مجھے محسوس ہوتا ہے، جیسے مجھے اسی کمرے کی ضرورت تھی، میں وہیں بیٹھا بیٹھا سورج کے طلوع و غروب کا نظارہ کر سکتا ہوں۔ ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں پر کرنوں کی گلکاری کا لطف اٹھا سکتا ہوں، نیچے دریا کو کسی، کبھی نہ ختم ہونے والی تلاش میں سرگرداں دیکھ سکتا ہوں بیٹھا بیٹھا تھک جاؤں تو لیٹ سکتا ہوں، لیٹا لیٹا اکتا جاؤں تو گھوم سکتا ہوں۔

ذکیہ میں ڈرتی تھی۔ کہیں وہاں تمہیں رات کو سردی محسوس نہ ہو، بارش آئے تو بڑی ٹھنڈک ہو جاتی ہے بارہ دری میں۔

ریاض۔ میں بارش کو پسند کرتا ہوں۔ باہر رم جھم، رم جھم بارش ہو رہی ہو اور میں کمرے میں خاموش بیٹھا اس کا سنگیت سنوں، یا پھر باہر ہوائیں چل رہی ہوں، میرے کمرے کی دیواروں سے ٹکریں مار رہی ہوں اور میں اپنے کمرے میں آرام سے بیٹھا، کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے شعر کہوں، اونگھوں، یا خواب دیکھوں۔ اس سے زیادہ مجھے کوئی چیز مرغوب نہیں۔

ذکیہ۔ مجھے سردی کا ڈر تھا، اس لئے میں نے نیچے کا کمرہ بھی ٹھیک کرا دیا تھا۔

ریاض۔ نہیں.... نہیں.... نہیں.... مجھے وہ کمرہ پسند نہیں، مجھے بارہ دری ہی پسند ہے —— دور بھی اور نزدیک بھی، خاموش بھی اور پر شور بھی —— ایک کھڑکی کھول لوں تو بازار کا شور سن سکوں گا، دوسری کھولوں تو تم سے باتیں کر سکوں گا، نستو اور ممی کو بلا سکوں گا۔

ذکیہ۔ میں خوش ہوں، تمہیں بارہ دری پسند آگئی۔ میں دو پٹو رکھ دونگی۔ شاید تمہیں سردی محسوس ہو

www.taemeernews.com

ریاض۔ تم فکر نہ کرو، میری بے تکلفی میں ابھی تک کسی طرح کی کمی نہیں آئی۔

(بالکونی میں بیگاں کی آواز آتی ہے)

بیگاں۔ مجید کی اماں ..... مجید کی اماں .....

ذکیہ۔ (جاکر چارپائی پر بیٹھتے ہوئے) آؤ بیگاں، آجاؤ،

(بیگاں آکر چوکھٹ میں بیٹھ جاتی ہے)

— سلام حادی بیگاں۔

بیگاں۔ وعلیکم السلام مجید کی اماں (ریاض سے) سلام حضور (پھر ذکیہ سے) بال بچے جئیں، سائیں جئے دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو۔

ذکیہ۔ کہو کیسے آئیں۔

بیگاں۔ سلطان کا چھوکرا گیا تھا گلدستے مانگنے، میں نے کہا .... خود ہی لے جاؤں۔

ذکیہ۔ ہمارے بھائی جان آئے ہیں بیگاں، یہیں رہیں گے، ہو سکے تو ایک دو گلدستے روز دے جایا کرو!

بیگاں۔ سو بار حضور، جتنے کہو اتنے!

ذکیہ۔ آج ہم تمہارا باغ دیکھنے آئیں گے۔

بیگاں۔ دھن بھاگ ہمارے جو آپ آئیں۔

ذکیہ۔ سرسوں کا ساگ اور مکئی کا ڈھوڈا کھلاؤ تو آئیں۔

بیگاں۔ ڈھوڈوں کی کیا کمی ہے سرکار۔

ذکیہ۔ (جیب سے کچھ پیسے نکال کر اس کی طرف پھینکتی ہے) لو یہ دو آنے، بچوں کے لئے ریوڑیاں لے جانا۔

بیگاں۔ سرکار بختو کے لئے کوئی کرتا مل جاتا، ننگا پھرتا ہے، سائیں جئے۔

ذکیہ۔ اب تو نہیں، لیکن دو ایک دن میں دیکھ کر بھیج دونگی۔

بیگاں۔ (اٹھتے ہوئے) بچے جئیں سرکار، آپ ہی کا آسرا ہے ..... سلام!

(چلی جاتی ہے)

ریاض۔ یہ ڈھوڈا کیا بلا ہے۔

ذکیہ۔ مکئی کی روٹی کو ادھر ڈھوڈا کہتے ہیں۔

ریاض۔ (قہقہہ لگا کر) لاحول ولاقوت — کیا نام رکھا ہے مکئی کی روٹی کا۔

(مجی بھاگا آتا ہے)

مجی۔ امی۔

www.taemeernews.com

(نستو اس کے پیچھے بھاگی آتی ہے)

نستو۔ امی

(اس کے دامن سے لپٹتی ہے)

ذکیہ۔ اس کے میلے ہاتھوں سے دامن بچاتے ہوئے) ار.... رے.... رے کہو بھی۔

مجی۔ (نستو کے ساتھ امی کو گھیرتے ہوئے) پیسے دو، ریوڑیاں لیں گے۔

ذکیہ۔ (اچانک ضبط کو ہاتھ سے دیکر) سارا دن تمہیں چرنے کے سوا.....(پھر سنبھل کر)..... اچھا اچھا لو پیسے اور میرا پنڈا چھوڑو۔

(دونوں چلنے کو ہوتے ہیں)

— اور اپنے ابی سے کہو نستو آجائیں، ذرا گھما لائیں تمہارے ماموں جان کو بیگاں کے باغ تک۔

مجید۔ (جاتے جاتے) دفتر میں آدمی بیٹھے ہیں۔

نستو۔ (جاتے جاتے) میں نے پوچھا تھا، وہ نہ آئیں گے۔

(بالکونی میں غائب ہو جاتے ہیں)

ذکیہ۔ چلو ریاض، بیگاں کے باغ تک گھوم آئیں، تمہیں ذرا یہاں کے گاؤں دکھا لاؤں۔

ریاض۔ چلو۔

ذکیہ۔ ٹھہرو میں ذرا برقعہ اوڑھ لوں۔

ریاض۔ برقعہ۔

ذکیہ۔ یہ کوئی ماڈرن شہر تو ہے نہیں، قصبہ ہے پرانے زمانے کا۔

(الماری سے نکال کر برقعہ پہنتی ہے ریاض حیران کھڑا دیکھتا ہے۔ پردہ گرتا ہے۔)

چوتھا منظر

(شام کے وقت اسی کمرے میں)

(سورج شاید ابھی ابھی غروب ہوا ہے، اگرچہ اندر کمرے میں خاصا اندھیرا چھا رہا ہے لیکن دائیں طرف کی کھڑکی میں ابھی تک جاتی ہوئی شام کی روشنی جھلک رہی ہے۔

کمرے میں سب کچھ قریب قریب وہی ہے جو تیسرے منظر میں، صرف آنگن کے دروازے کے برابر دیوار کی کھونٹی میں ایک لالٹین لٹک رہی ہے جس کا شیشہ سیاہ ہو رہا ہے۔

پردہ اٹھنے کے کچھ لمحے بعد ذکیہ اور ریاض داخل ہوتے ہیں۔ ذکیہ برقعہ کو اتارتی ہوئی آتی ہے)

www.taemeernews.com

ذکیہ۔(برقعے کو اتار کر چارپائی پر پھینکتے اور خود بھی اس میں دھنستے ہوئے) کتنا لطف آیا اس سیر میں۔

(سکھ کا لمبا سانس لیتی ہے)

ریاض۔(کرسی پر بیٹھتے ہوئے) نہ جانے کتنے عرصے کے بعد یہ حسین شام میسر ہوئی ہے۔

ذکیہ۔یہی میں کہنے والی تھی۔

ریاض۔میں کہتا ہوں ذکیہ یہ دیہاتی کتنے سادہ لوح، کتنے مہمان نواز ہیں۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوا جیسے میں کسی قدیم اور پرانی بستی میں پہنچ گیا ہوں (کرسی پر پیچھے کو لیٹ جاتا ہے) جہاں انسان نے شیطان ہونا نہیں سیکھا اور جہاں زندگی کی پاکیزہ ندی چھل کپٹ کی آلائشوں سے پاک اپنے کناروں میں مست بہ رہی ہے۔

ذکیہ۔سارد گرد ایسے بیسیوں گاؤں ہیں۔میں شروع شروع میں جایا کرتی تھی، لیکن اب تو جیسے خواہش ہی نہیں ہوتی، ایک عجیب طرح کی بے حسی چھائی رہتی ہے۔

ریاض۔(اٹھ کر اپنے اضطرار اور اس خوبصورت فضا سے پیدا ہونے والے رومانی جذبے کے زیر اثر) تمہارے اردگرد کتنی خوبصورتی ہے۔

(کھڑکی میں جا کھڑا ہوتا ہے)

ذکیہ۔لیکن قفس کے اندر وہی کلھیا کا دانا پانی۔

ریاض۔(مڑکر) پھر وہی مایوسی! ذکیہ تم فلسفی بن گئی ہو، خوبصورتی کو بھول گئی ہو۔میں یہیں رہونگا نہیں پھر سے اس خوبصورتی، اس لافانی حسن سے محظوظ ہونا سکھاؤنگا۔کتنا حسن ہے تمہارے اردگرد۔ اطہر، پاکیزہ، غیر فانی حسن —— ابھی کچھ لمحے پہلے میں نے جو منظر دیکھا۔وہ مدتوں میرے دماغ سے محو نہیں ہو سکتا۔

ذکیہ۔(چارپائی پر لیٹتے ہوئے) کونسا منظر!

ریاض۔شام کے سایوں اور دھندلکوں کے غلاف میں لپٹی ہوئی نیلاہٹ آہستہ آہستہ وشنو دیوی کے پہاڑ پر نیچے سے اوپر کو اٹھ رہی تھی۔دیکھتے دیکھتے سارے کے سارے پہاڑ پر نیلی نیلی دھند کا غلاف چڑھ گیا۔ صرف چوٹی پر نیلی سی روشنی رہ گئی۔شاید وہ ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری مسکراہٹ تھی۔

ذکیہ۔اگر تم صبح دریا پہ جاؤ تو وشنو دیوی کی ان نیلاہٹوں کو نیچے اترتے دیکھو گے اور پہاڑ کی چوٹی پر تمہیں طلوع ہوتے ہوئے سورج کی پہلی مسکراہٹ دکھائی دے گی۔لیکن میں ان کی عادی ہو گئی ہوں، میرے لئے ان میں کوئی نیا پن نہیں۔

ریاض۔کوئی نیا پن نہیں، یہ تم کہتی ہو! اور پھر 'فلسفی' کے نام سے تمہیں چڑ ہوتی ہے —میں اگر اس منظر کو اسی صورت میں قیامت تک دیکھتا رہوں تو نت نئے دن مجھے اس میں نیا لطف حاصل ہو۔اسوقت جب میں اس نالے کے سفید و سیاہ پتھروں پر کھڑا تھا اور دھندیالی نیلاہٹوں نے نزدیک کے پہاڑوں

www.taemeernews.com

کو اپنے دامن میں لے لیا تھا اور دور برفانی پہاڑوں پر ڈوبتے ہوئے سورج کی کیسری چمک اقلیدس کی عجیب و غریب شکلیں بناتی ہوئی چاروں طرف سے بڑھے آنے والے، ان وسیع و بے کنار دھندلکوں میں گم ہو گئی تھی، مجھے ایسا محسوس ہوا تھا، جیسے میں اس مادی دنیا سے اوپر بہت اوپر اٹھ گیا ہوں۔ میرے دل کی ساری غلاظت دھل گئی ہے، تکلیف، دکھ، اذیت، غم، اب مجھے نہ چھو پائیں گے اور اس وقت میں سچ کہتا ہوں ذکیہ، اس وقت مجھے اس عظیم، لامحدود، لاشریک ہستی کے قرب کا احساس ہوا تھا۔ اس وسعت و رفعت کا تو ایک کونا بھی برسوں میں نہیں جانا جا سکتا۔ یہ کہیں پرانی ہو سکتی ہے۔

ذکیہ۔ (ہنس کر اٹھتے ہوئے) شاید نئے اور پرانے کی تمیز ہی مجھے نہیں رہی، کتنا اندھیرا ہو رہا ہے۔ یہاں ان کمبختوں نے ابھی تک دیا نہیں جلایا (بالکونی پر جا کر) رحیمن..... رحیمن..... (پھر جیسے اپنے آپ) وہ بھی نہ جانے کیوں ابھی تک نہیں آئے، سیر کو نہ چلے گئے ہوں۔ تمہاری اس شاعری میں میں تو لیمپ جلانا ہی بھول گئی۔

(ہنستی ہوئی کھونٹی سے لیمپ اتار کر طاق
سے دیا سلائی اٹھا کر اسے روشن کرتی ہے۔)

— چمنی تک نہیں صاف کی کمبختوں نے، اور بتی، معلوم ہوتا ہے جیسے برسوں سے نہیں کٹی (پھر بالکونی پر جا کر اور بھی زور سے رحیمن کو آواز دیتی ہے) رحیمن!..... رحیمن!

رحیمن۔ (بھاگی آتی ہے) جی..... جی بیگم!

ذکیہ۔ یہ لیمپ صاف نہیں کیا۔

رحیمن۔ سلطان سے پوچھ لو بیگم، میں نے تو بڑی اچھی طرح صاف کر کے جلایا تھا۔ شاید بجھ گیا۔

ذکیہ۔ بتی نہیں کاٹی۔

رحیمن۔ میں نے کوشش کی تھی، لیکن یہ مجھ سے ٹھیک نہیں ہوتی۔

ذکیہ۔ وہ قینچی اٹھا لا۔

(رحیمن طاق سے قینچی اٹھا لاتی ہے)

— (قینچی لیتے ہوئے) نسو کے ابا کہاں ہیں؟

رحیمن۔ جی وہ آئے تھے، لیکن آپ تو گئے ہوئے تھے۔ اس لئے شاید وہ بھی سیر کو نکل گئے۔

ذکیہ (چمنی کو صاف کرتے اور بتی کاٹتے ہوئے) تم تو بجلی کی چکاچوند کے عادی ہو، یہاں تو لالٹینوں کی روشنی ہے، جو اس تاریکی کو اور بھی گہرا کر دیتی ہے۔

ریاض۔ دل کی تاریکی تو بجلی کے قمقمے بھی نہیں دور کر سکتے، لیکن میں تاریکی سے مانوس ہوں ذکیہ، کبھی کبھی مجھے

www.taemeernews.com

محسوس ہوا کرتا ہے، جیسے میں اس تاریکی کے پردوں کو کبھی نہ چیر سکونگا، لیکن پھر کتنی ہی یادیں اپنی روشن مشعلیں لئے ہوئے آجاتی ہیں، یہ تاریکی آئینے کی طرح چمک اٹھتی ہے۔ اور میں اس میں اپنے سپنے دیکھنے لگتا ہوں۔

ذکیہ۔ (لیمپ کو کھونٹی سے لٹکاتے ہوئے) تم اب بھی سپنے دیکھتے ہو۔

ریاض۔ میں جس دن سپنے نہ دیکھونگا مر جاؤنگا۔

ذکیہ۔ توبہ تو بہ کیسی باتیں کرتے ہو۔

(اس کے منہ پر ہاتھ رکھنا چاہتی ہے، لیکن ہاتھ
تیل والے ہیں۔ اس لئے رحیمن کو آواز دیتی ہے)

— رحیمن ذرا پانی اور صابن لانا۔

ریاض۔ ابھی کل رات مجھے ایسا محسوس ہوا تھا ذکیہ جیسے یہ تاریکی اپنی پوری جمعیت کے ساتھ مجھ پر حملہ کرنے آئی ہے، جیسے یہ میرے سارے سپنوں کا گلا گھونٹ دے گی۔ لیکن میں بھاگ کر یہاں تمہارے پاس آگیا اور اس وقت میں محسوس کر رہا ہوں، جیسے اس لالٹین کی روشنی میں، میرے دل کا تاریک سے تاریک گوشہ منور ہو اٹھا ہے۔

(رحیمن پانی لاتی ہے اور ذکیہ صابن سے ہاتھ دھوتی ہے)

— تم اس روشنی کو حقیر خیال کرتی ہو، ذکیہ تم نے اپنے آپ کو نہیں پہچانا۔

(رحیمن چلی جاتی ہے)

ذکیہ۔ (تولیے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے) پہچانا۔ میں خود کئی بار ایک اتھاہ تاریکی میں بھٹکتی رہتی ہوں۔ کبھی کبھی مجھے معلوم ہوتا ہے، جیسے یہ تاریکی مجھے، میرے ارمانوں، آرزوؤں، سپنوں، یادوں سب کو نگل جائے گی اور میں اس نعش کی طرح پڑی رہ جاؤں گی جس کا تمام خون کسی آسودہ نہ ہونے والی جونک نے چوس لیا ہو (لمبا سانس بھرتی ہے) لیکن تم نے سچ کہا، آدمی تاریکی سے بھی مانوس ہو جاتا ہے اور جہاں پہلے تاریکی اس کا خون چوستی ہے، وہ تاریکی ہی سے خون حاصل کرتا ہے۔

ریاض۔ (اچانک اسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر) خدا قسم ذکی تم شاعر ہو، تم زبردست شاعر ہو، نہ جانے کونسے خیالات۔ تمہارے دل کے نہاں خانے میں مدفون، اظہار کا انتظار کر رہے ہیں۔

ذکیہ۔ (مسرت سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے) میں خود محسوس کرتی ہوں جیسے میں ایک دم گا اٹھونگی۔ جذبات کا ایک طوفان سا میرے دل میں مچل اٹھا ہے، نہ جانے یہ تمہاری ہی آمد کا منتظر تھا، تم رہو تو شاید یہ طوفان لفظوں اور سطروں کی شکل اختیار کرے۔

ریاض۔ میں ضرور رہونگا ذکیہ۔

www.taemeernews.com

ذکیہ۔ لیکن نجمہ۔

ریاض۔ نجمہ ـــ وہ مجھے فضول ہی اڑائے پھر رہی ہے۔ اور کبھی کبھی میں کسی ایسے ہلکے پھلکے سے خیالی بادل سا محسوس کرتا ہوں، جو فضائے آسمانی میں ہوا کے جھونکوں سے بیسود، بے مطلب کبھی ادھر اڑتا ہے کبھی اُدھر، لیکن اب میں زیادہ نہیں اڑونگا۔ ایک بھری، جمی گھٹا کی طرح ٹک کر بیٹھ جاؤں گا، نجمہ اب مجھے اور نہیں اڑا سکتی، میں اس سے دامن چھڑا کر بھاگ آیا ہوں، میری روح آزادی چاہتی ہے، بالیدگی چاہتی ہے۔ پرواز چاہتی ہے۔

(باہر آنگن میں کوئی کنڈی کھٹکھٹاتا ہے)

ذکیہ۔ کون؟

(پھر دستک کی آواز آتی ہے)

ـــ (بالکونی پر جاکر) رحیمن، دیکھو کون ہے۔

رحیمن۔ (جو ادھر ہی آرہی ہے بائیں دروازے سے) ایک لڑکی ہے بیگم، جموں سے آئی ہے، ریاض میاں کو پوچھ رہی ہے!

ریاض۔ (گھبرا کر) نجمہ نہ ہو!

ذکیہ۔ گھبرا کیوں گئے، میں جاکر انہیں لے آتی ہوں۔

(بالکونی کے بائیں دروازے میں نجمہ آتی ہے)

ریاض۔ لانے کی ضرورت نہیں، وہ خود ہی آرہی ہے۔

ذکیہ۔ آجایئے آجایئے۔

(نجمہ اندر آتی ہے ـــ پڑھی لکھی فیشن ایبل لڑکی جس کے حسن کا شعلہ میک اپ کا مرہونِ منت ہے)

ـــ (نجمہ کے لئے کرسی پیش کرتے ہوئے) تشریف رکھئے۔

نجمہ۔ (نہیں بیٹھتی اور ریاض کی طرف دیکھ کر شرارت سے مسکراتی ہے) آداب عرض!

ریاض۔ (کھسیانی سی ہنسی کے ساتھ) تم دونوں کو ایک دوسرے سے متعارف کرنے کی ضرورت تو نہیں

نجمہ۔ جی نہیں (ذکیہ سے) میں نجمہ ہوں، اور آپ کو میں جانتی ہوں۔

ذکیہ۔ بڑی مہربانی کی آپ نے (کچھ گھبرا کر) نہ جانے وہ آج کہاں چلے گئے ہیں (نجمہ سے) آیئے، ادھر تشریف رکھئے، وقت تو نہیں ہوئی آپ کو سفر میں۔

نجمہ۔ (ریاض کی طرف دیکھ کر شرارت سے مسکراتے ہوئے) نہیں آپ کی دعا سے پہنچ ہی گئے ہیں۔

ذکیہ۔ کہیئے چائے پئیں گی یا دودھ۔

www.taemeernews.com

نجمہ۔ آپ تکلیف نہ کیجئے۔
ذکیہ۔ (مصروف ہوتے ہوئے) اس میں تکلیف کی کونسی بات ہے۔ میں ابھی لائی، آپ ذرا تشریف رکھئے
نجمہ۔ آپ تردد نہ کیجئے، (ملائمت سے) دودھ میں پیتی نہیں اور چائے کا وقت نہیں اور پھر ہمیں ابھی جانا ہے۔
ذکیہ (جاتے جاتے رک کر) بھلا یہ بھی کوئی وقت ہے جانے کا، اب تو کوئی لاری بھی نہ جائے گی۔
نجمہ۔ ہم کار پہ آئے ہیں۔
ذکیہ۔ تو بھئی چائے تو پیتے جایئے، ہمارے تو کھانا کھانے کا وقت ہوگیا ہے۔
نجمہ۔ کھانا تو ہم ذرا دیر سے کھاتے ہیں۔
ذکیہ۔ میں جانتی ہوں، اسی لئے صرف چائے کے لئے کہہ رہی ہوں، بیٹھئے، میں ابھی آتی ہوں۔ رحیمن... رحیمن.....

(چلی جاتی ہے)

نجمہ۔ ریاض!
ریاض۔ (چپ رہتا ہے)
نجمہ۔ بڑے ظالم ہو، یہاں بھاگ کر آ بیٹھے ہو، اور تمہیں اس بات کا ذرہ بھر بھی خیال نہیں، کہ تمہاری وجہ سے اتنے آدمیوں کو پریشانی اٹھانا پڑے گی، تمہارا لاابالی پن کبھی نہ جائیگا، تم کبھی ذمہ داری نہ سیکھو گے۔
ریاض۔ (چپ رہتا ہے)
نجمہ۔ اگر تمہیں یہیں آکر بیٹھنا تھا تو وہاں سے چلے کیوں تھے (جواب کے لئے رکتی ہے، ریاض جواب نہیں دیتا) اب اٹھو، صبح ہمیں سرینگر کے لئے چلدینا ہے، رات پہلی بار برف پڑی ہے، یہی وقت ہے برفباری دیکھنے کا۔
ریاض۔ مجھے کہیں نہیں جانا نجمہ، میں یہیں دور سے برف گرتے دیکھ لونگا۔
نجمہ۔ پاگل ہو، یہاں سے تم (کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) کیسے برف گرتے دیکھ سکتے ہو۔
ریاض۔ میں سامنے کے پہاڑوں پر برف کی تہوں کو گہرا ہوتے ہوئے دیکھونگا۔
نجمہ۔ (ہنستی ہے) تم بالکل بچے ہو، اب اٹھو، پریشان نہ کرو، میں رات بھر سو نہیں سکی۔
ریاض۔ میں ہی کب سو سکا ہوں۔
نجمہ۔ تم تو یہاں آکر ذکیہ کی گود.....
ریاض۔ (اٹھ کر) نجمہ!

www.taemeernews.com

نجمہ۔ ذکیہ اپنی بہن کی گود میں آ بیٹھے ہو اور میں تمہارے انتظار میں......
ریاض۔ نجمہ جاؤ، اب مجھے کچھ لمحوں کے لئے آرام کا سانس لینے دو! تم نے مجھے بہتیرا ستایا۔
(پھر ضدی بچوں کی طرح بیٹھ جاتا ہے)
نجمہ۔ (گلے میں نمی ہے) ریاض!
ریاض۔ (چپ رہتا ہے)
نجمہ۔ تم مجھے ستا رہے ہو یا میں؟
ریاض۔ جاؤ! تم دیکھ آؤ آسمان سے برف گرتے، میں نے اولے گرتے دیکھے ہیں۔
نجمہ۔ ان باتوں سے حاصل! چلو یہاں سے، تمہیں یہاں نہ آنا چاہیئے تھا، تمہیں برابر اس دن کی یاد ستائے گی، جب تم نے پہلی بار اولے گرتے دیکھے، تم رہو گے تو اس گھر کی پرسکون فضا میں بھی شور الا پیدا ہونے لگے گی ـــ چلو میرے ساتھ، برف کے نرم و نازک روئی کے گالوں کو گرتے ہوئے دیکھو!
ریاض۔ میں جاؤں گا تو تمہارا لطف بھی کرکرا کر دوں گا، مجھ سے تمہاری باتیں نہ سہی جائیں گی۔ ہم پھر لڑنے لگیں گے۔
نجمہ۔ تم مذاق مذاق میں روٹھ جاتے ہو۔
ریاض۔ مذاق مذاق میں فرق ہوتا ہے، میں ذکیہ کی اتنی عزت کرتا ہوں.....
نجمہ۔ تو تم نے میرے اور سراج کے متعلق اتنی سچی جھوٹی باتیں کہہ کر بدلہ تو لے لیا، تم نے وہ وہ باتیں کہیں کہ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو میں اسے زندگی بھر معاف نہ کرتی۔ (لمبا سانس بھرتی ہوئی ہنستی ہے) لیکن نہ جانے کیوں ریاض، تمہاری گالیوں کا بھی مجھ پر الٹا اثر ہوتا ہے۔
ریاض۔ میں نے تمہیں گالیاں دیں۔
نجمہ۔ گالیاں اور کیسی ہوتی ہیں۔
ریاض۔ اور تم نے جو مجھ سے کہا کہ ذکیہ.....
نجمہ۔ اب ہٹاؤ، اس تلخ بحث کو نئے سرے سے شروع نہ کرو، تم جیتے میں ہاری، میں تم سے ہمیشہ ہار جاتی ہوں۔
ریاض۔ اس میں ہار جیت کا سوال نہیں۔
نجمہ۔ میں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتی ہوں، میں خود ذکیہ بہن کی عزت کرتی ہوں ـــ میں نے صرف یہی کہا تھا کہ ان سب باتوں کے بعد، جو تم ہی نے مجھے سنائیں، تمہیں الھنور نہ آنا چاہیئے تھا۔
ریاض۔ میں جموں تک آ کر اسے ملے بغیر چلا جاتا۔
نجمہ۔ خیر ہ ایسی پہ خواہ تم برس بھر کے لئے یہاں بیٹھے رہنا، لیکن اب سارے کا سارا پروگرام خاک

www.taemeernews.com

میں نہ ملاؤ، دیکھو مجھے مایوس نہ کرو، وہ ذکیہ آ رہی ہے، کہو تو میں اس سے بھی معافی مانگ لوں ۔
(قدرے زور سے) ذکیہ بہن!

(ذکیہ آتی ہے)

ریاض۔ (سرگوشی میں) نجمہ ــــ؟
ذکیہ۔ کہئے آپ نے مجھے آواز دی۔

(ذکیہ کے پیچھے پیچھے ہی احسان اور ان کے
پیچھے سرور، عقیل، نعیم وغیرہ بالکونی پر آتے ہیں۔)

احسان۔ تم ذرا پردے میں ہو جاؤ بیگم (اُن لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے) آجایئے صاحب۔ آجایئے۔

(نسو اور مجی باہر سے بھاگے آتے ہیں۔ اور امی
امی، کہتے ہوئے ذکیہ کا دامن پکڑ لیتے ہیں۔)

ذکیہ۔ (دانت پیستے ہوئے سرگوشی میں) کہاں سے آتے ہو خاک چھانتے، کپڑے تو دیکھو کیسے میلے ہو رہے ہیں، ہٹو، دیکھو کون آئے ہیں؟
مجی۔ ہم ابا کے ساتھ سیر کرنے گئے تھے۔

(ذکیہ دامن چھڑا کر برابر کے کمرے میں چلی جاتی
ہے، سرور، نعیم، عقیل وغیرہ اندر آتے ہیں۔)

نعیم۔ (اندر داخل ہوتے ہی) ارے تم یہاں آکر بیٹھ گئے۔ اور ہم صبح سے تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ عجیب چغد ہو تم!
سرور۔ صبح صبح ہمیں سرینگر کے لئے چل دینا ہے اور تم یہاں ایسے بیٹھے ہو گویا اب یہیں کٹیا بساؤ گے۔
عقیل۔ ہم لوگوں کو تو پھر کال بھی جانا ہے تم تو آزاد ہو، تمہارا کیا ہے، پھر آکر یہاں دھونی رما لینا۔
ریاض۔ مجھے کہیں نہیں جانا، میں اب یہیں رہونگا۔
نجمہ۔ سمجھایئے ذرا انہیں عقیل صاحب۔
نعیم۔ (عقیل کو پیچھے ہٹاتے ہوئے) ارے ہٹاؤ، عقیل انہیں کیا سمجھائیں گے۔ ان حضرت کے کپڑے کہاں ہیں؟ (نسیمہ سے) کیوں بیٹا، تمہارے ماموں جان کے کپڑے کہاں ہیں؟
نسو۔ (جواب نہیں دیتی۔)
ریاض۔ نعیم تنگ نہ کرو۔
سرور۔ گویا ہم تنگ کر رہے ہیں۔
نعیم۔ (نسو کو گود میں اٹھا کر) کیوں ننھی کیا نام ہے تمہارا۔

www.taemeernews.com

مجی۔ (آگے بڑھ کر) اس کا نام نسّو ہے اور میرا مجی۔
نعیم۔ (نسّو کو اتار کر اور مجی کو اُٹھاتے ہوئے) کیوں مجی میاں، تمہارے ماموں جان کہاں ٹھہرے ہیں؟
مجی۔ اُوپر بارہ دری میں۔
نعیم۔ چلو ہمیں ذرا دکھاؤ تو بارہ دری، تمہیں مٹھائی لے دیں گے۔
نسّو۔ (مٹھائی کے نام پر آگے بڑھ کر) میں چلوں گی۔
مجی۔ (گود میں مچل کر) نہیں میں چلوں گا۔
نعیم۔ (بالکونی کی طرف بڑھتے ہوئے) آؤ..... آؤ..... تم دونوں آؤ۔ (جاتے جاتے نجمہ سے) تم ذرا ذکیہ بہن سے معافی مانگ آؤ۔

(دونوں کو ساتھ لیکر چلا جاتا ہے، نجمہ
برابر کے کمرے میں چلی جاتی ہے۔)

سرور۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانا کرتے، یہ فباری کی خوبصورتی اور تازگی کا نقشہ کھینچ کھینچ کر اتنی دور سے ہمیں یہاں گھسیٹ لائے حضرت اور خود یہاں آ بیٹھے ہیں، بھلا کس کے پاؤں میں کھجلی ہوئی تھی جو اس سردی میں اس سفر کو نکلتا۔
احسان۔ لیکن صاحب، میں کہتا ہوں۔ آپ اس وقت کہاں جائیں گے؟ میرا خیال ہے آج رات آپ یہیں قیام کریں۔
سرور۔ آپ کا بہت بہت شکریہ بھائی جان، لیکن ہمیں صبح چل دینا ہے، دو ایک دن سرینگر ٹھہر کر پھر واپس ملیگڈھ پہنچنا ہے، ان دو ایک دنوں میں گلمرگ بھی دیکھنا ہے۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔
ریاض۔ (کرسی سے چپکتے ہوئے) تو بھئی آپ لوگ جائیں، میں اگر نہ جاؤں گا تو کیا برف گرنا چھوڑ دے گی میں ذرا سکون چاہتا ہوں اور یہ جگہ مجھے پسند ہے۔
سرور۔ تمہیں کچھ بھی پسند نہیں اور سب کچھ پسند ہے، دو دن میں اس سکون سے بھی اکتا جاؤ گے اور ان ہلچلوں کی یاد ستانے لگے گی۔
احسان۔ میں کہتا تھا آپ ریاض میاں کو تو.....
عقیل۔ آتے آتے چھوڑ جائیں گے۔
احسان۔ لیکن صاحب اس وقت تو اندھیرا ہو گیا ہے۔ اور میں نے سنا ہے کہ نہر کی پٹڑی ٹھیک نہیں
عقیل۔ ہم آرام سے چلے جائیں گے، آپ فکر نہ کریں۔

(نعیم ریاض کا سوٹ اور ٹائی اٹھائے ہوئے آتا ہے)

نعیم۔ لو بھئی سوٹ تو اٹھا لایا ہوں، اب اٹھاؤ ان حضرت کو، دیر ہو رہی ہے، وہ سب لوگ انتظار کر رہے ہونگے۔

www.taemeernews.com

(سرور ریاض کو ہاتھ پکڑ کر اٹھاتا ہے۔)

ریاض۔ (کرسی سے چپکتے ہوئے) میں کہتا ہوں.....

عقیل۔ (ریاض کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر پیچھے سے دھکیلتے ہوئے) تمہیں جو کہنا ہے، راستے میں کہنا۔

ریاض۔ (پھر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے) ارے بھئی.....

سرور۔ (گھسیٹتے ہوئے) وہاں چل کر۔

ریاض۔ مجھے ذکیہ سے تو رخصت ہو لینے دو۔

نعیم۔ (زور سے) آپا انہیں معاف کر دیجئے گا۔ ہم انہیں زبردستی لئے جا رہے ہیں۔ لیکن اس میں ہمارا قصور نہیں، یہی حضرت ہمیں وہاں سے گھسیٹ کر لائے تھے۔

(ریاض کو گھسیٹ کر لے جاتے ہیں، مجی اور نسو ہنستے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے جاتے ہیں، احسان صاحب بھی مجبوراً ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ نجمہ اندر کے کمرے سے آتی ہے)

نجمہ۔ چلو میں ذکیہ بہن سے معافی مانگ آئی ہوں۔

نعیم (سوٹ کندھوں پر رکھ کر چلتے ہوئے احسان سے) یہ بدتہذیبی معاف کیجئے گا بھائی جان۔ لیکن دوسرا چارہ نہ تھا۔ ارے..... اے..... آپ ٹھہریئے، آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں۔

احسان۔ (لیمپ لیکر ساتھ چلتے ہوئے) نہیں نہیں تکلیف کیسی، نیچے تک تو چھوڑ آؤں، سیڑھیوں میں ذرا اندھیرا ہے۔

ریاض۔ (پورے زور سے بالکونی کے بائیں دروازے میں رک کر) ارے بھئی مجھے کپڑے تو بدل لینے دو

سرور۔ کپڑے تم جیل جا کر بدلنا، کل ہم یہاں بھجوا دیں گے۔

ریاض۔ (انتہائی مجبوری سے جاتے جاتے) ذکیہ بھئی میں پھر آؤں گا۔ یہ لوگ بڑے ظالم ہیں میری کوئی پیش نہیں چلنے دیتے۔

(سب کے سب چلے جاتے ہیں۔ کمرے میں شام کی بہت ہلکی سی روشنی ہے۔ کچھ لمحے بعد اندر کے کمرے سے ذکیہ نکلتی ہے، جا کر کچھ دیر کھڑکی میں حسرت بھری نظر سے دیکھتی رہتی ہے، پھر آ کر گرتی ہوئی دیوار کی طرح چارپائی پر لیٹ جاتی ہے۔ کچھ لمحے بعد مجی اور نسو خوش خوش داخل ہوتے ہیں)

مجی۔ (نسیمہ کو دکھا کر) دیکھو جی ہمارے پاس کیا ہے؟ —— اٹھنی —— ہمیں ماموں جان نے دی ہے۔

نسو۔ (مجی کو دکھا کر) ہمارے پاس روپیہ ہے، ہمیں بھی ماموں جان نے دیا ہے۔

مجی۔ (اٹھنی کو ایک ہاتھ سے پیٹھ پیچھے کرتا ہوا) روپیہ؟ دکھاؤ تو!

نستو۔ نہیں دکھاتے۔
مجی۔ ذرا دور سے دکھا دو۔
نسیمہ۔ (ذرا دور سے) یہ دیکھو۔

(نستو روپیہ دکھاتی ہے اور مجی جھپٹ کر اس سے چھین لیتا ہے۔)

مجی۔ (ہاتھ کو گھما کر جھوٹ موٹ روپیہ خلا میں پھینکتے ہوئے) وہ گیا پھر ر ر ر ر

نسیمہ۔ (رونے لگتی ہے) میرا روپیہ، ہائے میرا روپیہ (وہیں زمین پر بیٹھ کر ایڑیاں رگڑتی ہے) ہائے میرا روپیہ ۔۔۔ امی ۔۔۔ (پھر اچانک اٹھ کر دھڑا دھڑ مجی کو پیٹتے ہوئے) میرا روپیہ، دے میرا روپیہ ۔۔۔ دے ۔۔۔ دے۔

مجی۔ (جواب میں پیٹتا ہے) پھر پیٹے گی ۔۔۔ لے ۔۔۔ یہ لے ۔۔۔ یہ لے۔

ذکیہ۔ (اٹھ کر چیختے ہوئے) نستو، مجی، کیا ہو گیا ہے تم دونوں کو (زور سے دو طمانچے دونوں بچوں کے جڑ دیتی ہے) سارا دن لڑتے رہتے ہو تم!

(بچوں کو پیٹتے پیٹتے رونے لگتی ہے اور پھر سسکتی ہوئی اندر کمرے میں چلی جاتی ہے ۔۔۔ ہاتھ میں لالٹین لئے احسان صاحب داخل ہوتے ہیں)

احسان۔ (بالکونی ہی سے) نستو کی اماں.... نستو کی اماں ۔۔۔ (اندر آکر) نستو کی اماں۔ (بچوں کو سہمے ہوئے دیکھ کر) کہاں ہیں تمہاری اماں۔

مجی۔ (ابا کے گھٹنوں سے چمٹ کر زور زور سے رونے لگتا ہے) اندر کمرے میں ہیں۔

(احسان صاحب اندر کمرے میں جاتے ہیں، جھٹ ہی سے ان کی آواز سنائی دیتی ہے۔)

احسان۔ ذکیہ...... ارے بات کیا ہے...... رو کیوں رہی ہو...... ذکیہ...... ذکیہ۔

(مجی کو اٹھا کر جلدی سے اندر جاتے ہیں)

(پردہ ایک دم گرتا ہے۔)

www.taemeernews.com

راجندر سنگھ بیدی

آگ

اسن سول ابھی بہت دور تھا۔ یہی کوئی سات ایک میل کے قریب۔

سات میل کا فاصلہ کوئی بڑا فاصلہ نہیں ہوتا۔ لیکن اس دھان پاتی کے لئے جو پہلے ہی ٹوٹ چکا ہو یہ فاصلہ ایک خاصی منزل کے برابر ہے۔ اپنے من من کے پاؤں سمیٹ کر اوتن اونٹ کے کجاوے کی طرح تاڑ کے نیچے بیٹھ گیا۔ تاڑ اس علاقے میں بیشمار تھے۔ جدھر دیکھو، تاڑ ہی کے درخت نظر آتے تھے۔ اور ان کے چھالوں سے اپنے آپ جھاگ پھوٹ رہی تھی۔

کچھ دور سڑک کے پاس خاکستری زمین پر کوئلوں کے دھبے سے نظر آتے تھے۔ یہ کوئلوں کے گڑھے تھے جو اب بیکار ہو گئے تھے۔ ان گڑھوں کو ملاتی ہوئی سڑک اسن سول کی طرف جا رہی تھی۔ ہر آدھ پون گھنٹے کے بعد اس سڑک پر کوئی گاڑی آ کر رکتی۔ اور پھر آس پاس کے جھونکوں سے بے خبر چل دیتی۔ "ٹھہرو دادا، رک جاؤ دادا......" اوتن پورے زور سے چلاتا۔ اور پھر عاجز آ کر کجاوے پالان کی طرح دہرا تہرا ہو کر تاڑ کے نیچے جا پڑتا۔ اور زبان کی نوک سے پسینہ چاٹنے لگتا...... دور...... دور...... جہاں زمین آسمان سے ملتی نظر آتی تھی۔ وہ ایک باڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ جن کے ساتھ اوس کی فصل چودھری چودھری بوڑھے کے دانتوں کی طرح میلی میلی اگ رہی تھی۔ فاقوں مارے لوگوں نے اوس کی پیلی پیلی کمزور بالیاں نوچ لی تھیں اب ان میں کچھ بھی نہ تھا۔ بلکہ اس مہاماری سے بہت پہلے ہمالیہ پھاند کر منگری نور سے آنے والے جانوروں نے کھیر لیل تک سے دھان ٹھونگ لیا تھا۔

اب دھان پاتی مرتے ہوئے جانوروں کی ہڈیاں اُبال رہے تھے۔ وہ اور کیا کرتے؟

تھوڑی دیر کے بعد پھر ایک جھنجھناہٹ سی سنائی دی۔ اور ایک لاری آ کر رُکی۔

"رک جاؤ...... رک جاؤ...... ٹھہرو..." اوتن چلایا..." ٹھہرو!"

پھر اوتن نے کالی کا واسطہ دے کر گاڑی کو روکنا چاہا۔ لیکن ایک دم اس کے دماغ نے فیصلہ کر لیا۔ کہ اب کالی کا واسطہ بیکار ہے۔ اس مہاماری کے سامنے کالی اور بھگوان دونوں بے بس ہیں۔ کالی اور بھگوان ظالم اور

www.taemeernews.com

مظلوم دو قوموں میں تقسیم ہو کر رہ گئے ہیں۔ اوتن نے اپنا واسطہ دینا چاہا۔ لیکن اسے کیا غرض تھی۔۔۔۔۔ چپ رہا

ڈرائیور نے فرار دسن لی تھی۔ اس نے کھڑکی میں سے سر نکال کر پوچھا۔۔۔ "کہاں جاؤ گے؟ اس سوال، کیا دو گے اس سوال کا؟"

اوتن نے ایک ہی سانس میں کہا۔ "جو کچھ میرے پاس ہے دے دوں گا۔ تمہارا غلام رہوں گا۔ ساری عمر تمہارا غلام رہوں گا۔ ساری عمر۔۔۔۔۔" اور پھر وہ ہانپنے لگا۔

ڈرائیور تھوڑی دیر کے لئے رکا۔ موبل آئل گاڑی سے نیچے ٹپک رہا تھا۔ نیچے اتر کر اس نے انجن کا ڈھکنا اٹھایا۔ موبل آئل گیج کو ٹینک میں داخل کیا۔ اور بولا۔ "کافی ہے' کافی۔۔۔۔" پیچھے سے اس کے ساتھی نے آواز دی۔۔۔ "نسیبو کی جان کو روپے ہو دادا؟" ڈرائیور نے پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں۔" اور پھر اوتن کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔۔۔۔ "ساری زندگی کی مصیبت کون مول لے۔ نکد کیا دو گے؟ بولو کتنے روپے دو گے؟"

اوتن نے جلدی سے ہاتھ جیب کے اندر ڈالا۔ اور جیب سمیت نقدی کو باہر لے آیا۔ ایک روپے کا بوسیدہ سا نوٹ تھا۔ اور کچھ سکے۔ ڈرائیور بات کئے بغیر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اوتن اپنی جگہ کھڑا کھڑا جھپٹا۔ پھر جیسے اسے ہاتھی پاؤں کی بیماری ہو۔ پاؤں زمین پر گڑھے کے گڑھے رہ گئے۔ اور ہاتھ آگے بڑھ گئے۔ وہیں کھڑے کھڑے اوتن گر پڑا۔ اور اس کے منہ سے جھاگ پھوٹنے لگی۔

لیکن اوتن اکیلا نہ تھا۔ اس کے پاس ایک اور آدمی بھی کھڑا تھا۔

یہ سب کچھ اس خواب کی مانند تھا۔ جس میں ایک آدمی دہشت کے مارے بھاگنا چاہتا ہو۔ لیکن پاؤں زمین میں گڑ جاتے ہوں۔ اور بھاگ نکلنے کے تمام راستے مسدود ہو جاتے ہوں۔ البتہ ایسی تفصیلات دی جاتی ہوں۔ جیسے تاڑ کے پتے جھوم رہے ہیں اور کوئی آدمی پاس کھڑا۔۔۔

لیکن وہ آدمی بولنے لگا۔ اس انداز میں جیسے اصل اور نقل، خواب اور بیداری ایک دوسرے سے گڈمڈ ہو رہے ہوں۔ یہ خواب نہ تھا۔ کونٹے کے بیکا گڑھے پر بیکار پن کی جھکڑ کے ساتھ برابر چل رہی تھی۔۔۔ صاف چکر لگاتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ آدمی جو اس بیداری اور خواب کی حدوں کو ملاتا ہوا آ رہا تھا۔ گنگنا رہا تھا۔۔۔۔۔
من چنگو ہو گیو رے، تمرو گورنگ روپ دیکھے۔۔۔

اس آخری کشمکش کے بعد اوتن بلبلانے لگا۔ "میں مر جاؤں گا رے دادا۔" گویا زندگی میں اسے پہلی بار گیان ہوا کہ وہ مر بھی سکتا ہے۔ مشکل سے مشکل گھڑیوں میں بھی اسے امید ہی رہی۔ کہ کچھ نہ کچھ ہو جائیگا۔ وہ نہیں مر سکتا آخر اس نے کسی کا کیا بگاڑا ہے۔ اب دہشت سے اس کی آنکھیں پھیل رہی تھیں۔ اور اسے یقین ہونے لگا۔ کہ مرنے کے لئے ضروری نہیں کہ کسی کا کچھ بگاڑا جائے۔۔۔ وہ آدمی کھڑا اوتن کی آنکھوں میں دیکھنے

www.taemeernews.com

لگا۔ اگرچہ اس کا من گرنگ روپ دیکھ کے پگلا ہو رہا تھا۔ تاہم وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر نہیں تھا۔ وہ آدمی تھا پھر تھوڑے تھا۔ یہ بول تو یونہی زبان پر چلے آتے تھے جیسے صبح اٹھتے ہی کوئی بول بے ساختہ زبان پر آجاتے۔ اچھا یا برا۔ آدمی دن بھر کا روبار کرتا ہے۔ اور جانے بوجھے اس بول کو گنگناتا رہتا ہے ..... مثلاً وہ شادی بیاہ کے موقع پر بھی گاتا ہے ..... ایک مرگِ ناگہانی اور ہے : ....

تمی کنو باڑی چھے ؟ اس نے پوچھا

اوتن نے پاگل ہوتے ہوتے جواب دیا۔ میں مر جاؤں گا' دادا ! اور وہ اور بھی متوحش نظر آنے لگا۔ منز مہاشے نے یہ سوال بھی اسی انداز میں کیا تھا جس میں گرنگ روپ گنگنایا تھا۔ اب ایک دم اس نے دلاسا دیتے ہوئے کہا — ارے تم مر جاؤ گے۔ تو کیا بگڑ جائیگا .... بتاؤ .....؟

کیا دنیا کا کاروبار بند ہو جائیگا ؟

تمہارے مر جانے سے لوگ بھی مر جائیں گے ؟

اس مہاماری میں تیس لاکھ مر گئے۔

تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو .... چوہدری ؟

اوتن کے ہوش و حواس پر جانے مہر لگ گئی۔ کل اس کے سامنے انوپم مرا تھا۔ لیکن اس پر کار گڑھے پر بیکار چرخی جکڑ میں ویسے ہی گھومتی رہی تھی۔ گویا اسے بھی رک جانا چاہیے تھا۔ تارے بھی اسی طرح جھومتے رہے تھے۔ اور اپنے مہاسوں سے شیلی ناڑی کی جھاگ بدستور اگلتے رہے تھے۔ اور پیٹ بھرے آدمیوں کو متوالا کرتے رہے تھے۔ مکھیا ویسے ہی حوصلوں کی طرح نوالے نگلتا رہا تھا ..... بچوں کو تکلیف ہوگی۔ اوتن نے سوچا۔ لیکن اس کے مر جانے سے وہ تھوڑے ہی مر جائیں گے زندگی کے ساتھ ٹکر لیں گے۔ تو وہ اور بھی اچھے آدمی بن جائیں گے بدما ان بچوں کے آسرے پر جیتی رہے گی۔ ہو سکتا ہے وہ دوسری شادی کر لے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ وہ اسی منہ سے دوسرے آدمی کے سامنے، انہی الفاظ میں محبت کا اقرار کرے۔ جن الفاظ میں اس نے اوتن کے سامنے اقرار کیا تھا؟ .... لیکن اگر ایسا ہو جائے۔ تو آخر کیا ہو جائیگا ؟ ....

تھوڑی دیر کے بعد اوتن کو پتہ چلا۔ اس کا ساتھی سرکاری آدمی ہے۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ امید اور خوف کے ساتھ۔ اس آخری زیور کو خرچ کر دینے پر اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ گھٹنے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا رہے تھے۔ جیسے ذبح ہونے سے پہلے مرغ کی چونچ کھل جاتی ہے۔ اور تنفس کی تیزی کی وجہ سے اس کی زبان، اس کا گلا، اس کی ادھجری پھڑپھڑانے لگتی ہے۔ ایسے ہی اوتن کا منہ کھل گیا تھا۔ اور زبان تالو سے نرخرے تک کانپ رہی تھی۔ آخر وہ سیدھا بیٹھ گیا۔ اور اپنی آنکھوں پر زور ڈالتے ہوئے منز مہاشے کی طرف دیکھنے لگا۔ اچانک اسے کچھ یاد آیا۔ اور وہ بولا۔

"امی براہمن باڑیا آچھے۔"

www.taemeernews.com

"اوہ، براہمن باڑیا آپہنچے!" مسز بھاشے نے کہا۔

کچھ دیر وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ اس اثنا میں ایک اور گاڑی آئی۔ اور جھنجھناتی ہوئی گزر گئی۔ اس دفعہ نقاہت سے ادتن نے اسے کھڑا کرنے کی کوشش نہ کی۔ شاید دوسرے آدمی کو پاس کھڑے دیکھ کر اسے حوصلہ ہو گیا تھا۔ پھر اسی مبہم سے احساس نے اس کا احاطہ کر لیا تھا۔ کہ وہ مر نہیں سکتا آخر اس نے کون سا قصور کیا ہے؟

جھکڑ کے ساتھ ایک دھول سی چھا گئی۔ بنگلہ کی فضا سے آنے ہوتے پرندے، بڑے بڑے پہاڑی کوے ہوا کی اوپر کی سطح پہ پر تولنے لگے۔ وہ جس مقام پہ اترنا چاہتے۔ اس سے گز دل دور جا پڑتے۔ لیکن پھر وہ اپنے حساب سے منزل سے بہت دور سے اترنے کی کوشش کرتے اور ہوا انہیں دھکیل کر عین مطلوبہ جگہ پر بٹھا دیتی ادتن اور مسز بھاشے میں کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں۔ ادتن کی جان میں جان سی آ گئی تھی۔ اس نے اپنی بڑھی ہوئی داڑھی سے دھول جھاڑتے ہوئے کہا۔ "اب ہمارے پاس کچھ نہیں رہا۔ دادا، امن کی فصل لینے کے لئے ہم نے اپنا سب کچھ بیچ دیا۔ لیکن وہ فصل بھی سنگلوں نے لوٹ لی۔ اس ہونے کی ہمت کس میں تھی؟

مسز بھاشے نے حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "تعجب ہے۔ اس سال سے لوگ بھی بھوکوں مریں۔"

"کیوں، اس سال میں کیا ہے؟"

"اس سال میں کیا ہے؟ سارا بنگال بھوکوں مر گیا۔ لیکن سرکار کو جنگ کے لئے یہاں سے کوئلہ لینا تھا وہ اس سال کے مزدوروں کو کیسے مار سکتی تھی؟"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔" ادتن نے کہا۔ "لیکن اس علاقے میں جو سفید پوش لوگوں کا حال ہوا۔ وہ تم نہیں جانتے۔ مانگنا وہ عار سمجھتے تھے۔ اور دینا ان کے بس میں نہیں تھا۔ کان کے مالکوں تک کو کچھ نہ ملتا تھا۔ وہ مزدوروں سے چھین جھپٹ کر کھاتے تھے۔۔۔۔" یہاں ادتن سانس لینے کی غرض سے رکا۔

"یہ چھینا جھپٹی وہ ہمیشہ کر سکتے تھے۔" مسز بھاشے نے ادتن کو کم بات کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں مسٹر بھاشے۔۔۔۔" ادتن نے رکتے ہوئے کہا۔ "انہیں اتنا کم ملنے لگا۔ کہ مشکل سے ان کا پیٹ بھرتا تھا۔ ہم سب کچھ چور بازار سے پیسے کے زور خریدتے۔ لیکن اب اس ایماندار سرکار نے نیچے سے چور بازار بھی ختم کر دیا۔۔۔ چور بازار بڑی چیز ہے نا!"

اور بھاشے نے ادتن کو شک سا گذرا۔ غصہ بھی نشے سے کم نہیں ہوتا۔ پھر ادتن میں طاقت عود کر آئی۔

"تم چور بازار بند کرنے آئے ہو؟" اس نے پوچھا۔ "تم چور بازار بند کرنے آئے ہو۔ تو یہاں سے چلے جاؤ۔ یہاں سب لوگ بھوکوں مر جائیں گے۔۔۔۔ سب۔۔۔۔ سب۔۔۔۔ مزدور۔۔۔۔ مزدوروں کے مالک۔۔۔۔ سب۔"

"میں چور بازار بند کرنے نہیں آیا۔"

"تو پھر تم چور بازار میں نفع کمانے آئے ہو؟" ادتن نے اور غصے ہوتے ہوئے کہا۔۔۔ لیکن اس کے

www.taemeernews.com

منہ پر کف سی آ گئی۔ اودن نے مترھاشے کا چہرہ ٹٹولنے کی غرض سے ہاتھ بڑھایا لیکن اس کے ہاتھ پاؤں نے اسے ہلنے نہ دیا۔ ایک بے بسی اس پر چھا گئی۔ اور اس نے کہا۔ "ہماری جان بچانا تمہارا فرض ہے . . . . تم سرکاری آدمی ہو . . . . ."

مترھاشے بٹر بٹر اودن کی طرف دیکھتے رہے۔

اودن بولا۔ "تم مجھے اس سال بچا سکتے ہو۔ مترنہ بچوا سکتے ہو۔ مرنے سے پہلے . . . "

مترھاشے نے سوچتے ہوئے کہا۔ "میں لوگوں کی جان بچانے نہیں آیا۔"

"نہیں؟" اودن نے پھر گھٹنے سکیڑتے ہوئے کہا۔ "تم کیا کرنے آتے ہو؟"

"مجھے مرنے والوں کی تعداد گننے پر لگایا گیا ہے۔"

اودن نے اپنی دھندلائی ہوئی آنکھوں میں سے دیکھا۔ مترھاشے آنکھوں سے نمی پونچھ رہے تھے۔ اس نے دیکھا۔ مترھاشے کسی اچھے خاندان کے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے خاندان کے آدمی جسے اس بیماری یا بھوک کے لئے جدوجہد نہیں کرنا پڑی۔ جس کی بہنوں کو دبے پاؤں اپنے ہال کے چور دروازے سے رات کے وقت جانا اور آنا نہیں پڑا۔ وہ رحمدل تھے۔ ان کی آنکھیں نمناک تھیں . . . . . . لیکن اودن نے سوچا ان کے رحمدل ہونے کا اسے کیا فائدہ۔ اس قسم کا رحم بھی کیا عیاشی تھی؟

تارے کے اوپر سے بتاشوں کی طرح کے جھاگ کے چند قطرے گرے۔ سائیں سائیں کی آواز میں اودن کی آہ گم ہو گئی۔ وہ پھر بلبلانا چاہتا تھا۔ اور مترھاشے کو کہنا چاہتا تھا . . . پھر یہاں کیوں کھڑے ہو . . جاؤ۔ اپنے کاغذوں میں ایک اور نام لکھ لو۔ مترھاشے دیکھنے میں آنسو بہا رہے تھے۔ لیکن وہ اودن کے سکڑے ہوئے جسم پر یوں کھڑے تھے۔ جیسے کوئی گدھ ہو۔ اور کسی جانور کے مر جانے کا انتظار کر رہا ہو۔ اگر وہ چلے جاتے تو خانہ پری کیلئے پھر انہیں لوٹنا پڑتا۔

مترھاشے نے اودن کے کندھے چھوتے اور کہا۔

"اودن دادا . . . . تم لوگ خود کچھ بھی تو نہیں کرتے۔ ہر کوئی اپنی مدد آپ کرے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔"

اودن نے بچے سے سر ہلایا۔ مترھاشے بولے۔

"اودن دادا، تم کلکتے کیوں نہیں چلے جاتے . . . . . کلکتے۔"

اودن پر ایک غنودگی سی طاری ہو گئی۔ اس کی ادھڑی پھڑک پھڑک کر ہار چکی تھی۔ اور اس کا دماغ ایک جالا سا بننے لگا تھا۔ اس کے ذہن کے افق پر ایک دھول سی چھا گئی۔ پھر کچھ ہوش آئی۔ اب کے مترھاشے خواب کے عالم میں تھے . . . . . اودن کسی زمانے میں خود مترھاشے تھا۔

. . . .

اودن کے بزرگ براہمن بلڑیا کے گاؤں اوتی میں رہتے تھے۔ اودن کا باپ ایک معمولی حیثیت سے ریلوے

www.taemeernews.com

ورکشاپ میں نوکر ہوا تھا۔ وہ صرف بجلی کے پنکھوں پہ آرمیچر بنا کرتا تھا۔ اس زمانے میں پنکھے صرف رئیسوں کے ہاں ہوتے تھے۔ اسلئے ایک پنکھا معمولی سا خراب ہو جانے پر چند ناقدر اوتن کے باپ کی گورنر تک رسائی ہو جاتی تھی۔

جوتن بابو ورکشاپ سے اکثر تاریں، سوچ، انگاڑیل کا روغن اور ایسی کئی ایک چھوٹی موٹی چیزیں اٹھا لیا کرتے تھے۔ ایندھن کی ان کے ہاں ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی تھی۔ کیونکہ تیل میں بھیگے ہوئے چیتھڑے جن سے انجن صاف کئے جاتے تھے۔ بکثرت مل جاتے تھے۔ بیٹری کے ذریعے ان کے ہاں بتیاں جلتیں۔ اور یہ بات آس پاس کے دس بیس گاؤں کیلئے عجوبہ تھی۔ اس کے باوجود جوتن بابو کو کسی نے تسلیم نہیں کیا تھا۔ لیکن اسے بھی گر یاد تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریز بچے خوش ہو کر کہا کرتا تھا۔۔۔ مانگ کیا مانگتا ہے۔

اکثر طالب علموں کی خواہش ہوتی تھی۔ کہ وہ بیرے کی حیثیت سے صاحب کے ہاں نوکر ہو جائیں۔ اور جان بوجھ کر انگریزی کا کوئی لفظ نہ بولیں۔ اور پھر میم صاحب یا صاحب کو کہیں کہ انہیں انگریزی پڑھا دے۔ پھر ایک دن میں انگریزی کی پرائمر اس حد تک پڑھ جائیں۔ کہ صاحب ان کی "خداداد لیاقت" کا قائل ہو جائے۔ اور فوراً کہے۔ تم پلیٹیں دھونا چھوڑ دو۔۔۔ تم ناحق رکابیاں چمکاتے ہو۔ حالانکہ تم ہندوستان کی قسمت چمکا سکتے ہو۔۔۔ اور پھر صاحب فرلو پہ ولایت جائیں۔ تو انہیں بھی ساتھ لے جائیں۔ اور انہیں آکسفورڈ میں داخل کرا دیں۔۔۔ اپنے خرچ پر ... صاحب جو ہوئے، اور ہر صاحب فراخدل ہوتا ہے۔۔۔ پھر آکسفورڈ سے تعلیم حاصل کر کے لوٹیں تو قریب قریب وہی مرتبہ حاصل کر لیں۔ جو ان کے صاحب کو حاصل تھا۔ وہ لوگوں کو حیران کر دیں۔ اور پھر ان تمام بھائیوں سے بدلہ لیں۔ جن کے ساتھ زمین پشت سے مقدمہ چل رہا تھا یا جنہوں نے نوکری کے سلسلے میں ان سے بات تک کرنا گوارا نہ کیا تھا۔

کرسمس کے دنوں میں اپنے ہاں ڈالی لے جانے اور

May God Bless you; May God Shower Good Luck on you And your Near and Dear ones; May God ....

ایسے الفاظ کہنے والوں کو صاحب لوگوں نے ابھی نفرت کرنا شروع ہی کیا تھا۔ بظاہر خوش ہوتے تھے لیکن جونہی خوشامدی لوگ کوٹھی کے احاطے سے باہر نکلتے۔ صاحب لوگ، میم لوگ اور بابا لوگ خوب ہنستے اور نفرت سے *Bloody Swines these!* اور اس قسم کے خطابات سے ان لوگوں کو یاد کرتے۔ لیکن ایک اور طریقہ بھی تھا۔ جسے جوتن بابو نے کامیابی کے ساتھ اختیار کیا۔ اس نے گورنر کی بیوی کے ہاں تھیلی دار گھنٹی لگا دی۔ گورنر صاحب بہادر کے سلام بولنے پر ہز ایکسیلینسی جاگ بھی پڑتیں۔ اور ان کے اعصاب پر بھی گھنٹی کی کرخت آواز سے کوئی برا اثر نہ پڑتا۔ ہز ایکسیلینسی نے فوراً کہا۔ مانگ کیا مانگتا ہے۔ جوتن نے کہا۔ میم صاحب، آپ کا دیا بہت کچھ ہے آپ کے جوتوں کے صدقے سب کچھ حاصل ہے۔ جب میم صاحب نے تیسری مرتبہ کہا۔ تو جوتن

www.taemeernews.com

بھلا۔ یور ایکسیلینسی! میرا عہدہ بڑھا دیا جائے۔ اسی دن ملٹری سیکرٹری کے نام چٹھی لکھی گئی۔ ملٹری سیکرٹری نے ایجنٹ صاحب کے نام لکھا۔ اور جوتن بابو شدہ شدہ جرنیل کے عہدے تک جا پہنچے۔ وہ تو دیوان بھی ہو سکتے تھے۔ بشرطیکہ وہ عہدہ انگریز کے لئے وقف نہ ہوتا۔

تو گھر بھر میں اس قدر فراغت تھی۔ اوتن ابھی اسکول سے نکلے ہی تھے۔ صحت بنانے کا انہیں خوب خیال تھا۔ آخر تمام زندگی یہی صحت خرچ کرنا تھی۔ وہ صبح شام ڈنٹر پیلا کرتے۔ مالش کرتے۔ پہلے تو وہ صبح دہی کا بھرا ہوا ایک کٹورہ پی جاتے۔ پھر سورج نکلتے سمے پچاس بادام الائچی کے ساتھ کوٹ کر لڈو سا بنا لیتے اور کھا جاتے۔ پھر میاں شمس الدین کے ہاں کا سا بوٹ پلاؤ۔ اور مرغن چیزیں کھائی جائیں۔ پھر دودھ پیا جاتا۔ پیٹ پر اتنا بوجھ ہونے سے رات کو اکثر "سوپن دوش" ہو جاتا۔ اور اس کمزوری کو پورا کرنے کیلئے اگلے روز اور کھایا جاتا

جسم میں قوت وافر تھی۔ جذبات کا خزینہ بھی بہت تھا۔ معمولی سی بات پر آنسو امڈ آتے تھے۔ چونکہ طاقتور آدمی ہر کسی کو معاف کر دیا کرتا ہے۔ اس لئے اوتن کسی کو کچھ نہ کہتے۔ ہر ایک کو معاف کر دیتا۔ اور معاف کر دینے کے بعد وہ سوچتے۔ خدایا! میں تیرا کتنا عاجز بندہ ہوں۔ اور پھر آنسو اس کی آنکھوں میں چھلکنے لگتے۔ اسے اکثر خیال آتا۔ اگر میں چاہتا۔ تو ایک پل میں اس شخص کا کچومر نکال سکتا تھا۔ لیکن میں نے اسے مارا نہیں۔۔۔ اس کی بیوی ہے جو ہمیشہ بیمار رہتی ہے۔ پھر یہ انا تھ آلیہ کا منتری ہے۔ اور ہر سال اس کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوتا ہے۔۔۔۔ اور پھر آنسو۔۔۔۔۔

چنانچہ اسے اچھی طرح یاد تھا۔ کہ سانیالوں کے مزارع نریندر کی بیوی منیکا بیمار پڑی تھی۔ اس کا خاوند بوڑھے والدین، نصف درجن بچوں اور وقت بے وقت کی نوکری کے درمیان کس قدر پریشان پھرتا تھا۔ اوتن اکثر اس کے ساتھ ہسپتال جایا کرتا۔ اسے تمام مریضوں کی حالت پر رحم آتا۔۔۔ وہ لوگ چاہتے تو تندرست ہو سکتے تھے۔ وہ ہوا خوری کرتے۔ پھل کھاتے تو چند دنوں میں راضی ہو جاتے۔۔۔۔ ایکدن اوتن الیف وارڈ میں جہاں اسٹیشن ماسٹر گروپ کے لوگ اور ان کے وابستگان بیمار پڑے تھے۔ منیکا کے پاس پہنچا۔ منیکا کو کثیر الاولادی سے دق ہو چکی تھی۔

"میں تمہیں علاج بتاؤں۔۔ دیدی؟" اوتن نے آناً فاناً سوال کیا۔

"ہاں اوتن بھیا۔۔ اگر تم مجھے صحت دے سکو۔ تو میں آرام سے بچے پال سکوں۔۔ مجھے اپنی جان کی پروا نہیں"

اس وقت نریندر آگیا۔ وہ دفتر سے چھٹی لے آیا تھا۔ چونکہ ہر روز اسے اپنی بیمار بیوی کے لئے ڈبہ پہنچانا پڑتا تھا۔ اس لئے دفتر سے دیر ہو جاتی تھی۔ اور اس کے افسر دھمکی دیتے تھے۔ نریندر اپنے اسٹیشن کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہاں دو پیسے اوپر سے آمدنی ہو جاتی تھی۔ ورنہ اتنے بچوں کا پیٹ کہاں پل سکتا تھا۔ اس لئے وہ چاہتا تھا۔ پیسے بھی آتے رہیں۔ اور منیکا بھی بچ جائے۔ البتہ اسے منیکا کی زیادہ پروا تھی۔ اور وہ بچوں کو نہیں چاہتا تھا۔ جو بن بلائے مہمان کی طرح پیچھا ہی نہیں چھوڑتے تھے۔۔ نریندر کو سامنے دیکھ کر اوتن جھینپ گیا۔

www.taemeernews.com

لیکن اس کی نیت صاف تھی۔ اس لئے وہ بہت جلد سنبھل گیا۔ خیکا کے دبلے پتلے نحیف و نزار مالک نے بھی ایک تیکھی نظر سے اوتن کی طرف دیکھا۔ کیونکہ وہ اس کی غیر حاضری میں بھی ہسپتال پہنچنے لگا تھا۔ زینہ پر اوتن کو کھڑا ہو گیا اس کی نیت بھی صاف تھی۔

اوتن نے کہا۔ "خیکا میری بہن ہے!"

خیکا کے خاوند نے کہا۔ "وہ میری بیوی ہے۔ اور وہ دق سے مری جا رہی ہے۔"

"اس کی علاج تو بتانے آیا ہوں، دادا.... سنو گے؟"

"کہو، کیا دارو بتاتے ہو؟"

"دیکھو، پیٹ بیماری کا مرکز ہے۔ ہر بیماری پیٹ سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر تمہارا پیٹ صحیح کام کرنے لگے۔ تو تمہارا دل دماغ اور اعضائے رئیسہ ٹھیک کام کرنے لگیں گے۔ پھر تم کبھی بوڑھے نہ ہوگے۔ کبھی بیمار نہ ہوگے۔ ہم نے پیٹ تو مصنوعی قسم کی گرمی سے تباہ اور برباد کر رکھا ہے۔ ہم چائے پیتے ہیں۔ انگریزوں کی نقل میں۔ لیکن تم نہیں جانتے چائے کتنا نقصان کرتی ہے۔ اور انگریز چائے کے ساتھ کتنا مکھن کھاتے ہیں۔ چائے پیٹ میں انتڑیوں کے اندر ایک چکنی اور غلیظ سی تہہ جما دیتی ہے۔ جو کبھی دور نہیں ہوتی۔ سو اگر چائے پینا اتنا ہی ضروری ہے۔ تو مکھن کھایا کرو۔

تم لوگوں کے پیٹ جلے ہوتے ہیں میں انہیں ہرا کر سکتا ہوں۔ مثلاً اگر تم مٹی کو اپنے پیٹ پر باندھنے لگو صاف اور شدھ مٹی کو، تو مٹی مساموں کے راستے سے تمہارے پیٹ کی تمام غلاظت کو کھینچ لے گی۔ مٹی میں صاف اور شدھ کرنے کی بہت طاقت ہے۔ تم سیمنٹ پر غلاظت پھینکو۔ فوراً بدبو پھیل جائے گی۔ خدا کی زمین کروڑوں انسانوں کی غلاظت سے ہر روز خراب ہوتی ہے۔ لیکن اس میں سے بدبو نہیں آتی۔ اور پھر مٹی پر کس کے دام لگتے ہیں۔ خدا کی سب سے بڑی نعمتیں تمہیں مفت ملتی ہیں۔ لیکن چونکہ انسان دام خرچ کرنے کا عادی ہو چکا ہے۔ اسے یقین ہی نہیں آتا کہ مفت بھی آرام حاصل ہو سکتا ہے.... ہر روز آسمان پر ستارے نمودار ہوتے ہیں اور چاند اپنی کرنوں سے ساری دنیا کو منور کرتا ہے۔ کوئی چاہے تو انہیں پہروں دیکھتا رہے.... مفت... بالکل مفت ..... برخلاف اس کے کوئی مصور ان کی نقل اتارے تو اسے ایک نظر دیکھنے کے لئے دام وصول کر لیتا ہے... روشنی ... پانی.... ہوا..... قدرت کی سب نعمتیں مفت ملتی ہیں، اتنی کثرت سے، اتنی بہتات سے،"

پھر اوتن نے ہاتھ لگائے بغیر لکڑی کی کھچیل کی مدد سے پٹ سن کے ایک کپڑے پر مٹی کی تہیں جما کر رکھیں۔ پٹیاں بنا چکنے کے بعد اوتن کہنے لگا۔ "تمہیں مٹی آدی گاؤں کے قریب سے نہیں لینا ہوگی۔ مٹی یہ جکھنی ہو گنگا کے کنارے کی ہو تو بہتر ہے۔ سب سے اچھی مٹی گنگا کے کنارے ملتی ہے۔ ہمارے گاؤں کے ارد گرد کی مٹی غلاظت سے اٹی پڑی ہے۔ اور بہت ریتلی ہونے کے باعث مفید نہیں ہو سکتی۔

خیکا کے خاوند نے کہا۔ "ہم گنگا کے کنارے سے مٹی لینے جائیں تو...؟"

اوتن نے سنی ان سنی ایک کرتے ہوئے کہا۔ "تو نہیں کسی صاف جگہ سے مٹی لے لی جاتے۔"

www.taemeernews.com

"پٹیوں کے بعد دوسرا علاج سٹز باتھ ہے۔" اڈن نے کہا۔ "آؤ میں تمہیں سٹز باتھ کا طریقہ سمجھاؤں نیکا میری بہن ہے۔ آخر اس میں شرم کی کونسی بات ہے۔" پھر وہ جھجک کر بولا "نیکا کپڑے اتار کر پانی میں بیٹھ جائے۔ پانی ہمیشہ ٹھنڈا ہو۔ چشمے کا ہو تو بہت اچھا ہے ہمارے میدانوں کے دریا تو یہاں تک پہنچتے پہنچتے گرم اور گندے ہو جاتے ہیں۔۔۔۔ "

" دیکھو۔ یوں بیٹھ جاؤ۔۔۔۔ یوں ۔۔۔۔ ہاں! سب جگہ پانی میں ڈوبی رہے۔ پھر بائیں ہاتھ سے دونوں جگہوں کے درمیان پانی ملو۔ ارے اس میں شرم کی کونسی بات ہے۔ یہاں اعصاب کی گانٹھ ہوتی ہے۔ یہاں سے مصنوعی غیر قدرتی گرمی نکل جانی چاہیئے۔ ہم نے ان جگہوں کو غیر قدرتی اور کثرت استعمال سے بیماری کا مسکن بنا دیا ہے۔۔۔۔ پھر شرم ۔۔۔۔۔!

نیکا نے اپنا منہ شرم سے تکیے میں چھپا لیا۔

اڈن نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ سب جھوٹی شرم ہے دیدی!" اور پھر اڈن نے بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میرا تو ارادہ ہے کہ ایک بستی بساؤں جس میں سب لوگ ننگے رہیں۔ آج ہم نے خدا کے دیئے ہوئے خوبصورت جسم کو طرح طرح کے رنگ دگار رکھے ہیں۔ آج کون آدمی ہے اور کون عورت ہے جو کسی کے سامنے ننگی کھڑی ہو سکتی ہے۔۔۔ کون کہہ سکتا ہے کہ جس قسم کا خوبصورت جسم اسے خدا نے دیا تھا۔ اسے اس نے برقرار رکھا ہے، بھیا، کپڑے پہننے میں مساوات کہاں؟ ننگے پن میں مساوات ہے۔ سب لوگ بہن بھائیوں کی طرح رہ سکتے ہیں۔۔۔ ہاں۔۔۔ ہاں!" اور پھر اڈن نے سر کو جھٹکا دیا۔ اور بولا "بلکہ یہ کہ ننگوں کی اس بستی میں جب کوئی نیا آدمی آئے۔ تو اس کے اعزاز میں محبت اور اخوت کا ایک گیت گایا جائے۔ تاکہ آنے والے کو پتہ چلے کہ وہ چیرنے پھاڑنے والے جلادوں اور رہزنوں کے پاس نہیں جا رہا۔ بلکہ ایسے لوگوں میں جا رہا ہے۔ جو اسے بہن بھائی سمجھتے ہیں۔۔۔ صرف محبت سے انسان کی بیماریاں دور ہو سکتی ہیں۔

نیکا کے خاوند نے ایک اور کڑی نگاہ اڈن پہ ڈالی۔

محبت اور جوش کے ساتھ اڈن کا گلا بھر آیا۔ ایک مبہم ارادے کے ساتھ اس نے گلا صاف کیا۔ اور بولا "ننگا رہنے سے خواہشات کم ہو جاتی ہیں۔ بلکہ حکما کا خیال ہے۔ کہ عورت اور مرد کی ایک دوسرے کے لئے کشش ہی نہیں رہتی۔ اگر رہے گی تو اتنی جنسی قدرتی طور پہ ہونی چاہیئے۔ اس وقت سب کچھ غیر قدرتی ہے۔ مصنوعی۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔ ہمارا رہنا سہنا، کھانا پینا، پہننا، بچے پیدا کرنا۔۔۔۔ ہمارے علاج کے سب طریقے مصنوعی اور غیر قدرتی ہیں

پھر اسی طرح اڈن سٹز باتھ کے متعلق ہدایات دینے لگا۔۔۔ کسی قسم کا بیمار میرے پاس آئے۔ تو وہ چند دنوں میں تندرست ہو جائیگا۔ پیٹ ٹھیک ہو جائے۔ تو پھیپھڑے اپنے آپ درست ہو جائیں گے۔ تم نیکا کو میرے پاس لاؤ۔ سٹز باتھ میں اپنے ہاتھ سے نہیں دوں گا یہ کام تمہارا ہے۔ تم اس کے خاوند ہو۔ سچ پوچھو۔ تو میں اپنے ہاتھ سے علاج کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتا بشرطیکہ سب عورتیں میری بہنیں ہیں۔"

www.taemeernews.com

" ہو سکتا ہے۔ میں ہندوستان میں ننگے لوگوں کی بستی قائم کروں۔ تو پہلے پہل مردوں اور عورتوں کو مصلحت کی بنا پر ایک دوسرے سے علیحدہ رکھوں۔ ممکن ہے عورت اور مرد لنگوٹ باندھے رہیں۔ اور پھر ایک سماں آئے کہ وہ کپڑے اتار کر کھڑے ہو جائیں۔ ننگے... ایسے ننگے جیسے وہ خدا کے پاس سے آتے تھے۔

اس قسم کی بستی پہاڑ کے دامن میں ہونی چاہیئے۔ ایسی جگہ پہ جہاں نہ پہاڑ ہو اور نہ بالکل میدان۔ نہ بہت سردی ہو اور نہ بہت گرمی۔ وہاں پھل پھول کثرت سے اگائے جائیں۔ وہاں انسان صرف چلنے کے لئے جائے گھناؤنی سے گھناؤنی بیماری کے مریض کو پہاڑ پر بھیجو تاکہ وہ چشموں پہ نہائے۔ پھل کھائے۔ چٹان پہ بیٹھ کر دھوپ تاپے، ہنسے اور کھیلے... اور پھر جب تندرست ہو جائے۔ تو لوٹ آئے۔"

اس آخری فقرے پر نرپیندر ناتھ کو بہت غصہ آیا۔ نیکا آخر لوٹ نہ آئیگی تو آخر کہاں چلی جائیگی۔ نیکا کا تصور چمک اٹھا تھا۔ اسے اپنے صحن میں بچے ہنستے کھیلتے کودتے دکھائی دے رہے تھے۔ اور وہ... ان کی مغرور ماں، ان کے درمیان میٹھی فرحت کے احساس سے ٹک ٹک کر رہی تھی۔ نیکا نے نرپیندر کو روکا بھی لیکن وہ نہ مانا۔ اس نے اوتن کو خوب گالیاں دیں۔

"کیا بک رہا ہے... فلاں فلاں کے جنے...؟"

پھر وہ بولا۔ "پھل تیری ماں کے پاس سے آئیگا۔ اور پہاڑ پر تیرا باپ لے جائیگا۔ بچے تیرے کون ہوتے ہیں بیٹھا ئے اور دادی ماں.... نوکری میں پہلے ہی ایک چوتھائی تنخواہ پر چھٹی لے چکا ہوں۔ چھٹی کے نئے قوانین کے مطابق اول تو چھٹی ملے گی نہیں۔ اور جو مل بھی گئی۔ تو بغیر تنخواہ کے.... نوکری کا سلسلہ ٹوٹ جائیگا۔ اور پنشن میں فرق پڑیگا.... اڑے پہ نہ رہیں گے تو کل ہی کیرتی زمین کی دوسری مینڈھ پر بھی اپنا ہل چلا دیں گے....."

ایک لمحے کے لئے اوتن کو غصہ آیا۔ لیکن وہ غصہ اپنے آپ اتر گیا۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ وہ ان لوگوں کو زندہ رہنے کا راستہ بتا رہا تھا۔ اور وہ اسے گالیاں دے رہے تھے۔ وہ ان لوگوں پہ اپنا آپ قربان کر رہا تھا۔ مخالفت کے لئے اس کے دل میں کتنا درد تھا.... اوتن کا منہ سرخ ہو گیا.... اوتن نے نیکا اور نرپیندر ناتھ کو معاف کر دیا۔

لیکن اس کے معاف کر دینے سے کیا ہوتا تھا۔ نیکا اس کی باتیں سن کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ بچ جانے کے خیال نے اس میں اتنی طاقت پیدا کر دی تھی۔ کہ وہ اپنے سوجے ہوئے پاؤں کے باوجود چلنے لگی۔ لیکن جب نرپیندر ناتھ نے اپنی مجبوریوں کا احساس دلایا۔ تو وہ ایک دم بیٹھ گئی... کچھ دیر بعد اس پہ بحران طاری ہو گیا... بحران کا غرہ و اللہ اکبر ہمیشہ کے لئے خاک میں مل گیا۔

. . . .

اسی غنودگی کے عالم میں دوسرا واقعہ جو اوتن کو یاد آیا۔ وہ ستیندر سانیال کے دل کی آگ تھی۔ سانیال جو آبائی درباری تھے۔ کسی زمانے میں خاصے امیر تھے۔ لیکن چند قانونوں کی زد میں آ کر مفلس اور قلاش ہو گئے۔

www.taemeernews.com

جاوید اقبال

چیچک

منظر:۔ کسی جلتے ہوئے ویرانے کا ایک حصہ۔ جس میں چند درختوں کے صرف تنے ہی باقی رہ گئے ہیں۔ راکھ کے ڈھیروں میں مختلف جگہوں پر سیاہ لوہے کے مثلث اور مستطیل نما جا دی ٹکڑے بکھرے پڑے ہیں جگہ جگہ شکستہ چوڑیاں اور چند پہیے سے رکھے ہیں۔ جو کسی تباہ شدہ سواری کے آثار باقیہ معلوم ہوتے ہیں۔

سب سے قریب کے موٹے تنے سے قدرے ورے تین گلی سڑی لاشیں پڑی ہیں۔ ایک مرد کی نعش ہے جس کا نچلا حصہ بالکل گل چکا ہے۔ اور جس پر نمدے رنگ کے چھوٹے رینگ رہے ہیں۔ دوسری نعش ایک عورت کی ہے جس کا چہرہ، سینہ اور دایاں بازہ خراب ہو چکے ہیں۔ بازو کی سفید سی خشک ہڈی اور گرد کی آبنوسی جلد میں چمک رہی ہے۔ دایاں رخسار پھٹ چکا ہے اور اس پر چربی کی تہ جمی ہوئی ہے تیسری نعش ایک بچے کی ہے جو فقط اوندھے منہ پڑا ہوا ایک ڈھانچہ معلوم ہوتا ہے۔

ان نعشوں کے سرہانے ایک نہایت نحیف، چند لمحوں کا مہمان، خارش زدہ کتا بیٹھا اپنا سر آسمان کیطرف اٹھائے دردناک آواز میں چیخ رہا ہے۔ پرے کسی درخت کے تنے پر دو گدھ بیٹھے کبھی کبھار ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھ لیتے ہیں۔ اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے کر لیتے ہیں۔ کسی کسی وقت ان میں سے ایک گدھ کتے سے ہم کلام ہونے کی کوشش بھی کرتا ہے۔

منظر پر تاریکی چھائی ہے۔ کبھی کبھار جب روشنی کی ایک شعاع ان نعشوں پر پڑ جاتی ہے۔ تو دھندلکے میں کچھ دکھائی دے جاتا ہے۔ مگر پھر مسلسل تاریکی چھا جاتی ہے۔

پس منظر میں بہت سے لوگوں کے کراہنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ ان میں سے ایک مرد اور ایک عورت کے گفتگو کرنے کی آواز کسی قدر نمایاں ہے۔ جو بغیر توجہ دیئے بھی سنی جا سکتی ہے۔

عورت:۔ ... ہمیشہ۔ میں جھوٹ نہیں کہتی۔ تم نے ہمیشہ ...

مرد:۔ ہمارا رستہ کونسا ہے۔ کدھر ہے، کدھر ہے؟

عورت:۔ تم نے ہمیشہ ...

مرد:۔ بڑھو!

عورت:۔ تم نے ہمیشہ مجھ سے محبت کی ہے

گدھ:۔ مجھے کتے اچھے لگتے ہیں۔

کتا :- خاموش :

گدھ :- کیا تم زندہ رہنا چاہتے ہو۔

کتا :- خاموش !

گدھ :- وہ — ی ایک مہمل لفظ ہے۔

کتا :- خاموش

مرد :- میرے رستے میں کانٹے ہیں میرے پاؤں لہولہان ہیں۔
ان کبوتروں کے خونیں تمسلوں کی طرح جو مزار اسعل کا
طواف کرتے ہیں۔

عورت :- پہلی مرتبہ جب تم مجھے ندی کنارے ملے۔ تو تم نے کچھ
کہا تھا۔ کیا تمہیں یاد ہے ؟

مرد :- مجھے یاد نہیں

عورت :- ندی کا کنارہ۔ آہ۔۔۔

مرد :- بڑھو، یہ ملک ویران ہے

عورت :- سنو مجھے ندی کے بہنے کی آواز آتی ہے۔ جیسے
کوئی خواب ۔۔۔

مرد :- یہ آوازیں کن کن کی ہیں

عورت :- مجھے ایک سفید سانپ رینگتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔

مرد :- نہیں سفید چیونٹیوں نے زمین میں سوراخ کر دیئے ہیں

عورت :- ندی اس دفعہ تو بہت کی ایک خاموش جھیل تھی۔
! مجھے یہی یوں دکھائی دیتی تھی۔ میں نے اپنی سلونی ٹانگیں
تک اٹھا رکھی تھی۔ اور ندی میں دور تک نکل گئی تھی۔ اس
جگہ جہاں چاند اس کی تہجلاتی پر ندی بچے کی مانند لوٹ
رہا تھا۔ میں ہر چودھویں رات وہاں کسے چومنے جایا
کرتی تھی۔

مرد :- سوراخ۔ سوراخ ۔۔۔۔

عورت :- یوں ہی ایک روز میں سرشام کنارے پر جا بیٹھی
ابھی چاند ندی پر نہ اترا تھا۔ وہ دریچہ میں بہت ہی جھکیلا

، اپنے جسم اٹھا اٹھا کر دہکتے انگارے کو نگلنے کی کوشش
کر رہی تھیں جیسے انہوں نے پے در پے حملوں سے
زخمی کر دیا تھا اور جس کے خون کی لالیوں میں تمام
فضا ڈوب گئی تھی۔

بعد وہ انگارہ، کائنات کی دہکتی ہوئی آنکھ، اسکے پاؤں کے
تلوے پہ جھنگلی سے ذرا نیچے، رستا ہوا اچھالا رستا
ہوا، سہم :

عورت :- تم میری پیٹھ کے پیچھے آکر کھڑے ہو گئے میں نے
تمہارے چہرے کا عکس پانی میں دیکھا۔ پانی میں گرا
ہوا گلاب کا ایک پژمردہ پھول میری نظروں کے
سامنے سے لڑھتا نکل گیا۔ کوئل کی کوک گھنے سایوں
میں گونجی۔ جیسے کسی ابھاگن نے جمائی لی ہو۔ میں نے
تمہیں اپنے قریب بٹھالیا۔ ہم نے ایکدوسرے کو پہلے
کبھی نہ دیکھا تھا۔۔۔۔

مرد :- بڑھو، مجھے چاندنی سے نفرت ہے۔

(چار کوّے اڑ کر گنبد جاتے ہیں)

عورت :- جیت، بیساکھ، جیٹھ، اساڑھ، ساون، بھادوں،
اسوج، کاتک، مگھر، پوس، ماگھ، پھاگن۔ کس
قدر مختصر تھی ہماری خوشی اور کس قدر دلکش تھا وہ باغ
جس میں ہم نے اپنی زندگی کے چند مجھے پھول چنتے اور
کھیلے کھلا رہے تھے۔ تمام دن درختوں میں چھپا کرتے
تمام رات گھاس پہ لوٹا کرتے۔ میں جنگلی ہرنی کی طرح بھاگتی
اور تم مجھے پکڑنے کی بے سود کوشش کیا کرتے۔

مرد :- غلط، غلط، غلط ۔۔۔

عورت :- مگر جب کسی رات چاندنی پہ اترتا۔ میں تم سے
چھپ کر اپنی ساڑھی رانوں تک اٹھا کر ندی میں دور
نکل جایا کرتی۔ آخر ایک شب تم نے مجھے چاندنی

آغوش میں اس کا بوسہ لیتے ہوئے دیکھ ہی لیا
تمہاری آنکھیں غصے سے سرخ ہوگئیں۔ تم نے
اپنی کمان میں تیر جوڑا۔ اور اس کی طرف رخ کر کے
چھوڑ دیا۔ تیر نشانے پر بیٹھا۔ چاند کے سینے سے لہو کا
دھارا بہ نکلا۔ لوگوں نے ڈر کے مارے اپنے چہرے
بانہوں میں چھپا لئے۔ کیا یہ برا شگون تھا۔

مرد۔ ہائے، انہوں نے اس کی صورت بگاڑ دی ہے
وہ تمہارے پیٹ کی طرح ہموار تھی۔ تمہاری رانوں
کی طرح خاکستری اور تمہارے سینہ کی طرح گداز۔
مجھے اس پر لیٹ کر ہمیشہ یہی گمان ہوتا۔ گویا میں
تمہاری چھاتی پر سر رکھے ہوں۔ جب کبھی بارش ہوتی
تو وہ تمہارے نیم وا ہونٹوں کی طرح گیلی ہو جایا کرتی۔

عورت۔ پھاگن میں ایک ستارہ ٹوٹ کر میری گود میں
آن گرا، روتا ہوا۔ کیا میں کسی خدا سے کم تھی؟
تم مجھے ندی کے کنارے لے گئے۔ رات ابھی نہا کر
ہی نکلی تھی۔ اس نے بال سکھانے کے لئے اپنی ساری
لٹیں کھول رکھی تھیں۔ پانی کے قطرے اس کی زلفوں
میں جھلملا رہے تھے۔

مرد۔ نہیں، نہیں، نہیں، نہیں۔

عورت۔ اور تم نے میرے کان میں کہا۔ کہ میں......
تمہیں تمہاری ماں یاد آگئی۔ جو تمہیں بلاناغہ پیٹا
کرتی تھی۔ اور جس کی مار کے نشان ابھی تک
تمہاری پیٹھ پر ثبت ہیں۔ مگر جس کے لاتعداد بوسے
تمہارے رخساروں کی سیاہی مائل سرخیوں میں مخفی ہیں
تمہاری وہی ماں جس نے بچپن میں تمہیں گھی کی چوری
کھلائی تھی۔ اور جب پہلی بار تم کام پر جانے لگے۔ تو
تمہیں اس نے پراٹھے باندھ کر دیئے۔ ویران۔ بل
کھاتی ہوئی پگڈنڈی پر دور تک اس کی نگاہیں
تعاقب کرتی رہیں۔ اس کی دھندلی سی آنکھوں
میں سمندر مقید تھے۔ اور جب تم درختوں کے
گھنے سایوں میں ڈوب گئے تو اس نے آہ بھر
کر آسمان کی طرف دیکھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے
میں پاس ہی تو کھڑی تھی دہلیز کا سہارا لئے۔
کس قدر جابر تھی وہ... جب تم مجھے بازو سے تھامے
اس کے سامنے لائے۔ تو اس نے گھونگھٹ اٹھا کر
پہلے میرے خاموش چہرے کو دیکھا تھا۔ پھر میری
پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔ ابھی تک اس کے لبوں
کی گرمی میرے ماتھے پر موجود ہے۔ جیسے مجھے کسی
نے داغ دیا ہو۔ اس نے مجھے ایک سنگار دان بھی
دیا تھا جس میں خوشبوؤں کی ڈبیا تھی۔

مرد:۔ آہ......

عورت۔ اس تاریک رات تم رو دیئے تھے۔ اس تاریک
رات تم نے اپنا چہرہ میرے سینے میں چھپا لیا تھا۔
گویا میں تمہاری.... اس تاریک رات تم میری
گود میں کراہتے رہے تھے۔ تم اس قدر خوفزدہ
کیوں تھے ___؟ تم نے کہا تھا۔ خدارا مجھے تنہا
نہ چھوڑ جانا۔ اور میں نے تمہیں پیار سے بھینچا تھا۔
یہاں تک کہ میری چھاتی کی جلد تمہاری سخت داڑھی
کی رگڑ سے دہک اٹھی تھی...

گدھ: موت د___ی کے ورا ہے؛
کتا: د___ی موت سے بے نیاز ہے۔
گدھ۔ کیا تم جانتے ہو ان لوہے کے ٹکڑوں کو کون
پھینک گیا ہے۔

www.taemeernews.com

کتا:۔ نہیں

گدھا:۔ یہ درخت کیوں جھلس گئے ہیں۔

کتا:۔ نہیں۔

گدھا:۔ ان راکھ کے ڈھیروں میں لاشیں کیوں اٹی پڑی ہیں۔

کتا:۔ نہیں۔

گدھا:۔ انسان انسان کا دشمن کیوں ہے؟

کتا:۔ نہیں، نہیں، نہیں۔

گدھا:۔ اس ویرانے کے سارے کتے عاقبت نااندیش ہیں۔

کتا:۔ خاموش۔ میں تمہیں ان کے قریب نہ پھٹکنے دونگا

گدھا:۔ اسی قربت کی خاطر ہی تو لوہے کے ٹکڑے یہاں بکھرے ہیں۔ درخت جھلس گئے ہیں۔ راکھ کے ڈھیروں میں لاشیں اٹی پڑی ہیں۔ انسان انسان کا دشمن ہے۔ بستیاں ویرانوں میں تبدیل ہو گئی ہیں اسی قربت کی خاطر صرف ——

کتا:۔ خاموش

گدھا:۔ آخر کے دن تک —— تم کم از کم یہ تو ضرور جانتے ہو کہ ہم تمہاری موت کا انتظار کر سکتے ہیں۔

کتا:۔ خاموش۔

گدھا:۔ مخلوق کا رازق کون ہے۔

کتا:۔ خاموش

گدھا:۔ اور اس دفعہ تو...

کتا:۔ خاموش۔

مرد:۔ کیچڑ....

عورت:۔ اس تاریک رات کس قدر خوفناک آندھی چلی تھی یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کائنات کا نظام بدل جائیگا۔

صدیوں میں پہچان ہو ہی تو جلد نکلا۔ ابھی تک اس کے زخم کے اردگرد خون کی پپڑی سی جمی ہوئی تھی کبھی کبھار اس کے زخم سے ایک آدھ بوند رس جاتی — وہ کس نوعیت کا زلزلہ تھا جس نے ہماری زمین کو ایک کوڑھی کی جلد کی طرح جگہ جگہ سے پھاڑ دیا۔

مرد:۔ بیکار ہے! میں نے لعل کھو دیا۔

عورت:۔ رات کے بال سوکھنے تو چیونٹیاں ہمارے دانے سمیٹ کر لے جا چکی تھیں۔ ٹڈیوں کے دل کھیتوں پر ایک پتہ تک باقی نہ چھوڑا تھا۔ اس وقت وہ کونسی قوتیں تھیں جن کی پکار سن کر ستاروں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں نکلیں۔ کیا وہ اپنے بچوں کے تصور ہی تھیں یا اپنے خداوندوں سے ملنے.....

مرد:۔ پھٹکار! پھٹکار —— مجھے تم سے قطعی الفت نہ تھی۔ میں تمہیں....

عورت:۔ چٹیل میدانوں میں ہم بھاگتے رہے جہاں کبھی کھیت لہلہایا کرتے تھے۔ کتنی بار گڑھوں میں ہمارے پاؤں بھی پھسلے۔ کس قدر تاریک تھے وہ گڑھے۔ — ان میں کچھ رکھا تھا۔ میں نے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔

مرد:۔ کسی گدھے کی شادی تھی۔

عورت:۔ ساون کی چار گہری راتیں سسکتی اپنے چہروں کو بالوں میں چھپاتے آئیں۔ ان میں سے ایک نے اپنے جلے خون آلود ناخنوں سے میرے گلے کا ہار توڑ لیا۔ اس میں ایک ہی تو موتی تھا۔ ننھا سا مگر نہایت ہی بیش قیمت۔ اس قدر کہ کائنات کے سارے خزانوں کے عوض اسے خدا ایسا بیداری

بھی نہ خرید سکے۔

مرد :۔ کھدو، میں تمہیں معاف نہیں کر سکتی۔

عورت :۔ سحر نے آنسو پونچھے تو کوئل کی کوک گونجی، آہ کس قدر بھیانک تھی وہ گونج۔ رات کی قبا سے پھاڑا ہوا یہ چیتھڑا جو دن کے وقت ویران کھنڈروں میں تن تنہا بے خانماں خزاں رسیدہ پتے کی طرح لہرا رہا ہو۔ اور یہ چیخ چیخ کر بیتی راتوں کی یاد دلائے بیتی راتوں کی حسرت ناک یاد۔۔۔ بیتی بہاروں کی حسرت ناک یاد....

مرد :۔ کھدو.....

عورت۔ دلدل، کیچڑ.... کیچڑ، دلدل... دلدل کیچڑ.... رالیں، تھوکیں، پسلیاں، پیپ، خون، دق.... پنجر گاڑے ہوئے.... انہیں ہر روز کون گاڑ جاتا تھا.... بسے ہوئے گوشت کی بدبو مردار.... میں تو ڈر جایا کرتی۔ تم نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا.... تم مجبور تھے....

مرد۔ بیمار، بیمار... چیچک زدہ انسان کا چہرہ۔۔۔ سورج۔

عورت۔ آج وہ پھر کراہ رہے ہیں۔۔۔ آؤ میرے ساتھ چلو۔

مرد۔ کہاں۔

عورت۔ پکڑو میری انگلی پکڑو۔۔۔ وہ دیکھو بوڑھا خدا کمبل اوڑھے بیٹھا اونگھ رہا ہے۔

مرد۔ بھوکا...

عورت۔ میں اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو جاؤں گی۔ تم خاموش رہنا۔ میں گڑگڑاؤں گی۔ اس کے قدموں میں اپنا سر دھنوں گی اور کہوں گی....

مرد :۔ آہ، آہ، آہ...

عورت :۔ اور کہوں گی۔ ان ستاروں کی آنکھوں میں دھول جھونک دو۔ چاند کو سیاہ نقاب اڑھا دو۔ سورج کے چہرے پر کیچڑ کا لیپ کر دو۔

مرد آہ...

عورت :۔ انسان زندہ رہنے کے قابل نہیں ہے۔ مجھے کل کسی نے کہا تھا۔ بہشت دوزخ کا غلط نام ہے زندگی فانی ہو یا باقی، ایک مسلسل جہنم ہے.... کیا اس نے مجھے غلط کہا تھا۔

گدھا (آہستہ آہستہ) ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات آٹھ، نو، دس، گیارہ....

کتا :۔ میں تمہیں ان کے قریب نہ پھٹکنے دوں گا۔

گدھا۔ بارہ، تیرہ، چودہ، پندرہ، سولہ، سترہ...

کتا :۔ میں تمہیں ان کے قریب....

گدھا: اٹھارہ، انیس، بیس، اکیس....

کتا :۔ میں تمہیں....

گدھا۔ بائیس، تئیس، چوبیس، پچیس...

کتا :۔ میں....

گدھا :۔ چھبیس، ستائیس....

کتا :۔......

گدھا :۔ اٹھائیس.... چلو

(منظر پر تاریکی چھا جاتی ہے پس منظر سے لگاتار کراہنے کی آوازیں لگاتار آ رہی ہیں ایک چیخ گونجتی ہے جیسے کوئی کسی کا گلا بھینچ رہا ہو۔ ہلکی ہلکی خراٹے کی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں مدھم روشنی کی شعاع لحظہ بھر کیلئے آخری بار مشعل پر پڑ جاتی ہے کتا مرد کی نعش پر اپنی تھوتھنی گرائے پڑا ہے اس کے منہ سے بہتی ہوئی رال نے زمین تر کر دی ہے گدھا ہچکیاں لیتے نعشوں کے بالکل قریب آ پہنچے ہیں منظر پر ایک بار پھر مکمل تاریکی چھا جاتی ہے)

پردہ

www.taemeernews.com

اختر حسین رائے پوری

پتھر کی مورت

تالاب کے کنارے اونچے سے ٹیلے پر شراب خانہ تھا۔ گھاس پھوس کی جھونپڑی جس کے اندر لکڑی کے بیڈول پڑے ٹوٹی پھوٹی ٹانگوں پر کھڑے ہوئے شرابیوں کا بوجھ اٹھاتے تھے۔ اور اوندھی سیدھی میزیں جو چیڑ کے صندوقوں کو کاٹ چھانٹ کر بنائی گئی تھیں۔ دھوئیں سے لپٹی ہوئی دیواروں پر دیوٹ جس میں شام ہوتے ہی دھندلے چراغ ٹمٹمانے لگتے تھے۔ اور ایک کونے میں کلدار کی چمکی جو تاڑی کے مٹکوں اور ٹھرے کی بوتلوں کے انبار میں اپنے سیاہ فام جسم کے ساتھ یوں روپوش ہو جاتا تھا گویا خود سرکے کا بہت بڑا پیاسہ۔ شراب خانہ کے دروازہ پر ایک جواں عورت سرِشام سے بیٹھی انگاروں پر کباب بھنا کرتی تھی۔ اور آگ کی آنچ میں دمک سے اس کا تمتمایا ہوا چہرہ بڑا بھلا لگتا تھا۔

دن بھر شراب خانہ میں سناٹا رہتا۔ لیکن شام ہوتے ہی اس میں زندگی کے آثار پیدا ہو جاتے تھے۔ مستری، قصاب، بڑھئی اور اسی قماش کے لوگ ایک ایک کر کے آنے لگتے۔ پہلے وہ تالاب میں ہاتھ منہ دھوتے اور کئی تو اس کے پانی میں تگ دھڑنگ نہانے بھی لگتے تھے۔ جیسے ہی دیوٹ پر دیئے روشن ہوتے اور کباب والی ہوا میں اپنی خوشبو پھیلاتی شراب خانہ میں بھاگ سی پڑ جاتی تھی۔ بوتل کے کاگ اچھلتے مٹکے گردش کرنے لگتے۔ کباب کی سیخیں تلملا اٹھتیں۔ پیچھے کی کوٹھڑی میں کوڑیاں کھڑکتیں۔ دن بھر کی تھکن کافور ہو جاتی اور دلوں کے دکھ ٹھرے کی جگہ بوند دل سے دم بھرنے کیلئے دھل جاتے تھے۔

اس رات شراب خانے میں غیر معمولی بھیڑ تھی۔ میونسپل کمیٹی نے اسے منتشر کر دیا۔ دیہاتی سوداگر ہیضہ سے زیادہ کمیٹی کو کوستے ہوئے اونے پونے سودا چکا کر واپس چلے گئے۔ لیکن شہر کے قصاب اور گڈریے کوڑیوں کے مول بھیڑ بکری خرید کر جشن منانے شراب خانہ میں آ

گڈریوں کے چودھری نامی نے ہر شخص کو ٹھرے کے ایک ایک ادھے کی پیشکش کی۔ اور کباب والی کو گود میں کھینچ کر کہا:- "اری آج تو میں تجھے بھرتا کرکھا جاؤں گا۔"

چمپا نے للچائی ہوئی چیتونوں سے نامی کے شلوکے کی جیب کو تاکا۔ جس کا بخیہ روپیوں کے بار سے ادھڑ گیا تھا۔ لیکن کلوار کے ڈر سے اس کی آنکھیں جھک گئیں۔

راجو دھوبی خدا جانے کب سے دروازہ کی اوٹ میں کھڑا یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ ہفتوں سے اس کی یہی کیفیت تھی۔ کلوار کا قرض لوٹانے کی اس میں سکت نہ تھی اور کلوار نے اس کا آنا جانا بند کردیا تھا۔ بیچارہ راجو رات کے اندھیرے میں آتا۔ باہر کھڑا کھڑا کباب اور شراب کی مہک سونگھتا اور نامراد اُلٹے پاؤں گھر لوٹ جاتا۔ لیکن آج نامی کی دریا دلی نے اسے سہارا دیا اور عین اس وقت جب نامی کے حکم سے حاضرین محفل کے خالی کلھڑ دوبارہ بھرے جا رہے تھے۔ راجو اندر گھس آیا۔ وہ تیر کی طرح نامی چودھری کے سامنے آیا اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "چودھری، آج تو مجھ دکھیا پر بھی دیا ہو جائے۔"

نامی کا دل اس وقت دوست داری کے جذبہ سے بھرپور تھا۔ مویشیوں کے بازار میں اس نے اتنا سستا سودا کیا تھا کہ ہزار روپیہ سے کم منافع کی امید نہ تھی۔ اور پھر یہ راجو لاکھ گیا گزرا سہی لیکن اس میں ایک بڑا وصف تھا۔ کہ اس کے گلے میں بلا کا رس تھا۔ اور جب وہ گاتا تو اس کی تان بادلوں کی خبر لاتی تھی۔ سننے والوں کا بیان تھا کہ کئی بار سانپ اس کے گانے پر سر دھنتے پائے گئے۔ اور یہ تو سب جانتے تھے کہ راجو کے گلے سے آواز نکلتے ہی تالاب کے مینڈکوں کا لامتناہی کورس بالکل ساکن ہو جاتا تھا۔

لہٰذا کلوار کے احتجاج کی پروا نہ کرکے نامی نے آج کی رات راجو کی سرپرستی کا تہیہ کرلیا اور اپنی گری ہوئی مرغیوں کو تاؤ دینے کی بیہودہ کوشش کرتے ہوئے رنیا نہ تپاک سے کہا:

"راجو آؤ بھلے پراجو۔ بولو، کیا پیوگے، تاڑی یا ٹھرا؟"

راجو نے ایک سانس میں تاڑی کی لبنی ختم کردی۔ اور دیر تک بیٹھا ہونٹ چاٹتا رہا۔ کلوار جو اس کی حرکتوں پر جلا جا رہا تھا۔ اپنی جائے پناہ سے پکار اُٹھا۔ "بہت بڑا چار سو بیس ہے یہ راجو۔ نکام نہ دھام۔ نہ گانٹھ میں دام۔ دن بھر سڑک کنارے پڑا مرکیوں کرکہانیاں سناتا اور مفت سڑک وصول کرتا ہے۔ رات کو یہاں ادھار یا مفت کی ٹوہ میں آتا ہے۔ میں نے تو اس کا آنا جانا بند کردیا ہے۔"

راجو کے پڑوسی رستم قصاب نے اس الزام کی تائید کی:- "اجی بڑا پاجی ہے یہ راجو ایسا نکھٹو تو کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس کی بڑھیا ماں سویرے سے شام تک گھر گھر پانی

www.taemeernews.com

ڈھوتی ہے۔ چکی پیستی ہے اور اسے روٹی کھلاتی ہے۔ اور یہ سالا سانڈ چنا یہاں وہاں آوارہ گردی کیا کرتا ہے؟"

سب نے حتیٰ کہ نامی نے بھی راجو کی طرف حقارت سے دیکھا۔ لیکن اس کے ماتھے پر بل تک نہ آیا۔ اپنی بھیگی ہوئی مونچھوں کو زبان کی نوک سے چاٹتے ہوئے وہ مسکرا کر بولا: "بھائیو، رام جی کی مرجی یہی ہے کہ کچھ کام کریں اور کچھ بیٹھے کھائیں۔ یہ سادھو محنت اور لالہ بنئے کون سا پہاڑ توڑ دیتے ہیں۔ پھر بھی حلوہ پوری کے سوا اور کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ تو پھر میں نے بھی کون سا پاپ کیا ہے؟"

ممکن ہے کہ یہ بحث طول کھینچتی لیکن اسی وقت دروازہ چرمرایا اور پنچم مستری کی شکل نمودار ہوئی۔ اب تو شراب خانے میں زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی۔ کیونکہ گو پنچم بوڑھا تھا لیکن گانے میں راجو کا مقابل اس کے سوا کوئی نہ تھا۔ ان دونوں کا ساتھ مل بیٹھنا بڑی بات تھی۔ اور لوگ ایسی سنگت کے آرزومند رہتے تھے۔

پنچم کی آؤ بھگت بھی ہر طرف سے صدا بلند ہوئی۔ بلکہ راجو بھی اپنے ٹوٹے ہوئے اسٹول پر اچھل کر پکارا "استاد، بہت دنوں بعد پکڑ میں آئے؟"

پنچم نے اپنی کم بیں آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کر کے اسے دیکھا اور پہچان کر مسرت سے مسکرایا "ٹھہر جا بے بدمعاش! آج میں تیرا پول کھول کر رہوں گا۔ ارے تو نہ تال کا نہ سُر کا۔ چلا ہے مجھ سے باتیں بنانے؟"

کسی نے ٹوک کر کہا: "مستری یہ نہ کہہ۔ یہ جو بھی سہی۔ مگر ہے بھورے خاں استاد کا سکھایا ہوا۔"

پنچم کے گنے کا گھونٹ وہیں اٹک گیا: "ایں تم جیسے نہ سیکھے بھی میرے منہ آنے لگے۔ آج اس بھورے خان کو ہی کیا آتا تھا۔ ٹھمری کے سوا وہ گا بھی کیا سکتا تھا۔ اور اس کی آواز ——" پنچم نے فاتحانہ انداز سے سب کو دیکھا۔ "اس کی آواز کو مل سے اوپر چڑھتے چڑھتے بانس کی طرح پھٹ جاتی تھی۔ پنچم سُر پہ تو ایک پنچم مستری ہی گا سکتا ہے۔"

تلسی پنواڑی نے فقرہ دیا: "کیوں نہ ہو، پاربتی دیوی کی دین ہے مستری کو"۔ مگر راجو کے ایک حامی نے بات چلنے نہ دی۔ "ابجی اس دیوی میں بھی کوئی جان ہے۔ پتھر کی مورت ہے۔ نہ مستری کے کام کی نہ اور کسی کے کام کی۔"

پنچم اس ڈھیٹ کو مار ہی بیٹھتا لیکن نامی چودھری نے بیچ بچاؤ کر دیا۔ اس نے راجو کو ڈانٹا "کیا میں نے تجھے رنگ میں بھنگ ڈالنے کے لئے بلایا ہے؟"

 www.taemeernews.com

راجو کو بھی طیش آگیا: "چمپا! نکالنا تو طبلے کی جوڑی۔"

نامی نے حکم دیا: "پلا دو سب کو ایک ایک ادھا۔"

کسی نے طبلے پر تھاپ دی، راجو نے ملہار کا الاپ کھینچا۔ اور کلوار اپنی شکایت کو بھول کر چلایا: "اری دیکھتی کیا ہے۔ باندھ لے گھنگھرو۔"

بادل برس کر کھل چکے تھے اور ہوا میں مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ ایک عجب والہانہ شان سے ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اور آسمان اتنا صاف ہو گیا تھا۔ کہ زمین سے تاروں کی آنکھوں کا اشارہ نظر آتا تھا۔ راجو کے گلے سے راگ کے بول نکلے۔ سُر گویا ہوائی سیڑھیوں پر چڑھتے گئے، چڑھتے گئے ــــ اور رفتہ رفتہ بادلوں کی طرف جا کر غائب ہو گئے۔ یک بارگی بجلی کی طرح وہ نیچے جھپٹے اور قریب آ کر ہر طرف بکھر گئے۔ ملہار کا سرگم کبھی بادلوں کی طرح امنڈا منڈ کر آتا کبھی گرجتا اور کبھی ہلکے ہلکے برس کر پھر کھل جاتا تھا۔ اور چمپا اپنے سینے لہنگے کے سرے کو کمال نزاکت سے ایک ہاتھ میں تھامے اور دوسرے سے اوڑھنی کا پھوندنا پکڑے زمین پر ٹھوکر لگاتی شرابی دلوں کو گھنگھرو کی چھاچھم پر نچاتی اِدھر اُدھر گردش کر رہی تھی۔

اور جب راجو چپ ہوا تو دم بھر دیا ہی سناٹا رہا جیسا زور کی بارش کے یک بیک تھمنے کے بعد ہوتا ہے۔ پھر وہ جادو ٹوٹا اور جوش کے عالم میں ہر سمجھدار اور ناسمجھ وجد کرنے لگا۔ کلوار اپنے جسمانی ہیولی کو اٹھائے ہوئے قریب آیا اور ایک پوری بوتل راجو کے منہ سے لگا کر کہا: "جیتے رہو راجو۔ کمال کر گئے۔"

اب پنچم مستری کی باری تھی۔ اس نے بہاگ کا نقشہ کھینچا اور سب سانس روک کر بیٹھ گئے۔ گویا اُس دیس کی تھکی ہاری انسانیت کا قدیمی غم کراہنے لگا۔ اور وہ لوگ جن کے شب و روز غلاظت اور کثافت میں رنگے ہوئے تھے۔ آپ ہی آپ کسی نامعلوم درد کے احساس سے رو پڑے۔ نغمہ مرغِ بسمل کی طرح کراہا، تڑپا اور مجروح پرندے کی طرح کبھی اوپر اُٹھا اور کبھی نیچے گرا۔ بوڑھے گویّے کی ہر تان ایک ہوک تھی جو پھانس بن کر ہر سننے والے کے دل میں کھٹک اٹھی۔

اسی طرح وہ دیر تک گاتے رہے۔ اور سنگیت کی موج نے ان کے دلوں کی کدورت کو دھو دیا۔ جب بہت رات بیت گئی تو وہ سب لڑکھڑاتے ڈگمگاتے اُٹھے اور چودھری نامی نے چمپا کی کمر میں ہاتھ ڈال کر گانا شروع کیا۔

ندیا نالے بہا آئی گنگا۔

سب نے آواز ملائی اور چمپا نے گھنگھرو کی ٹھوکر لگا کر اس تاک بھانک سے سانس بھر کے روایتی جھگڑے کا خاکہ اڑایا کہ سب عش عش کر اُٹھے —— اور نامی چودھری کو چمپا کباب سے زیادہ لذیذ معلوم ہوئی۔

پنچم کو قدرت نے گویا بنایا تھا۔ اس شوق میں وہ دُر دُر مارا پھرا۔ برسوں کسی اُستاد کا حقہ بھرا، کسی گنی کے پاؤں دبائے کسی کے لئے بھنگ گھونٹی۔ جوانی میں اس کے گانے کا ایسا شہرہ ہوا کہ پاربتی کے مندر میں وہ نوکر رکھ لیا گیا۔ اس علاقہ کا یہ سب سے بڑا مندر تھا۔ اور راج رجواڑوں نے اس کی رکھوالی کے لئے اچھی خاصی جاگیر دے رکھی تھی۔ پنچم صبح شام مندر میں عاجزی بھرتا اور بھجن کیرتن گاتا ہوا کبھی اس حسینہ کو گھورتا کبھی اس مہ پارہ سے آنکھیں لڑاتا۔ آخر اس کی رنگ رلیوں نے گل کھلایا۔ پجاری نے اسے نکال باہر کیا۔ یوں تو یہ پجاری بذات خود اخلاق کا چوکیدار نہ تھا۔ بنجر عورتوں کو زرخیز بنانے کے منترا سے خوب یاد تھے۔ مگر ایک تو وہ ٹھہرا برہمن، دوسرے پجاری ابن پجاری۔ البتہ چیلے چانٹوں کو وہ تاک جھانک کی اجازت نہ دیتا تھا۔ اور مندر کے سیوکوں کو لنگوٹ کے سچے بن کی تلقین کیا کرتا تھا۔

پنچم کو بھی اپنے فن پر بڑا گھمنڈ تھا۔ مندر سے برخاست ہونے کے بعد اس نے اپنے گھر پاربتی کی مورت بٹھائی۔ ایک اندھیری سی کوٹھڑی میں اس نے طاق پر یہ دیوی بٹھلائی اسے سیندور سے لال گلال کیا۔ اسے چاندی کی آنکھیں عطا کیں۔ ہر روز اس پر پھول نچھاور کیئے اور گھی کے چراغ لیکے حضور میں روشن کیئے۔ ہر روز صبح اُٹھ کر وہ مورت کو نہلاتا اور شام کو اس کے سامنے دو زانو بیٹھ کر سنگیت کی مشق کرتا تھا۔ لیکن نہ تو شہر والے اس دیوی پر مہربان ہوئے اور نہ دیوی نے ان پر کرم کیا۔ اس دوران میں کئی مرتبہ چیچک ہیضہ اور پلیگ کی یلغار ہوئی۔ لیکن پنچم کی دیوی اپنے طاق پر بے حس بیٹھی رہی۔ کسی کی بینتی پر اُس نے دھیان نہ دیا اور نہ پنچم کی خستہ حالی پر اسے رحم آیا۔ آخر کار لوگوں نے اس دیوی کے درشن بند کر دیئے اور پنچم فاقوں سے تنگ آ کر موٹر کے کارخانہ میں مستری بن گیا۔

اس کے باوجود عمر کے ساتھ ساتھ دیوی پر پنچم کا اعتقاد بڑھتا گیا۔ دیوی کی کوٹھڑی بوسیدہ ہو گئی۔ دیواروں کی سفیدی جھڑ گئی۔ چھت کی کڑیوں کو گھن کھانے لگی، چاندی کی آنکھوں کی جوت ماند پڑ گئی۔ یہاں تک کہ پنچم کے بیوی بچوں نے بھی دیوی کے درشن بند کر دیئے۔ لیکن پنچم کی عقیدت میں فرق نہ آیا۔ ہر روز صبح وہ کنوئیں سے پانی لاتا اور

www.taemeernews.com

اسے نہلاتا۔ ہر شام کو وہ ٹوٹا ہوا ستار لاتا اور ایک دوگت اسے سُناتا۔ اور جب اس کے پاس پھول یا کلی کے لئے پیسے نہ ہوتے تو وہ دیوی کے آگے پھوٹ پھوٹ کر روتا: "دیوی! سب نے تجھے بھلا دیا اور تو نے مجھے بھی بھلا دیا۔ پر میں تو تیرا پجاری ہوں۔ تو سنسار کی ماتا ہے۔ ایک بار جاگ ماں اور ان پاپیوں کو دکھلا دے کہ اصل پاربتی تو ہے وہ نہیں جو چھل چھبیلی بنی ہوئی مندر میں بیٹھی پاپوں کا تماشہ دیکھا کرتی ہے۔ اور پنچم کو محسوس ہوتا کہ پاربتی کی آنکھیں اندھیرے میں مسکرا رہی ہیں۔

لوگوں کی یاد میں ایسا ہیضہ ملک میں پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ ہر طرف کہرام برپا تھا۔ اسپتال بیماروں سے مرگھٹ اور قبرستان مردوں سے اٹے ہوئے تھے۔ کفن چوروں اور گدھوں کی بن آئی تھی۔ کپڑے اور لکڑی کے دام چوگنے ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر ملک الموت کے ساتھ ساتھ پھرکی کی طرح چکر لگا رہے تھے۔ اور بیمہ کمپنیوں کے ایجنٹ اپنے کاغذات لے کر فرار ہو گئے تھے۔ میونسپل کمیٹی کے داروغے بازار میں سڑی گلی ترکاریوں اور پھلوں کو پھنکوا رہے تھے۔ تاہم گھروں میں اور گھروں کے باہر اچھے خاصے تندرست جانے کیسے بیمار ہو ہو کر چشم زدن میں مر جاتے تھے اور ان کی لاشوں کو اٹھانے والے بھی نہ ملتے تھے۔

ڈاکٹروں اور حکیموں سے منہ موڑ کر لوگوں نے مندروں اور درگاہوں کا رُخ کیا خصوصاً پاربتی کے مندر میں دن رات انسانوں کا ہجوم لگا رہتا تھا۔ وہ سب پرشاد کی مٹھائی کھا کر اور باؤلی کا پانی پی کر سمجھتے تھے کہ ہیضہ سے نجات مل گئی۔ لیکن ایک دن سب کے دیکھتے دیکھتے پجاری خود ہیضے کا شکار ہو گیا۔ اور اس کے بعد اس کے چیلوں میں یہ وبا اس تیزی سے پھیلی کہ بھگتوں نے یہ راستہ چلنا چھوڑ دیا۔ مندر کے کلس پر چند ایسی ڈراؤنی آوازیں موت کا راگ گانے لگا اور اس کی محرابوں میں چمگادڑیں پر پھڑپھڑانے لگیں۔ ڈاکٹروں، پیروں اور پجاریوں سے ناامید ہو کر لوگ حیرانوں کی طرح اپنے گھروں میں پڑے موت کا انتظار کرنے لگے۔

اتنے میں افواہ مشتہر ہوئی کہ پنچم مستری کی دیوی جاگ گئی ہے۔ ہیضہ کے کئی بیمار اس کے درشن سے اچھے ہو گئے ہیں۔ پہلے تو بہت کم لوگوں کو اس کرشمہ پر یقین آیا۔ جب اتنے بڑے مندر کی دیوی اس آسمانی مصیبت کا مقابلہ نہ کر سکی تو بوڑھے مستری کے گھر میں پڑی ہوئی پتھر کی مورت میں کیا سکت تھی۔

لیکن اسے اتفاق کہیئے یا اور کچھ ——، افواہ بے بنیاد نہ تھی۔ پنچم کا محلہ اب تک

www.taemeernews.com

ہیضہ سے محفوظ تھا۔ دور دور کے لوگ مکھیوں کی طرح مرے جا رہے تھے۔ لیکن اس محلہ کے لوگوں کو وبا چھو کر بھی نہ گئی تھی۔ اور کسی کو ہیضہ کا خدشہ ہوتا تو پنچم نے دیوی کے درشن کرا دیئے اور چلو بھر پیاز کا پانی پلا کر اسے اچھا کر دیا۔

اچانک پنچم کی مراد بر آئی اور بڑے مندر پر اس کی دیوی کو فتح حاصل ہونے لگی۔ عقیدت مندوں نے چند روز میں اُس کی کوٹھڑی کو درست کر دیا۔ چھت پر نئی کڑیاں پڑ گئیں، دیوار پر سفیدی ہونے لگی۔ دیوی کے دیدوں میں سنا بھر دیا گیا۔ سیندور کی بجائے اس پر صندل کی مالش ہونے لگی۔ اس کی ڈیوڑھی پر رنگ برنگی جھنڈیاں اڑنے لگیں اور رات کو اس کے در پر چراغاں ہونے لگا۔ صبح اس کے دروازہ پر پھول پتیوں کے انبار لگ جاتے تھے۔

رات کو بے شمار بھگت اس کے گھر کے سامنے جمع ہوتے اور پنچم کی سرکردگی میں جھوم جھوم کر بھجن گایا کرتے تھے۔ بکرے کے خون سے دیوی روز نہلائی جاتی اور حال قال کی حالت میں کوئی بھگت تلوار اپنی زبان کے آر پار کر لیتا تھا اور دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اسے ذرا بھی چوٹ نہ آتی تھی۔ وحشت و جنون کی عجب کیفیت ہوتی اور فرطِ مسرت سے دیوی کے قدم چوم کر پنچم چلا پڑتا کہ "سنسار کی ماں! تو نے مجھ پاپی کی پکار سُن لی۔ جنہیں تجھ پر بھروسہ نہ ہو انہیں موت کے منہ میں دے کر جو تیری ڈیوڑھی پر آئے ہمیں انہیں بچانے"۔

دیکھتے دیکھتے پنچم سارے شہر کا پجاری بن گیا اور اس کے گھر کے آگے ایسی بھیڑ لگی کہ اس نے مورت کو تاریک حجرے سے نکال کر برآمدہ میں چوکی پر بٹھلا دیا۔ اجالے میں آ کر دیوی کے مکھڑے پر تجلی سی دوڑ گئی۔ اور شہر کے برہمن چوروں کی طرح دور سے اسے نمسکار کر کے دل ہی دل میں پنچم کی مقبولیت پر رشک کرنے لگے۔

اب پنچم کو اپنی زندگی کے سب سے محبوب خواب کی تعبیر نظر آئی۔ بچپن سے وہ دیکھتا آیا تھا کہ ساون کی چودھویں کو بڑے مندر کی دیوی کی سواری نکلتی ہے۔ بہت بڑے رتھ پر وہ سجا بنا کر رکھی جاتی ہے اور سینکڑوں آدمی اس رتھ کو کاندھوں پر اٹھائے گلی کوچوں میں پھرتے ہیں۔ ڈھول منجیروں اور شہنائیوں کے پرے کے پرے ساتھ ہوتے ہیں۔ اور شہر بھر کی رنڈیاں رتھ کے آگے ناچتی چلتی ہیں۔ ناقوسوں اور گھنٹوں کے شور سے ہوا کانپ جاتی ہے۔ سارا شہر درشن کو آتا ہے اور ایسا جلوس سال بھر میں کبھی نہیں نکلتا۔

اس جلوس کو دیکھنے کے بعد پنچم اپنی دیوی کے پاس آتا اور آب دیدہ ہو کر گڑگڑاتا :۔
"ماں! میرا ایک ارمان پورا کر دے ۔ مجھے بھی ایسے ہی رتھ پر بٹھلاؤں اور تیرا جلوس ایسا ہو کہ رہتی دنیا تک لوگ یاد رکھیں۔"

کتنی مدت بعد اس ارمان کی تکمیل ہوئی ۔ شہروالوں نے پنچم کے ارشاد کو کان لگا کر سنا۔ اور جب ساون کی چودھویں آئی تو انہوں نے بڑے مندر کے توشہ خانے کو کھولا ۔ اس میں سے رتھ، انباری اور دمامے نکالے ۔ پنچم کی دیوی کے لئے بنیوں نے مخمل اور کمخواب کے لباس دیے ۔ دھیرج سنگھ زمیندار نے اپنے دونوں ہاتھی جلوس کی زینت کے لئے بھیجے ۔ ان پر بڑے بڑے نقارے رکھے گئے ۔ پیچھے گھوڑوں پر سیوا سمتی کے نوجوان ناقوس لئے نمودار ہوئے ۔ بینڈ والوں نے اپنی خدمات مفت پیش کیں اور پھٹی پرانی وردیوں کو جھاڑ کر عجیب و غریب باجوں کے ساتھ جلوس میں شامل ہوئے ۔ بالا خانوں پر عورتیں آرتی کی تھالیاں لے کر جمع ہوئیں اور سڑکوں کے دائیں بائیں ہزاروں بچے بوڑھے اکھٹے ہوئے ۔ رتھ کے روپہلے کلس دھوپ میں جگمگانے لگے اور سینکڑوں ہانپتے کانپتے انسان جوش کے عالم میں اسے پیٹھ پر لاد کر لے جانے لگے ۔ رتھ کے اندر ڈھول منجیروں نے قیامت برپا کر رکھی تھی اور ان کی آواز کو دبا کر ذرا ذرا دیر میں پیتل کے وزنی گھنٹے بڑے وقار سے بجنے لگے تھے ۔ رتھ کے اندر دیوی کے عین مقابل آسن جمائے پنچم مستری بیخود دمست حمد گا رہا تھا ۔ پاربتی کی مورت پھولوں کی ڈھیری میں چھپی ہوئی تھی ۔ فقط اس کی سنہری آنکھیں دھوپ میں انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں ۔ اس کے آگے جو لال چادر بچھی ہوئی تھی وہ روپیوں اور چھوٹے موٹے گہنوں سے لدگئی تھی ۔ قدم قدم پر بالا خانوں سے پھولوں کی بارش ہوتی اور جے جے کار کی صدا سے فضا گونج اٹھتی ۔

یہ پنچم کی زندگی کا سب سے بڑا دن تھا ۔ اس کا چہرہ خوشی کے مارے دمک رہا تھا ۔ رقت کے مارے اس کی آواز کانپ رہی تھی ۔ اس کے گال محبت کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے تھے ۔ اس کے پاس راجو دھوبی بیٹھا دونوں ہاتھوں سے مالِ غنیمت کو بٹور رہا تھا ۔ کبھی وہ چاندی کی چیاگلوں کو ہاتھوں میں تولتا ۔ کبھی سونے کے چھلوں کے دام آنکتا ۔ اور بیچ بیچ میں دیوی کے آگے سجدہ کر کے کوئی نیا راگ چھیڑ دیتا تھا ۔

رتھ چیونٹوں کی چال چلتا ہوا بڑے مندر کے سامنے پہنچا اور یک بارگی پاربتی کی جے کے نعروں سے اس کے سنسان در و دالان گونج اٹھے ۔ ڈھول منجیروں اور گھنٹوں کا شور اتنا بڑھ گیا کہ کان کے پردے پھٹنے لگے ۔ راجو دھوبی کے اشارے پر ہر طرف مشعلیں

www.taemeernews.com

سلگ اٹھیں، گیس کے لیمپ روشن ہو گئے۔

بڑے مندر کو گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔ لوگ کہہ رہے تھے چوروں نے دیوی کے گہنے چرا کر مورت کو باؤلی میں پھینک دیا ہے۔ کسی نے ادھر آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ بلکہ ایک بگڑے دل نے سب کو سنا کر کہا کہ پنچم کی پاربتی کو بڑے مندر میں جگہ ملنی چاہیئے۔

یہ پنچم کی فتح و شادمانی کی معراج تھی۔ وہ تن من کی سدھ بھول کر اپنی دیوی کو رجھانے کیلئے گوری راگ گانے لگا۔ اور اسے محسوس ہوا کہ دیوی اسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔

یک بیک وہ تیورا کر آسن سے گرا اور منجیرے اس کے ہاتھ سے نیچے ڈھلک پڑے۔ اور دفعتاً چہار سو سناٹا چھا گیا۔ باجے بند ہو گئے۔ ہاتھی گھوڑے کھڑے ہو گئے۔ سب سکتے میں آ گئے۔

پنچم کا جسم لرزا۔ اس میں اینٹھن ہوئی اور وہ برف کی طرح ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ قے اس کے منہ سے نکل کر کلوں اور گردن پر بہنے لگی۔

ہیبت کے مارے سب لوگ پیچھے ہٹ گئے۔ کئیوں کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ رتھ بانوں نے اپنے کاندھے الگ کر لیے۔

پنچم کے سر کو ذرا سی جنبش ہوئی اور اس نے دھیمی آواز میں کہا: "چپ کیوں ہو گئے راجو! ۔گوری راگ گاؤ بھیا! ۔ دیوی کو یہ راگ بہت پسند ہے"

اور گوری کا سرگم ایک فریاد کی طرح آسمان کی طرف اڑا۔ کبھی وہ سہمے ہوئے عبادت گزار کی طرح گڑگڑا کر رویا اور کبھی بہرے دیوتاؤں کے کان میں چلایا کہ پجاریوں کے اخلاص کو نہ ٹھکراؤ۔ راگ کے بول میلے میں بھٹکے ہوئے بچوں کی طرح مچل مچل کر روئے اور کسی طرح انہیں تسلی نہ ہوئی ——

مرد کی زندگی میں کمزور ترین لمحہ اس وقت آتا ہے، جب کہ عورت اسے کہے

"توبہ! تمہارے آگے کون دم مار سکتا ہے۔"

. . . .

عورت کو اس وقت تک مستقبل کی فکر رہتی ہے۔ جب تک وہ بیاہی نہیں جاتی۔ اور مرد کو مستقبل کا فکر اس وقت سے شروع ہوتا ہے۔ جب وہ بیاہا جاتا ہے۔

www.taemeernews.com

شفیق الرحمٰن

پچھتاوے

تمہارے متعلق پہلی مرتبہ میں نے کلب میں باتیں سُنیں، تم پر نکتہ چینی ہو رہی تھی کہ تم انتہا درجے کی خود سر اور خود پسند ہو۔ تمہیں اپنے حسین ہونے پر بیحد ناز ہے، تمہیں اپنے ابا کے عہدے پر اس قدر غرور ہے کہ تم کسی سے اچھی طرح بات نہیں کرتیں۔ تمہارے چہرے پر ہر وقت کی مسکراہٹ زہر دکھائی دیتی ہے۔ تمہاری گفتگو طنز آمیز ہوتی ہے۔ تمہارے لباس اس قدر شوخ اور بھڑکیلے ہوتے ہیں کہ ایک لڑکی کو زیب نہیں دیتے۔ اسی طرح کی بہت سی باتیں۔

نہ جانے میں نے اس ذکر میں کیوں اتنی دلچسپی لی۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہاں اور لڑکیاں نہیں تھیں اور میں نسوانی رفاقت چاہتا تھا۔ سنگلاخ چٹانوں اور سیاہ پہاڑوں سے گھرے ہوئے اس مقام میں زندگی کی رفتار کافی تیز تھی۔ رقص تھے، پارٹیاں تھیں، مسکراتے ہوئے حسین چہرے تھے، موسیقی تھی، آزادی تھی، سب کچھ تھا۔ میں وہاں نیا نیا گیا تھا میں تمہیں بالکل نہیں جانتا تھا۔ نہ میں نے تمہیں دیکھا تھا، اور تمہارے خلاف باتیں سُننے کے باوجود نہ جانے مجھے تم سے دلچسپی کیوں ہو گئی۔ اس کے بعد اکثر میں اسی قسم کی باتیں سُنا کرتا تمہارے رویّے کے متعلق، تمہارے لباس کے سلیقے کے متعلق، تمہارے نظریوں کے متعلق۔ ہر مرتبہ سخت قسم کی تنقید سننے میں آتی۔ اور ہر مرتبہ مجھے یہی محسوس ہوتا کہ یہ سب کچھ غلط ہے، تم کچھ اور ہو۔ تم بالکل مختلف ہو۔ تمہیں کسی نے سمجھا نہیں۔ لڑکیاں تمہیں بُرا اس لئے کہتی ہیں کہ وہ تم پر رشک کرتی ہیں، اور لڑکے اس لئے کہ تم اُن کی پہنچ سے باہر ہو۔

لیکن بعد میں مجھے اس خیال نے کیسا کیسا ستایا کہ کیوں نہ میں بھی اُسی ہجوم میں شامل ہو گیا۔ کیوں نہ میں بھی ان کی باتوں میں شریک ہو گیا، کیوں نہ میں نے تمہارے خلاف باتیں کر کر کے تمہیں دیکھنے سے پہلے ہی تم سے نفرت پیدا کر لی۔

اور پھر میں نے تمہیں دیکھا۔ میں پکنک پر مدعو تھا۔ کچھ دُور پہاڑوں کے ایک خوشنما

www.taemeernews.com

کنج میں۔ مجھے بتایا گیا کہ تم بھی آؤ گی۔ اور تم آئیں بھی تو کس طرح، ساری نگاہیں تم پر جم کر رہ گئیں۔ جب تمہارے ابا نے مجھ سے تمہارا تعارف کرایا تو میں نے تمہاری ایک جھلک سی دیکھی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے تم نے مجھ پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی تھی۔ بعد میں تم نے بتایا کہ تم نے اس ایک نگاہ میں مجھے اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ میں بیحد افسردہ تھا۔ میری آنکھوں میں اداسی جھلک رہی تھی، میرے بال پریشان تھے، میرے کوٹ کے کالر میں ایک مرجھایا ہوا پھول لگا ہوا تھا۔ حالانکہ اس روز مجھے اداس نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ اس روز فضا نہایت خوشگوار تھی، اونچی چوٹیوں سے خنک ہوائیں آ رہی تھیں، نہایت چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ لاتعداد ننھے ننھے پھول گھاس میں سے سر نکال نکال کر جھوم رہے تھے۔ پہاڑی چشمے گاتے ہوئے بہہ رہے تھے۔ دنیا مسرور تھی، چہرے مسرور تھے۔ ایک سازندہ رباب بجا رہا تھا، نہایت دلکش گت بج رہی تھی۔ اس سے مجھے چند ماہ پہلے کی ایک یاد تازہ ہو گئی۔ جب میں رات گئے۔ ایران کے ایک کیفے میں تنہا بیٹھا تھا۔ رباب پر بالکل ایسی ہی گت بج رہی تھی۔ مدھم روشنیوں میں ہلکا ہلکا معطر دھواں پھیلا ہوا تھا۔ سامنے رقص ہو رہا تھا۔ رقاصہ موسیقی میں جذب ہو کر رہ گئی تھی۔ یکایک اس نے مجھے دیکھا اور میرے سامنے آ گئی۔ جب تک رباب بجتا رہا وہ مجھے دیکھتی رہی اور رقص کرتی رہی۔ پھر وہ میرے ساتھ آ بیٹھی، اور باتیں کرنے لگی۔ وہ اپنے محبوب کے لئے غمگین تھی۔ جس کی شکل مجھ سے بہت ملتی تھی۔ وہ اسی میز پر بیٹھا کرتا تھا، مجھے دیکھ کر اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے، وہ بار بار مجھ سے یہی پوچھتی تھی۔ کہ کہیں میں اپنا نام تو نہیں چھپا رہا ہوں، میں جھوٹ تو نہیں بول رہا ہوں۔ آخری رقص کے اختتام پر اس نے مجھ سے التجا کی کہ میں اسے گھر چھوڑ آؤں۔ اس یاد نے مجھے اداس بنا دیا۔ تمہارے ابا نے کئی مرتبہ مجھے ٹوکا۔ میں نے کئی مرتبہ مسکرانے کی کوشش بھی کی۔ —— نزدیک ہی کسی پرانے قلعے کے کھنڈر تھے۔ اسے دیکھنے گئے۔ کئی مرتبہ سیڑھیوں پر اترتے چڑھتے میرا تمہارا آمنا سامنا ہوا۔ لیکن میں تمہیں بالکل نہ دیکھ سکا۔ بس مجھے اتنا احساس ہوا کہ تم قریب سے گذر گئی ہو۔ جب تم ایک اونچے سے پتھر سے اترنا چاہتی تھیں۔ اور میں نے تمہیں بازو سے سہارا دیا تو میں نے تمہاری ایک جھلک پھر دیکھی، اس مرتبہ تمہاری پیشانی پر دہکتی ہوئی بندی میری آنکھوں کے سامنے کوند کر رہ گئی۔ جب تم میرے قریب سے گذر رہی تھیں تو میں نے وہ پھول دیکھے جو تمہارے بالوں میں لگے ہوئے تھے، کسی سی خوشبو کا ایک جھونکا آیا اور چلا گیا۔

 www.taemeernews.com

دو دن میں نے تمہارے قریب گزارا۔ پھر بھی میں تمہارا چہرہ اچھی طرح نہ دیکھ سکا۔ تم نے بعد میں مجھے بتایا کہ اس روز تمہیں میری افسردگی نے متوجہ کر دیا تھا۔ اور دن بھر تمہیں میرا خیال رہا تھا۔

اس کے بعد کسی نامعلوم کشش سے ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ ہر روز کوئی حادثہ یا کوئی اتفاق ہمیں ملا دیتا۔ میں نے دیکھا کہ تمہارے چہرے پر وقار ہے تمکنت ہے، بعض اوقات تم مغرور دکھائی دیتیں، تم سب سے الگ تھلگ رہتیں۔ خواہ اسے خود پسندی کہا جائے یا خود سری لیکن تم میں انفرادیت ضرور تھی، تم ان سب لڑکیوں سے مختلف تھیں، ان سب میں نمایاں تھیں، سب سے حسین تھیں اور حسین بھی ایسی کہ تمہارے حسن میں بھی انفرادیت تھی۔

تم جتنی حسین تھیں اتنا ہی حسین چیزوں سے تمہیں پیار تھا۔ تمہیں رنگوں کی تمیز تھی۔ تمہیں رنگوں سے کھیلنا آتا تھا۔ تم جو لباس پہنتی تھیں نگاہوں میں کھُب کر رہ جاتا تھا یوں معلوم ہوتا کہ تمہارا لباس ہی ماحول کے مطابق نہیں ہے بلکہ ماحول تمہارے لباس کے مطابق دکھائی دینے لگتا۔ اور اسی سے رنگ لیتا۔

ایک روز گھٹائیں اُمڈ اُمڈ کر آ رہی تھیں، بادل جھوم رہے تھے، میں نے تمہیں دیکھا تم اُودے لباس میں ملبوس تھیں، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے تم فضا کا ایک حصہ ہو۔ میں نے ایک اُداس شام کو تمہیں دیکھا، جھکڑ چل رہے تھے، سوکھے ہوئے پتے اڑ رہے تھے۔ آسمان پر غبار چھایا ہوا تھا۔ تم نے خزاں کے خشک پتوں کے رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ پھر ایک اندھیری رات کو میں نے تمہیں دیکھا، آسمان پر چاند نہیں تھا تارے بھی مدھم سے تھے، تم نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا، اور کائنات کا سارا نور تمہارے چہرے سے جھلک رہا تھا۔ —— ایک دفعہ چاروں طرف بہار آئی ہوئی تھی۔ نئی نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں، خشک پہاڑوں پر سبزہ اُگ رہا تھا، دریچوں پر عشق پیچاں کی بیلیں بل کھاتی ہوئی چڑھ رہی تھیں، تم مجھے ملنے آئیں، جدھر نظر جاتی تھی سبز ہی سبز رنگ دکھائی دے رہے تھے، تم سبز لباس میں ملبوس تھیں۔ —— پھر ایک رات پارٹی میں آتش بازی تھی۔ رنگ برنگے قمقموں کی قطاریں تھیں۔ جلتی ہوئی روشنیاں تھیں۔ تمہارے لباس میں اس رات کتنے رنگ تھے، تم دہکتا ہوا تڑپتا ہوا شعلہ معلوم ہو رہی تھیں، تمہارے کھونٹے دو انگارے دکھائی دے رہے تھے، تمہارا ہار چنگاریوں سے پرویا ہوا نظر آ رہا تھا۔

www.taemeernews.com

اور پھر وہ خوشبو کا جھونکا جو تمہارے ساتھ آیا کرتا تھا۔ وہ خوشبو بھی وقت اور موقعے کے مطابق ہوتی۔ پارٹیوں اور تقریبوں میں کبھی تم نے وہ خوشبو نہیں لگائی، بس ایسی مدھم سی خوشبو جو ہوتی بھی اور نہیں بھی ہوتی۔ صبح کو تم ایسی ہلکی ہلکی خوشبو لگاتیں جیسے غنچے چٹک رہے ہوں، پھول جاگ رہے ہوں، شبنم کے قطرے سورج کی پہلی کرن سے جھلمل جھلمل کر رہے ہوں۔ دوپہر کو نہایت شوخ خوشبو ہوتی جس میں تیز کرنوں کی تمازت، جاگی ہوئی کائنات کا ہنگامہ، چنچل پن، چھیڑ، قہقہے، اور شوخیاں ہوتیں۔ شام کو ایسی خوشبو آتی جیسے تھکے ہوئے پھولوں سے آ رہی ہو۔ ایسے پھولوں سے جو سورج کو دیکھ دیکھ کر تھک گئے ہوں، جو تتلیوں کے بوسوں سے تھک گئے ہوں، جو ہوا کے جھونکوں سے جھوم جھوم کر تھک گئے ہوں۔ رات کو تم ملتیں تو ایسی نشہ آور اور مخمور کن خوشبو اپنے ساتھ لاتیں کہ آنکھیں نیند کے خمار سے بوجھل ہو جاتیں، چاندنی مدھم پڑ جاتی، ہوا کے جھونکے تھک جاتے، فضا میں ہلکے ہلکے نغمے سما جاتے، پُر سحر اور رنگین خواب مچلنے لگتے۔

ہم دونوں کے درمیان اجنبیت جوں کی توں تھی۔ وہ کھنچاؤ بدستور تھا۔ تم مجھ سے اتنی ہی دور تھیں جتنی ملاقاتوں سے پہلے تھیں۔ پھر وہ شام آئی۔ کلب میں رقص تھا۔ جہاں سب نے بھڑکیلے اور رنگین لباس پہن رکھے تھے وہاں تمہارا ملبوس ملگجے رنگ کا تھا۔ اس رات چودھویں کا چاند طلوع ہو رہا تھا۔ شائد تم نے چاندنی رات کا لباس پہنا تھا۔ تمہارے آویزے سفید تھے، تمہاری چوڑیاں سفید تھیں، تمہارے گلے میں سفید ہار تھا۔ اس لباس نے تمہیں اس قدر نمایاں کر دیا کہ سب کن انکھیوں سے تمہیں بار بار دیکھ رہے تھے۔ ہم دونوں ایک گوشے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میرا دل کسی آنے والے حادثے کے خیال سے بری طرح دھڑک رہا تھا۔ میں طلوع ماہتاب کا ذکر کر رہا تھا۔ کلب کے چاروں طرف ایک بہت بڑا باغ تھا۔ اس باغ میں حوض کے کنارے ایک لمبا سا درخت تھا۔ جس میں نہ پتے تھے نہ پھول، بس پتلی پتلی سوکھی ہوئی ٹہنیاں تھیں۔ چودھویں کا چاند ہمیشہ اس درخت کے عقب سے طلوع ہوا آتا۔ باہر نکلتے ہی ٹہنیوں میں الجھ کر رہ جاتا۔ درخت کی چوٹی تک پہنچنے اور آسمان میں تیرنے کے لئے اسے کافی دیر لگتی۔ حوض میں چاند اور درخت دونوں کا عکس پڑتا۔ — میں تمہیں یہ نظارہ دکھانا چاہتا تھا۔ جب موسیقی شروع ہوئی اور لوگ رقص کرنے لگے تو میں نے چلنے کو کہا اور تم مان گئیں۔ ہم باہر نکل آئے، جب روشن سڑکوں کو چھوڑ کر تاریک گوشوں میں داخل ہونے لگے۔ تو تم ٹھٹھک گئیں، تم چلتے چلتے رک گئیں۔ تم نے کچھ دیر سوچا بھی۔ میں نے اصرار کیا اور تم

www.taemeernews.com

میرے بازو کا سہارا لیکر گھاس اور پودوں کے تختوں پر میرے ساتھ چلنے لگیں۔ چاند ابھی تک نہیں نکلا تھا۔ اونچے اونچے درخت بالکل خاموش کھڑے تھے، ٹمٹماتے ہوئے تاروں کی مدھم سی روشنی ہو رہی تھی۔ ایک نہایت تاریک گنج آیا اور نہ جانے کیونکر تم میرے بازوؤں میں آ گئیں، تمہارے لب میرے لبوں سے آملے، تم میرے سینے سے لگی ہوئی تھیں اور میں سرگوشیوں میں نہ جانے کیا کچھ کہہ رہا تھا۔ شاید میں نے بہت سی فالتو باتیں بھی کہہ دیں، ایسی باتیں جن کے متعلق میں نے پہلے کبھی نہ سوچا تھا، جو میں ویسے کبھی نہ کہتا۔ جن کی اہمیت کا مجھے اندازہ نہ تھا۔ چاند طلوع ہوا اور کرنوں سے تمہارا چہرہ جگمگا اٹھا۔ تمہارا ملگجا لباس اور چاندنی گھل مل کر رہ گئے، یوں معلوم ہو رہا تھا، جیسے تم چاند کی پہلی کرن کے ساتھ زمین پر اتری ہو۔ کلب سے موسیقی کی دھیمی دھیمی آواز آ رہی تھی، بڑی پیاری دھن بج رہی تھی۔ جب تم میرے بازوؤں میں سمٹی ہوئی مجھے دیکھ رہی تھیں تو مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ تم ہی ہو۔ تم جو کہ اتنی مغرور، شوخ اور خود سر تھیں، جس کے قرب کے لئے وہاں سب ترستے تھے۔ جو چند لمحے پیشتر مجھ سے اتنی دور تھیں۔ جتنے آسمان کے تارے۔ اور تم خود وہاں آئی تھیں۔ تمہیں دنیا کی کوئی طاقت وہاں آنے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی۔ تم خود آنا چاہتی تھیں۔ وہ شام زندگی کی رنگین ترین شاموں میں سے تھی۔ لیکن بعد میں میں نے محسوس کیا کہ وہ شام بہت جلد آ گئی۔ میں نے بہت جلد وہ سب کچھ تم سے کہہ ڈالا۔ مجھے ابھی کچھ دیر انتظار کرنا چاہیئے تھا۔ کاش کہ میں نے اتنی جلدی نہ کی ہوتی۔ جب تم میرے ساتھ چلتے چلتے اس تاریک گوشے میں ٹھٹھک کر رہ گئی تھیں۔ کاش کہ تم واپس لوٹ آتیں۔ کاش کہ میں نے اتنی جلدی وہ سب کچھ نہ کہا ہوتا

اس کے بعد تم میری دنیا پر چھا گئیں، میرے دل و دماغ میں بس گئیں۔ تمہیں پھول پسند تھے اور مجھے پھولوں کا خبط ہو گیا۔ ہر روز طرح طرح کے پھول چن کر تمہارے لئے لاتا۔ جب آس پاس کے پھول باسی ہو گئے تو میں کار لے کر نکل جاتا اور دور دور سے پھول لاتا۔ ویرانوں کے اداس پھول، ندیوں کے کناروں کے جھومتے ہوئے پھول، پہاڑیوں میں اگے ہوئے اکے دکے پھول۔ ننھے ننھے خودرو پھول۔ اونچے اونچے پودوں میں شرارتاً چھپے ہوئے پھول۔ کئی کئی سو میل تک جتنے باغ تھے میں نے اجاڑ دیئے۔ تمہیں پھولوں کی زبان آتی تھی۔ ایک دفعہ تم مجھ سے خفا تھیں تم نے مجھے زرد پھول بھیجے جن سے نفرت عیاں تھی۔ میں کچھ روز تمہارے ہاں نہیں گیا تم نے مجھے نرگس کے پھول بھیجے اور مجھے یقین ہو گیا۔ کہ تم میرا انتظار کر رہی ہو۔ ایک روز تم نے مجھے کلب میں لڑکیوں کے

www.taemeernews.com

جھرمٹ میں دیکھا جن سے میں ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا ' تم نے مجھے ایک گلدستہ بھیجا جس کے وسط میں ایک شوخ پھول تھا اور چاروں طرف کلیاں تھیں ' تم مجھے ہرجائی کہنا چاہتی تھیں ۔ جب میں نے ایک روز چھیڑ کے طور پر ایک ایسا گلدستہ بھیجا ۔ جس میں ایک کلی شوخ پھولوں سے گھری ہوئی تھی تو تم نے مجھے سفید غنچے بھیجے ' ان سفید غنچوں میں سادگی تھی ۔ معصومیت اور عفت تھی ۔ ایک مرتبہ میں تم سے روٹھ گیا ۔ تمہارا پیغام آیا ۔ اس کے ساتھ سُرخ پھول آئے ' ان پھولوں کے پیغام کو بھی میں سمجھ گیا ۔ جس میں محبت کی حدت تھی ۔

مجھے چند مہینوں کے لئے باہر جانا پڑا ۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ خط لکھو گی ۔ لیکن تمہارا خط نہ آیا ' جب میں واپس لوٹا تو مجھے تم میں کچھ تبدیلی سی محسوس ہوئی ۔ شاید یہ واہمہ تھا لیکن تمہارے رویے میں کچھ روکھا پن سا تھا ' کچھ بے توجہی سی تھی ۔ ایک شام کو ہم اُسی کنج میں ملے ۔ میں نے تم سے خط نہ لکھنے کی شکایت کی ۔ تم بولیں ۔ لکھنے کو جی تو چاہتا تھا بس یہی سوچتی رہی کہ القاب کیا لکھوں ۔ لیکن میری اس سے تسلی نہ ہوئی ۔ شاید یہ تھا ردِ عمل پھر تم نے کلب میں آنا کم کر دیا ۔ تم وہاں جانے سے گریز کرنے لگیں ۔ جہاں میرے آسکنے کا امکان ہوتا ۔ لیکن ساتھ ساتھ چھیڑ بھی جاری تھی ۔ ایک صبح میں لاری لے کر باہر جا رہا تھا ' رات بھر بارش ہوتی رہی تھی اور پہاڑی سڑکیں پہلے سے خراب تھیں ۔ تمہارا ملازم آیا ۔ تمہارا پیغام لے کر کہ سنبھل سنبھل کر آہستہ آہستہ جانا ۔ اس خیال نے مجھے دن بھر مگن رکھا کہ تم میرے متعلق سوچتی رہی ہو ۔ ایک روز مجھے معلوم ہوا کہ میرے تبادلے کے احکامات آئے تھے اور تم نے اپنے ابا سے کہہ کر منسوخ کرا دیئے ۔ میں نے تم سے پوچھا ۔۔۔ کیوں ؟ تم بولیں ۔ بس یونہی ۔

پھر ایک روز تمہارے ہاں ایک لڑکا آگیا ۔ مجھے اس سے ملایا گیا ۔ وہ تمہارا منگیتر تھا ۔ ایک سال پہلے تم نے خود اسے چُنا تھا ۔ وہ نحیف سا ایک مخلص اور حساس لڑکا معلوم ہوتا تھا ۔ تم نے اس کی دی ہوئی انگوٹھی پہن رکھی تھی ' میں تم دونوں کو اکٹھے دیکھا کرتا ۔ مجھ سے تمہاری بے رُخی بڑھتی گئی ۔ تمہارے ہاں میرا آنا جانا کم ہو گیا ۔ تم نے بھی مجھے بلانا چھوڑ دیا ۔ ایک سہ پہر کو تم مجھے تنہا مل گئیں ۔ تم بیحد مسرور تھیں ۔ تمہارے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی ۔ اور آنکھوں میں شوخیاں ۔ میرا خیال تھا کہ تم میرے نہ آنے کی وجہ پوچھو گی ۔ شاید تمہیں کچھ افسوس ہوگا ۔ شاید تم شکایت کرو گی ۔ لیکن تم نے اس کا ذکر تک نہیں کیا ۔ میں نے تمہیں شام کو باغ میں تنہا بلایا ۔ تم ٹال گئیں ۔ میں نے تمہاری بے رُخی کا شکوہ کیا تو تم نے بڑی سرد مہری سے کہا کہ تمہاری طبیعت ہی کچھ ایسی ہے ۔ تم نے کلب کی لڑکیوں کے

www.taemeernews.com

نام لے کے مجھے چھیڑنا شروع کر دیا۔ میں تم سے کسی اور قسم کی گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ لیکن تم دانستہ طور پر ایسی باتیں کر رہی تھیں۔ تم ہنستی رہیں، قہقہے لگاتی رہیں۔ اس کے بعد میں تمہارے ہاں مدتوں نہیں گیا۔ میں سنا کرتا کہ آج تم اپنے منگیتر کے ساتھ کلب میں آئی تھیں، آج تم پارٹی میں مدعو تھیں، آج تم پک نک پر آئی ہوئی تھیں۔ آج تم اتنی خوش تھیں۔ یہ سن سن کر میں کتنا اداس ہو جایا کرتا۔ میں نہ کہیں باہر جاتا، نہ کسی سے ملتا۔ ایک ایک دن گزارنا مشکل ہو گیا۔ پھر ایک روز میں نے سنا کہ تمہارے ابا کا دورہ تبادلہ ہو گیا ہے، چند دنوں تک وہ چلے جائیں گے۔ اسی سلسلے میں کلب میں ڈنر ہوا۔ میں ڈنر پر نہ جانا چاہتا تھا۔ وہ شام میں کہیں باہر گذارنا چاہتا تھا۔ لیکن اتفاقاً راستے میں تمہارے ابا مل گئے اور مجھے ان کے ساتھ جانا پڑا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ آج کلب میں لڑکیوں کے ساتھ خوب ہنسوں گا، چہلیں کروں گا۔ انہیں چھیڑوں گا۔ ان کے ساتھ رقص کروں گا۔ تمہاری طرف دیکھوں گا بھی نہیں۔ ان میں سے چند ایک مجھے پسند بھی کرتی تھیں، اتفاق سے اس رات چاند کی چودھویں تھی اور میں آسانی سے کسی لڑکی کو طلوع ماہتاب کے بہانے باغ میں لے جا سکتا تھا۔ لیکن تمہیں دیکھ کر نہ جانے مجھے کیا ہو گیا۔ میں ایک طرف تنہا جا بیٹھا۔ بس بار بار یہی خیال آ رہا تھا کہ تم جا رہی ہو۔ شاید میں تمہیں اب کبھی نہیں دیکھ سکوں گا۔ تم کئی دفعہ میرے قریب سے گذریں۔ ایک مرتبہ تم اپنے منگیتر کے ساتھ تھیں، ڈنر میں تم میرے برابر بیٹھی تھیں۔ میں بالکل خاموش تھا، تم نے مجھے بتایا کہ تم جا رہی ہو، تم نے یہ بھی کہا کہ کل شام کو میں تمہیں کلب میں ملوں۔ میں خاموش رہا۔ اس رات میں نے نہ لڑکیوں سے بات کی، نہ رقص میں شامل ہوا۔ بلکہ بہت جلد لوٹ آیا۔

دوسرے روز میں کلب میں نہیں گیا۔ مجھے کسی نے بتایا کہ تم وہاں آئی تھیں، تمہیں کسی کا انتظار تھا۔ تم بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اگلے روز تمہارا ملازم پیغام لایا کہ تم رات کو چلی جاؤ گی۔ تم نے شام کو مجھے بلایا تھا۔ اپنی کوٹھی کے عقب میں درختوں کے جھنڈ میں۔ لیکن میں نہیں گیا۔ میں رات کو تمہارے ابا سے ملنے بھی نہیں گیا۔ اور تم چلی گئیں۔ میں ایک اونچے ٹیلے سے اس سڑک کو دیکھ رہا تھا۔ جو سیدھی ان پہاڑوں کی طرف جاتی تھی جن میں سے چاند طلوع ہو رہا تھا۔ سڑک یوں چمک رہی تھی جیسے چاندی کا تار۔ پھر تمہاری کوٹھی سے نکلتی ہوئی تمہاری کار نظر آئی۔ جو آہستہ آہستہ سڑک پر جا رہی تھی۔ کچھ دیر میں پہاڑوں میں گم ہو گئی۔ جب کبھی پہاڑوں سے چاند طلوع ہوتا اور سڑک چمک اٹھتی۔ مجھے وہ رات یاد آ جاتی جب تم نے مجھے بلایا تھا۔ اور میں نہیں گیا تھا، جب تم میرا انتظار

www.taemeernews.com

کرتے کرتے چلی گئی تھیں۔

چند ماہ کے بعد میں نے سنا کہ تمہارے منگیتر نے کسی اور لڑکی سے شادی کر لی۔ مجھے بہت دنوں تک یہی افسوس رہا کہ شاید اس کا ذمہ دار میں ہوں۔ وہ تمہارا منگیتر تھا جسے تم نے خود چنا تھا۔ تمہارا اور اُس کا ایک مقدس رشتہ تھا۔ جو میری وجہ سے ٹوٹ گیا۔ کاش کہ میں اس رات اس قدر اُداس نہ ہوتا۔ اس رات میں لڑکیوں کے ساتھ ہنستا کھیلتا، رقص کرتا۔ اور تم پر ظاہر کر دیتا کہ میں بھنورا ہوں، ہرجائی ہوں، مجھے تمہاری باتوں کی پروا نہیں ہے۔

نہ جانے کیوں مجھے یقین ہو گیا تھا کہ تم مجھے خط لکھو گی۔ ہر روز مجھے تمہارے خط کا انتظار رہنے لگا۔ لیکن خط نہ آیا۔ جب کچھ عرصے کے بعد میں بالکل نا اُمید ہو گیا۔ تو میں نے تمہارے پرانے ملازم کو کسی بہانے تمہارے ہاں بھیجا۔ اس کے ہاتھ کچھ چھوٹے موٹے تحفے بھیجے اور کچھ پیغام۔ اس نے واپس آکر بتایا کہ تم وہاں یہاں کی نسبت کئی گنا خوش ہو، تمہارا کالج کھل چکا ہے، تم مصوری سیکھ رہی ہو، جب تمہیں میرے پیغام ملے تو تم نے ہنس کر موضوع بدل دیا، اس کے بار بار کہنے پر بھی تم نے کوئی جواب نہ دیا۔ تم نے میرے بھیجے ہوئے تحفے واپس لوٹا دیے۔ تم نے صرف اتنا کہا کہ تم خط و کتابت میں سست ہو۔ تم نے پیغام بھجوایا تو یہ بھجوایا کہ میں تمہیں علیحدہ خط ہرگز نہ لکھوں۔ تم بڑی آسانی سے مجھے خط لکھ سکتی تھیں اور کسی اور پتے پر میرے خط تمہیں مل سکتے تھے، لیکن تم چاہتی نہ تھیں۔

آخر وہاں سے میرا تبادلہ ہو گیا۔ سفر کرتے ہوئے میں صحرا میں سے گذر رہا تھا کہ ایک جگہ تمہارے ابا مل گئے، انہوں نے اصرار کیا کہ چند دن انکے ساتھ گذاروں۔ ان کا تبادلہ بھی ابھی اس ریتلے علاقے میں ہوا تھا۔ تمہاری چھٹیاں تھیں اور تم بھی وہاں آئی ہوئی تھیں۔ تم بڑی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ ملیں۔ تم نے مجھے کلب کی چند لڑکیوں کے نام سے چھیڑا۔ تمہاری باتوں میں نشتر تھے۔ دیر تک تم کچوکے لگاتی رہیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے تمہارا دل پتھر کا بنا ہوا ہے۔ رات بھر مجھے نیند نہ آئی۔ میں غصے سے تلملاتا رہا۔ صبح صبح تم مجھے تنہا مل گئیں اور مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے تمہیں سنگدل کہا۔ بے وفا کہا، بے مروت کہا۔ مغرور، خود غرض، اور نہ جانے کیا کیا کہا۔ اور تم چپ چاپ سنتی رہیں، حتیٰ کہ میرے پاس الفاظ نہ رہے، جب میں سب کچھ کہہ چکا تو تم چلی گئیں۔ میں اسی روز جانا چاہتا تھا، تمہارے ابا سے اجازت مانگی۔ وہ نہ مانے، اسی شام کو کسی تقریب

www.taemeernews.com

پر تمہارے ابا اور امی مدعو تھے۔ اُنہوں نے مجھے ساتھ چلنے کو کہا۔ میرا جی نہ چاہا۔ نہ جانے تم نے کیوں دردِ سر کا بہانہ کر دیا ـــــ شام کو میں برآمدے میں بیٹھا تھا، سامنے ریت کے ٹیلوں میں ایک نخلستان تھا جہاں کھجور کے درخت ایک جھیل پر جھکے ہوئے تھے۔ آسمان میں چند دنوں کا نکلا ہوا پتلا سا چاند چمک رہا تھا۔ خوشبو کا ایک جھونکا آیا اور تم آگئیں۔ سولہ سنگار کیے۔ ایسی سج دھج کے ساتھ، کہ تم پر نگاہیں نہ جمتی تھیں۔ تمہارے چہرے پر نرالا روپ تھا۔ تمہارے رخساروں پر صبح صادق کی جلا تھی، اور آنکھوں میں پشیمانی۔ تم مجھ سے کچھ مانگنے آئی تھیں۔ تم اتنی پیاری معلوم ہو رہی تھیں کہ اس وقت تم اگر جان مانگتیں تو میں وہ بھی قربان کر دیتا۔ تم نے مجھ سے مانگا بھی تو کیا ـــ معافی۔

جب میں تمہاری نئی تصویر کی تلاش میں تمہارے کمرے میں گیا تو ایک چھوٹے سے چمڑے کے بٹوے میں میری کچھ چیزیں ملیں، میری تصویریں، میرے رومال، اور ایک سگرٹ کا جلا ہوا ٹکڑا۔ پوچھنے پر تم نے بتایا کہ ایک شام کو حوض کے کنارے اُسی کنج میں میں نے سگرٹ کا ٹکڑا پھینک کر پاؤں سے کچل دیا تھا، تم نے اُسے اُٹھا کر رکھ لیا۔ تمہاری یہ ادا مجھے بہت بھائی۔

پھر ہم ریت پر چلے گئے، نخلستان آیا، وہاں کائنات خوابیدہ تھی۔ دُور دُور تک ریت کے روپہلی ٹیلے سوئے ہوئے تھے، جھیل کا پانی بالکل ساکن تھا، نوکدار پتوں میں سے جھانکتے ہوئے چاند کا عکس پانی میں جم کر رہ گیا تھا۔ کھجور کے لمبے لمبے درخت چپ چاپ کھڑے تھے۔ دُور کوئی ساربان بنسری پر ایک نہایت مدہوش کن لے بجا رہا تھا۔ جب تم میرے شانے سے سر لگائے باتیں کر رہی تھیں تو میں سب گلے شکوے بھول چکا تھا۔ مجھے وہ طویل اور تلخ وقفہ بھی بھول گیا تھا۔ جو ہماری دونوں ملاقاتوں کے درمیان آگیا تھا ـــ میں وہی باتیں دہرا رہا تھا جو پہلے کی تھیں۔

تب مجھے محسوس ہوا کہ وہ الفاظ نہایت سخت تھے جو میں نے تمہیں کہے تھے، وہ انداز نہایت تلخ تھا۔ اور پھر مجھے حق کیا تھا۔ میں نے یونہی وہ سب کچھ کہا۔ اور تم چپ چاپ سنتی رہیں۔ تم نے آگے سے ایک لفظ بھی تو نہیں کہا ـــــ کاش میں نے ذرا ضبط سے کام لیا ہوتا۔ کاش میں نے وہ الفاظ نہ کہے ہوتے۔ مدتوں اس خیال نے مجھے پشیمان رکھا۔

تم نے خط لکھنے کے وعدے کیے تھے، یہ بھی کہا تھا کہ تم اپنی کسی سہیلی کی معرفت میرے خط منگوایا کرو گی، اور میں تمہیں تمہارے کالج میں ملنے آؤں، تم میرا انتظار کیا کرو گی۔

ہفتے گزرے، مہینے گزرے، لیکن تمہارا خط نہ آیا۔ ایک مرتبہ تم اس سٹیشن سے گذریں جہاں میں تھا، تمہیں یہ بھی پتہ تھا کہ میں وہاں ہوں، پھر بھی تم نہیں ملیں نہ تم نے اطلاع دی۔ اسی سٹیشن پر تمہارے ابا سے ملاقات ہوگئی۔ وہ چھٹی سے واپس آ رہے تھے، انہوں نے بتایا کہ آج کل تم رقص سیکھ رہی ہو، تم نے کئی نئے ساز سیکھے ہیں۔ تمہاری بنائی ہوئی چند تصویریں کسی نمائش میں رکھی گئی تھیں اور بیحد مقبول ہوئیں۔ تم نہایت مسرور رہتی ہو۔ میں افسردہ ہو گیا۔ شاید میں تمہیں مسرور نہ دیکھنا چاہتا تھا۔ شاید تمہاری خوشیوں سے مجھے رنج پہنچا تھا۔ میں تمہارے کالج میں تم سے ملنے گیا۔ میں نے اطلاع بھجوائی، تم کلاس کے بعد بھی نہ آئیں۔ میں نے پھر کہلایا، دیر تک انتظار کرتا رہا۔ تم ذرا سی دیر کے لئے آئیں، تم نے یوں ظاہر کیا جیسے تمہیں میرے آنے پر ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی، میں نے شکایتیں کیں تو تم نے فوراً موضوع بدل دیا۔ میں نے پکچر کے لئے کہا۔ تم نے انکار کر دیا۔ میں نے کہا کہ سہ پہر کو ہم کہیں اکٹھے چائے پئیں گے تم نے انکار کر دیا۔ میں نے دوبارہ ملنے کے لئے پوچھا تم نے نفی میں جواب دیا۔ تم نے مجھے مزید انتظار کرایا۔ تمہارے کالج کے ختم ہونے تک میں تمہاری راہ تکتا رہا جب تم واپس برآمدے میں آئیں تو تمہاری یہ کوشش تھی کہ کہیں تمہاری سہیلیاں مجھے تمہارے ساتھ نہ دیکھ لیں۔ تم نے جلدی سے اپنی سائیکل لی، بڑی تیزی سے ہم نے میدان عبور کیا اور جب ہم سائیکلوں پر جا رہے تھے تو میں تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ تم ہر چوک پر چاہتی تھیں کہ میں کہیں چلا جاؤں۔ ایک دو دفعہ تم نے کہا بھی۔ ایک موڑ پر تم بغیر کچھ کہے ایک طرف مڑ گئیں، میں دیر تک وہیں کھڑا رہا۔ تم نے ایک مرتبہ بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ میں ششدر رہ گیا۔ تمہارا رویہ ایسا تھا جیسے تم مجھے بالکل نہیں پہچانتیں۔ تم نے مجھے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ تم مجھ سے آئندہ کبھی ملنا نہیں چاہتیں۔ میں واپس چلا آیا، میں نے فیصلہ کر لیا کہ پھر کبھی تم سے نہیں ملوں گا۔ تمہارا خیال چھوڑ دوں گا۔ تمہیں بالکل بھلا دوں گا۔ میں نے تمہارے ابا سے خط و کتابت بند کر دی۔

میں ان دنوں ایسے جنگلوں میں تھا جہاں ہر وقت بارش ہوتی رہتی تھی، جہاں اس قدر تنہائی تھی کہ نہ زندہ رہنے کی خوشی تھی نہ افسوس۔ چاروں طرف وحشت ہی وحشت تھی۔ بہت صبحیں ایک سی تھیں، سب شامیں ایک سی تھیں۔ دن گذرتے جا رہے تھے۔ اور پتہ تک نہ چلتا تھا—— ایک روز تمہارا خط ملا۔ یہ تمہارا پہلا خط تھا۔ تم نے میرا پتہ بالکل صحیح لکھا تھا۔ تم جانتی تھیں کہ میں کہاں ہوں۔ خط میں القاب نہیں تھے۔ تم

www.taemeernews.com

نے اپنا پروگرام لکھا تھا کہ تم اگلے ہفتے اپنی کسی پروفیسر اور چند سہیلیوں سے ملنے چند دنوں کے لئے دارجیلنگ جا رہی ہو۔ تم نے مجھے بلایا تو نہیں تھا لیکن اپنے جانے کی تاریخ اور ٹرین کا وقت لکھا تھا، اس جنکشن کا خاص طور پر ذکر تھا۔ جہاں ٹرین دیر تک ٹھہرتی تھی، اپنا دارجیلنگ کا پتہ بھی لکھا تھا۔

میں ہرگز نہ آتا اگر اس قدر اُداس اور تنہا نہ ہوتا۔ شاید یہ تنہائی تھی جس نے مجھے مجبور کر دیا میں نے چھٹی لی، وقت تھوڑا رہ گیا تھا اور ریل کے لئے بہت چکر کاٹنا پڑتا تھا۔ میں نے کچھ راستہ موٹر سے طے کیا، کچھ ٹیمر سے، اور کچھ پیدل۔ وہ جنکشن نزدیک ہی تھا کہ موٹر خراب ہو گئی۔ ہم گھنے جنگل میں تھے، اندھیری رات تھی، موسلا دھار بارش ہو رہی تھی، میرے ساتھ چند لڑکے دارجیلنگ جا رہے تھے، انہوں نے فیصلہ کیا کہ صبح والی گاڑی سے چلیں گے۔ لیکن مجھے یہ خیال تھا کہ تم منتظر ہو گی، اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر ان مصیبتوں سے میں نے وہ دشوار راستہ پیدل طے کیا۔ تم مجھے منتظر ملیں۔ تم سٹیشن پر مجھے ڈھونڈ رہی تھیں۔ اس ڈبے میں چند اور مسافر بھی تھے جو سو رہے تھے۔ نہ ہم نے آپس میں باتیں کیں نہ ایک دوسرے کو دیکھا، بس نیچی نظریں کئے بیٹھے رہے۔ ہم دارجیلنگ پہنچے تو تمہاری سہیلیاں منتظر ملیں، یہ وہی لڑکیاں تھیں جن کو میں نے تمہارے کالج میں دیکھا تھا، جن کے سامنے تمہیں میرے ہمراہ چلنے میں احتراز تھا۔ ان سے تم نے میرا تعارف کرایا اور میرا نام نہ لیا۔ تم نے مجھے شام کو ملنے کو کہا۔ اور ان کے ساتھ چلی گئیں۔

شام کو میں تمہیں لینے گیا۔ بادل نیچے اتر آئے تھے اور ہلکی ہلکی دھند پھیلتی جا رہی تھی۔ بوندیں پڑنی شروع ہو گئیں اور ہم زیادہ دور نہ جا سکے۔ ایک کیفے میں ہم موسیقی سنتے رہے، پکچر دیکھی، جب رات گئے ہم واپس آ رہے تھے تو بالکل خاموش تھے۔ وہ جگہ آئی جہاں سے تمہاری پروفیسر کے مکان کو راستہ جاتا تھا، میں منتظر تھا کہ تم اس طرف کا رُخ کرو گی اور میں تمہیں چھوڑ آؤں گا، لیکن تم اس راستے کی طرف نہیں گئیں۔ تم میرے ساتھ چلتی رہیں حتیٰ کہ میرا ہوٹل آ گیا۔ میرا کمرہ اوپر تھا۔ سامنے چھوٹی سی بالکنی تھی۔ ہم دونوں بالکنی میں کھڑے تھے، دھند بڑھتی جا رہی تھی، بوندیں تیز ہو گئی تھیں۔ ہم دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ یکایک تمہاری آنکھیں دھندلی ہو گئیں۔ تم نے سر جھکا لیا اور آنسو پونچھنے لگیں۔ میں تمہارے قریب ہو گیا۔ اور تم خود میری آغوش میں آ گئیں۔

ٹین کی چھت پر ٹپ ٹپ بوندیں گر رہی تھیں۔ بادل اندر آ گئے تھے، بڑھتی ہوئی

www.taemeernews.com

دھند نے ہمیں یوں گھیر لیا تھا کہ فضا میں ہم دونوں تنہا رہ گئے — تم اور میں۔

نہ ہم نے گذری ہوئی باتوں کا ذکر کیا، نہ مستقبل کے عہد و پیمان ہوئے، بس ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ بارش تیز ہوتی گئی۔ بادل گرجتے رہے، بجلیاں چمکتی رہیں، ٹین کی چھت پر بوندیں شور مچاتی رہیں، دھند نے ہمیں گھیرے رکھا۔

جب بارش تھمی تو میں تمہیں چھوڑنے گیا، سڑکیں سنسان پڑی تھیں، آسمان پر تارے چمک رہے تھے، مشرق میں ہلکی ہلکی روشنی آمدِ صبح کا پتہ دے رہی تھی۔ رخصت ہوتے وقت تم نے بڑے انداز سے اپنی ہتھیلیاں ملا کر سر کی ہلکی سی جنبش سے مجھے سلام کیا، اتنے پیار سے تم نے پہلی مرتبہ مجھے سلام کیا تھا۔

پھر نہایت چمکیلا اور روشن دن طلوع ہوا، تم مجھے لینے آئیں۔ تم نے قوسِ قزح کے رنگوں کی ساڑی پہن رکھی تھی، تمہارے گلے میں ایک شوخ رومال تھا، کانوں میں رنگین آویزے تھے، تمہارے چہرے پر بلا کی چمک دمک تھی۔ تم نے اصرار کیا کہ میں بھی شوخ لباس پہنوں آسمان بالکل صاف تھا، فضا نکھری ہوئی تھی، نہایت چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی، دور دور کے پہاڑ اور وادیاں نظر آ رہی تھیں۔ ہم دونوں بچوں کی طرح ہاتھ ڈالے اس مسحور خطے میں پھر رہے تھے جہاں کا گوشہ گوشہ طلسم زدہ معلوم ہو رہا تھا۔ ہم باغ کے اس حصے میں گئے جہاں شیشے کی دیواروں میں شیشے کی چھتوں کے نیچے لاتعداد پھول کھلے ہوئے تھے، قسم قسم کے، رنگ رنگ کے، طرح طرح کے پھول، سادہ رنگین، معطر، پھول مسکرا رہے تھے، پھول شرما رہے تھے، پھول متحیر تھے، پھول کچھ سوچ رہے تھے، پھول قہقہے لگا رہے تھے۔ تم اپنے شوخ لباس میں اس رنگین ماحول میں کچھ اس طرح کھو گئیں کہ چند تتلیاں پھولوں کو چھوڑ کر تمہارے گرد طواف کرنے لگیں۔ بوڑھا مالی تمہیں دیکھتا رہا۔ پھر اس نے چند شوخ رنگ پھول چن کر تمہیں دیئے۔ شاید یہ ایک مصور کی پیش کش تھی، بارگاہِ حسن میں ایک ادنیٰ سا نذرانہ تھا۔ تم نے پھول لے لئے اور مجھے کہا کہ میں انہیں تمہارے بالوں میں لگا دوں۔ جب میں انہیں تمہارے بالوں میں سجا رہا تھا تو نہ جانے کیوں تمہاری پلکیں جھک گئیں، تمہارا چہرا تمتما اٹھا۔ تم نے ساڑی کا پلو سر پر کھینچ لیا۔

ایک کیفے میں تمہاری سہیلیاں نظر آئیں، انہوں نے ہمیں نہیں دیکھا تھا، لیکن تم نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں متوجہ کرایا، تم چاہتی تھیں کہ وہ ہمیں اکٹھے دیکھ لیں۔ ان میں ایک دو اور لڑکیاں بھی تھیں، ان سے تعارف کراتے وقت تم نے پھر میرا

www.taemeernews.com

نام نہیں لیا اور مجھے خود بتانا پڑا۔

اگلی صبح میں تمہیں لینے گیا تو تم اکیلی بیٹھی کچھ لکھ رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر تم نے وہ کاغذ چھپا لیا۔ میں نے دیکھنے کے لئے اصرار کیا، تم نہ مانیں، بڑی مشکلوں سے وہ کاغذ چھینا، اس پر تم نے کئی جگہ ایک نیا نام لکھا تھا، — اپنے اور میرے نام کا پہلا حصہ ملا کر۔

چلتے وقت میں نے تمہیں یاد دلایا تم بندی لگانا بھول گئی تھیں، تم آئینے کے سامنے گئیں۔ پھر تمہیں کچھ خیال آگیا۔ اور تم نے مجھ سے کہا کہ میں لگا دوں۔ جب میں نے تمہاری پیشانی پر سرخ دہکتی ہوئی بندی لگائی تو تمہاری نگاہیں جھک گئیں، چہرہ گلابی ہو گیا۔

ہم چیڑ کے جنگل سے گذر رہے تھے جہاں اونچے اونچے درخت سر ملائے کھڑے تھے، ٹہنیوں اور پتوں سے چھنتی ہوئی کرنیں زمین پہ طرح طرح کے نقوش بنا رہی تھیں۔ روشنی اور سایوں کا یہ امتزاج نہایت دلآویز تھا۔ دیر تک ہم ہاتھ میں ہاتھ ڈالے یوں چلتے رہے جیسے راستہ بھول گئے ہوں۔ جنگل ختم ہوا اور ایک نہایت خوشنما آبشار آئی، پانی بڑی بلندی سے گر رہا تھا۔ دور دور تک پھوار اڑ رہی تھی۔ ہم ایک پتھر پر بیٹھ کر پھوار میں بھیگنے لگے۔ سامنے ایک وسیع وادی تھی جس پر دھند چھائی ہوئی تھی۔ دیکھتے دیکھتے ہوا کے تیز جھونکوں سے دھند پھٹ گئی اور کنچن چنگا نظر آنے لگی۔ وہ نظارہ ایسا تھا کہ ہم مرعوب ہو کر رہ گئے، خاموشی سے برف کی اس جھلمل جھلمل کرتی ہوئی دیوار کو دیکھتے رہے جو آسمان کو چھو رہی تھی۔ پھر دھند آگئی۔ اور چوٹی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

راستے میں میرا ایک امریکن دوست مل گیا جس نے تمہاری طرف اشارہ کر کے کچھ زیر لب پوچھا۔ میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ مسکرا کر بولا۔ اچھا تو پھر تمہاری ہونے والی — اور میں نے جلدی سے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش کرا دیا۔ تمہارا تعارف کرایا۔ ہم تینوں باتیں کرتے رہے۔ ایک جوہری کی دکان پر وہ کچھ خرید رہا تھا۔ تمہاری خالی انگلیاں دیکھ کر میں یونہی انگوٹھیوں کی باتیں کرنے لگا۔ تم نے بتایا کہ تمہیں سادہ انگوٹھی پسند ہے۔ ایسی جس میں نہ نگ ہو، نہ نام لکھا ہو، نہ کسی رنگ کی آمیزش ہو، بس بالکل سادہ سی ہو۔ تم کسی معمولی انگوٹھی کا ذکر ہرگز نہیں کر رہی تھیں، بلکہ ایسی انگوٹھی کا ذکر کر رہی تھیں جو ایک خاص موقعے پر پہنی جاتی ہے۔ پھر میں نے تم سے پوچھا کہ تم میرا نام کیوں نہیں لیتیں۔ تم نے آہستہ سے کہا — ہمارے ہاں نام نہیں لیا کرتے۔

www.taemeernews.com

اس وقت تمہارے چہرے پر مجھے ایک ایسی جھلک نظر آئی جو پہلے کبھی نہ دیکھی تھی، جس میں اعتماد تھا، معصومیت تھی، پیغام تھا۔

جب میرا دوست مجھے پھر ملا تو اس نے تمہاری بڑی تعریفیں کیں، اس نے بتایا کہ حسین ہونے کے علاوہ تم میں ایک بہت نمایاں جاذبیت ہے۔ تمہاری رگ رگ میں زندگی کی تڑپ ہے، تمہاری آنکھوں میں زندگی رقصاں ہے، تم مجسم زندگی ہو۔

صبح کاذب کا وقت تھا جب ہم بلندیوں پر طلوع آفتاب دیکھنے گئے۔ نہایت سرد ہوا چل رہی تھی۔ آسمان پر تارے بڑی تیزی سے چمک رہے تھے۔ کہکشاں اتنی قریب معلوم ہو رہی تھی جیسے ہاتھ بڑھا کر چھوئی جا سکتی ہو۔ جدھر نظر جاتی تھی آسمان سے ملی ہوئی برفانی چوٹیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ اونچے اونچے پہاڑوں کے سلسلوں نے ہمیں گھیر رکھا تھا۔ ہم دونوں بیٹھے مشرق کی ہلکی ہلکی روشنی کو دیکھ رہے تھے، ہوا کے جھونکوں سے تمہارے بال پریشان ہو رہے تھے۔ تمہارے چہرے پر خوشگفتہ پھولوں کی تازگی تھی۔ اس نیم تاریک ماحول میں سب سے روشن شے تمہارا چہرہ تھی، جس پر تاروں سے زیادہ نور تھا۔ برفانی چوٹیوں سے زیادہ جگمگاہٹ تھی۔ صبح کا تارا طلوع ہوا۔ پھر مشرق کا اُجالا بڑھ گیا۔ کنچن جنگا سے روشنی منعکس ہونے لگی۔ دفعتاً تارے دھندلے پڑ گئے اور برف کی اس عظیم دیوار کا رنگ بدل گیا۔ ہلکی ہلکی گلابی جھلک آگئی۔ آس پاس کی تمام پہاڑیوں پر عکس پڑنے لگا۔ رنگ تیز ہو کر یکلخت بدل گیا اور ساری کائنات اُودی ہو گئی۔ اودا رنگ نیلا ہو گیا۔ پھر سبز۔ زرد، نارنجی، سُرخ —— قوس قزح کے سارے رنگ باری باری آئے اور برفانی چوٹیوں پر منعکس ہوتے رہے۔ پھر مشرق سے پگھلا ہُوا سونا بہنے لگا۔ اور چاروں طرف آگ سی لگ گئی۔ سامنے سے ایک بہت بڑی گھومتی ہوئی سُنہری گیند جھانکنے لگی۔ لوگ ایک سمت اشارہ کر رہے تھے، دُور تین چھوٹی چھوٹی سفید چوٹیاں نظر آ رہی تھیں، یہ وہی چوٹیاں تھیں جنہیں "تین بہنیں" کہا جاتا ہے۔ اُن میں سب سے چھوٹی ماؤنٹ ایورسٹ تھی۔ دُنیا کی سب سے اونچی چوٹی جو فاصلے کی وجہ سے اتنی ذرا سی معلوم ہو رہی تھی۔ سورج نکلا اور اس پر ایک سبزی مائل نیلا نیلا عکس جھلملانے لگا، جسے کہتے ہیں کہ بحرالکاہل کا عکس ہے۔ اور پھر سب کچھ اتنی تیزی سے چمکنے لگا کہ آنکھیں چندھیا گئیں۔

طلوع آفتاب کا وہ نظارہ میری زندگی کی حسین ترین یادوں میں سے ہے۔ جب کبھی یاد آتا ہے تم یاد آجاتی ہو۔ جو اس خواب کی دُنیا میں میرے ساتھ تھیں، جہاں رنگوں کے

www.taemeernews.com

طوفان مچل رہے تھے انور کے اس بیکراں سمندر میں قدرت نے اپنے رنگ ختم کر دیئے تھے۔

وہ چند دن کیسے خوشیوں میں گذرے۔ ہم نے کیسی کیسی حسین چیزیں دیکھیں۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ تم سے بہت سی شکائتیں کروں گا، تم سے خوب خفا ہوں گا۔ لیکن نہ جانے کیوں میں نے وہ ذکر بالکل نہیں چھیڑا۔ تمہارے چہرے پر اس قدر پیار تھا کہ میں نے سب کچھ بھلا دیا۔ جب ہم واپس آرہے تھے تو تم کہہ رہی تھیں کہ مجھے ہر تیسرے روز خط لکھا کروگی، تمہیں لمحہ لمحہ میرا انتظار رہے گا۔ اگر میں نے آنے میں دیر کر دی تو تم خود مجھے لینے آجاؤ گی۔

جب اس جنکشن پر ہم جدا ہوئے تو تمہاری آنکھیں نمناک تھیں۔ تمہاری ٹرین چل دی، میں دروازے میں کھڑا تم سے باتیں کر رہا تھا، جب اترنے لگا تو تم بولیں ——
ذرا سنبھل کر اتریئے۔ تمہارے یہ الفاظ مجھے بہت پیارے لگے۔ یہ فقرہ میرے حافظے میں جم کر رہ گیا۔ جب میں واپس چلا گیا تو مجھے ایک خیال نے کتنا ستایا۔ کتنا بے چین کیا۔ اس مرتبہ تم کس قدر مختلف تھیں۔ تمہارا رویہ، تمہاری باتیں، میرا نام لینے سے گریز، انگوٹھی کا ذکر، بات بات پر شرمانا۔ اور وہ جھلک جو میں نے پہلی مرتبہ دیکھی تھی۔ تم چاہتی تھیں کہ ہم مستقبل کی باتیں کریں، میں تمہیں شادی کے لئے کہہ دوں۔ سچ مچ تمہارا بہت ہی چاہ رہا تھا کہ میں تمہیں شادی کے لئے کہہ دوں۔ ایک دو مرتبہ مجھے یونہی خیال بھی ہوا۔ اگرچہ ایسا کرنا ایک حد تک خود فریبی ہوتی، ایک جھوٹ ہوتا۔ تم بھی سمجھ جاتیں کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ اور اگر تم ہاں کہہ دیتیں تو شائد تمہیں بعد میں احساس ہوتا کہ تم نے جھوٹ بولا تھا۔ لیکن ان دنوں تم میرے منہ سے وہ الفاظ سننے کے لئے بے قرار تھیں۔ کاش کہ میں نے یونہی کہہ دیا ہوتا۔ ہم کچھ دیر اکٹھے بیٹھ کر آئندہ زندگی کے منصوبے باندھتے، تم شرما شرما جاتیں، بڑی پیاری پیاری باتیں ہوتیں۔
کاش کہ میں نے کہہ دیا ہوتا۔

ایک طویل وقفہ گذر گیا اور تم نے مجھے یاد نہیں کیا۔ بڑے انتظار کے بعد تمہاری ایک سہیلی کا خط ملا، یہ وہی لڑکی تھی جس سے تم نے دارجیلنگ میں ملایا تھا۔ یہ خط اس نے تمہارے ایما پر لکھا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ تم مجھے خط نہیں لکھوگی۔ میں انتظار کرنا چھوڑ دوں۔ اور تمہیں ملنے بھی نہ آؤں۔ مجھے یقین نہیں آیا۔ میں نے لکھ کر اس سے وجہ دریافت کی۔ جواب آیا۔ لیکن اس میں صرف اتنا لکھا تھا کہ بس تم نہیں چاہتیں۔ اگر میں ملنے

www.taemeernews.com

گیا بھی تو تم نہ مل سکو گی۔

میں موقعہ پاکر چند دنوں کے لئے تمہاری سہیلی سے ملنے گیا۔ وہ تمہارے کالج کے نزدیک ہی اور لڑکیوں کے ساتھ علیحدہ رہتی تھی۔ وہ مجھے بہت اچھی طرح ملی۔ پہلے تو وہ اس موضوع پر گفتگو کرنے سے جھجکتی رہی۔ پھر میرے اصرار پر اس نے بتایا کہ تم مجھے پسند نہیں کرتیں۔ تم اکثر میرا مذاق اڑایا کرتی ہو۔ تم نہیں چاہتیں کہ مجھ سے کسی قسم کی خط وکتابت ہو۔ مجھے تب بھی یقین نہ آیا۔ جب میں نے بہت زور دیا تو اس نے پروگرام بنایا کہ وہ اگلے روز تمہیں اور کئی اور لڑکیوں کو چائے پر بلائے گی، دانستہ طور پر میرا ذکر چھیڑا جائے گا، اور میں سب کچھ اپنے کانوں سن لوں گا۔

اگلے روز میں نے سب کچھ اپنے کانوں سنا۔ تمہاری سہیلی کے پاس میری ایک تصویر تھی جو اس نے تم سے لی تھی، اس تصویر پر تبصرے ہونے لگے۔ تم نے میرے متعلق سب سے سخت الفاظ کہے۔ کہ میں اجتماع ضدین ہوں، مجھے کوئی نہیں سمجھ سکتا، میں ہرجائی ہوں، میں آوارہ گرد ہوں۔ جہاں میں اسقدر اکھڑ ہوں وہاں میں کبھی کبھی اسقدر جذباتی بن جاتا ہوں کہ دوسروں کی پریشان کر دیتا ہوں۔ میں بالکل معمولی سا لڑکا ہوں، بالکل فضول اور نکما۔ اسی قسم کی بہت سی باتیں کیں۔ میں نے شیشوں کی اوٹ سے دیکھا، تمہارے ہاتھ میں میری تصویر تھی، لبوں پر وہی زہر بھری مسکراہٹ اور آنکھوں میں نفرت تھی۔ تم اس وقت ایسے اجنبی کا ذکر کر رہی تھیں جس سے تمہیں شدید نفرت تھی، جسے تم دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی تھیں۔

کسی اور کے لبوں سے یہ سن کر مجھے ہرگز افسوس نہ ہوتا کیونکہ میں اپنے آپ کو ایسا ہی سمجھتا تھا۔ لیکن تمہارے لبوں سے یہ الفاظ سن کر مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی۔ تم سے نفرت ہو گئی۔ میں نے اس وقت کو کوسا جب میں نے تمہیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ تمہارے ہرجائی کہنے پر مجھے ہرجائی بننے کا خیال ہو گیا۔ میں نے تمہاری سہیلی کی بڑی تعریفیں کیں۔ اس کی آنکھوں کی تعریفیں کیں، ہونٹوں کی، رخساروں کی، زلفوں کی۔ اور شاید اسے میں کچھ پسند بھی تھا۔ میں نے اس دو تین دن کے قیام میں تمہیں بھلانے کی کوشش کی۔ اور واپس جا کر ان لڑکیوں کو خط لکھے جن سے محض تمہاری وجہ سے خط وکتابت بند کر دی تھی۔

کچھ دنوں کے بعد میرا تبادلہ اور دور ہو گیا، جہاں تنہائی کئی گنا زیادہ تھی، دلدل جنت تھی، ویرانیاں تھیں، خلشیں تھیں۔ پرانی یادیں دفن ہو گئیں، کچھ دنوں کیلئے زندگی

www.taemeernews.com

دفن ہو گئی۔

میں واپس لوٹا۔ سٹیمر کے لمبے سفر کے بعد ایک ایسی جگہ اُترا جہاں باغ ہی باغ تھے، لیکن بہار ابھی نہیں آئی تھی، وہ جگہ کچھ ایسی خوشنما بھی نہیں تھی۔ اور میں مسرور بھی نہ تھا پھر بھی جب میں آوارہ پھر رہا تھا تو مجھے ٹہنیوں میں نئی نئی کونپلیں دکھائی دے رہی تھیں۔ کملائے ہوئے پھولوں پر نہ جانے اتنی ساری تتلیاں کہاں سے آ گئی تھیں پنکھے کی شکل کے پتوں والے لمبے لمبے درخت ہوا سے جھوم رہے تھے، سمندر پر اُجلے اُجلے آبی پرندے اُڑ رہے تھے اُن کی سیٹیاں فضا میں گونج رہی تھیں۔ سمندر بالکل پرسکون تھا، نیلا اور چمکتا ہوا، دُور اُفق پر جہاں سمندر اور آسمان ملتے تھے وہاں اِکا دُکا کشتیوں کے بادبان نظر آ رہے تھے۔ آسمان بالکل نیلا اور شفاف تھا۔ کہیں ایک بھی بادل دکھائی نہ دیتا تھا۔ ایک ان جانی مسرت میری رُوح میں سمائی جا رہی تھی، میرا دل کہہ رہا تھا۔ کہ ابھی کوئی آیا چاہتا ہے۔ اور تم مجھے مل گئیں۔ تم نے ہلکا ہلکا نیلا لباس پہن رکھا تھا، بالکل آسمان کے رنگ کا، سمندر کے رنگ کا۔ تمہارے بالوں میں نیلے نیلے پھول لگے ہوئے تھے، تمہارے آویزے آسمانی رنگ کے تھے۔ تمہارے گلے میں آسمانی منکوں کا ہار تھا۔ تمہاری کلائیوں میں دو دو چوڑیاں تھیں آسمانی رنگ کی۔

تم نے بتایا کہ تمہارے ابا ان دنوں نزدیک ہی ایک کیمپ میں ہیں۔ تم یہاں چند دنوں کے لئے ہو پھر تم ان کے پاس چلی جاؤ گی۔ تمہاری امی ابھی گئی ہیں۔ تمہارے ساتھ تمہارے ننھے بہن بھائی ہیں۔ میرے ہوٹل کے بالکل سامنے وہ کوٹھی تھی۔ جس میں تم ٹھہری ہوئی تھیں۔ جب ہم سمندر کے کنارے بیٹھے تھے تو ماضی نے میرے دل کو مسوسنا شروع کر دیا۔ بیتے ہوئے تلخ لمحات ایک ایک کر کے یاد آنے لگے، میں نے تم سے کچھ نہ کہا۔ بس یونہی خاموش بیٹھا لہروں کو تکتا رہا۔

میں نے صرف تمہاری طرف ایک یا دو مرتبہ دیکھا۔ مجھے اپنے اُوپر اعتماد نہیں تھا۔ اگر میں کچھ دیر لگاتار تمہارے چہرے کو دیکھتا رہتا تو مسحور ہو کر رہ جاتا۔ تمہارے چہرے سے محبت جھلک رہی تھی، تمہاری آنکھوں میں پشیمانی تھی، اور باتوں میں التجا۔ تم مجھے منانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ہم دیر تک وہیں بیٹھے رہے۔ سمندر کے افق پر سورج غروب ہونے لگا۔ شفق پھولی، سمندر سرخ ہو گیا۔ ذرا سی دیر میں سورج رنگین بادلوں میں چھپ گیا اور اندھیرا پھیل گیا۔ ہوا کے جھونکے تیز ہوتے جا رہے تھے، لہریں مچل رہی تھیں۔ جدا ہوتے وقت تم نے کہا تمہارے کمرے میں رات کو ہلکی ہلکی سبز روشنی

www.taemeernews.com

رہتی ہے۔ اس کمرے کا ایک دریچہ سمندر کی طرف کھلتا ہے، وہاں سے میرا ہوٹل سامنے نظر آتا ہے تم نے یہ بھی کہا کہ رات بھر تم اپنے کمرے میں تنہا ہوگی اور اداس ہوگی۔

جب میں تمہیں چھوڑ کر واپس آرہا تھا تو سمندر سے ایسی آوازیں آرہی تھیں کہ جیسے رات کو طوفان آئے گا۔ اصلاً کو طوفان آیا، مہیب لہریں ساحل سے ٹکراتی رہیں۔ آندھی کے تند تھپیڑے شور مچاتے رہے، آبی پرندوں کی چیخیں سنائی دیتی رہیں میں نے کھڑکی سے دیکھا کہ تمہارے کمرے میں سبز روشنی ہے اور تم دریچے میں کھڑی ہو۔ میں سیڑھیوں سے اترا بھی، کچھ دور گیا، دریچے کے قریب تاریکی میں کھڑا تمہیں دیکھتا رہا۔ پھر واپس لوٹ آیا۔

رات بھر تمہارے کمرے میں روشنی رہی، تم بار بار دریچے میں آتی تھیں۔ رات بھر تم نے میرا انتظار کیا۔

اگلے روز مجھے وہاں سے جانا تھا اور میں چلا گیا۔

بعد میں دل کیسا کیسا تلملایا، نہ جانے اس رات تم مجھ سے کیا کہنا چاہتی تھیں جو تمہیں رات بھر میرا انتظار رہا۔ اگر میرے دل و دماغ میں وہ تلخی اس شدت سے جلول نہ کر جاتی تو میں آسانی سے وہ فقرے بھلا سکتا تھا جو تم نے میرے متعلق اپنی سہیلیوں سے کہے تھے۔ شاید تم ان کی چھیڑ سے بچنے کے لئے ان کے سامنے جھوٹ موٹ میری برائیاں کر رہی تھیں۔ تمہارے خط نہ لکھ سکنے کے سلسلے میں بھی اپنے دل کو بہلانے کے لئے کئی بہانے تراش سکتا تھا۔ شاید تم مجبور تھیں، شاید تم پر ایسی بندشیں ہوں جن کا مجھے علم نہیں۔ لیکن اس رات میں بیتی ہوئی تلخ باتیں دوہراتا رہا۔ تم دریچے میں کھڑی میرا انتظار کرتی رہیں۔ کاش کہ میں کچھ دیر کے لئے سب کچھ بھول جاتا۔ کاش کہ میں اس رات تمہیں ملنے چلا جاتا۔

ان باتوں کو کافی عرصہ گذر چکا ہے۔ میں تو تمہیں بھول ہی گیا تھا۔ کیا ہوا جو کبھی کبھار ذرا سی یاد آگئی۔ اور اب: تین دنوں کے بعد سمندر پار سے تمہارے ابا کا خط آیا ہے۔ جس میں تمہارا ذکر ہے۔ لکھا ہے کہ تم ہر وقت اداس رہتی ہو۔ بجھا افسردہ رہتی ہو۔ اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر کبھی کی کالج سے چلی آئی ہو۔ تم نے اپنے سارے مشغلے ترک کر دیئے ہیں۔ دن بھر کسی تنہا گوشے میں چپ چاپ بیٹھی کچھ سوچتی رہتی ہو۔ تمہارے چہرے پر اداسی کچھ اس طرح چھائی ہے کہ کبھی نہیں جاتی، مدتوں سے تم نہیں مسکرائیں۔

www.taemeernews.com

شاید میں تمہیں اب بھی یاد آتا ہوں، شاید پشیمانی ہے۔ شاید اب تمہیں میرے خط کا اتنا ہی انتظار رہتا ہے جتنا آج سے کچھ سال پہلے مجھے تمہارے خط کا رہا کرتا تھا۔ شاید وہ تلخیاں تم اب محسوس کر رہی ہو۔ جو میں نے چند سال پہلے محسوس کی تھیں۔

جب سے یہ خط آیا ہے تم بری طرح یاد آ رہی ہو۔

ایک رات بارش ہو رہی تھی، بوندیں ٹین کی چھت پر ٹپ ٹپ گر رہی تھیں، مجھے دارجلنگ کی وہ ملاقات یاد آ گئی جب ہم دھند میں گھرے ہوئے ایک دوسرے کو رات بھر دیکھتے رہے تھے۔ بالکل ایسی ہی رات تھی۔ اسی طرح بوندیں شور مچا رہی تھیں۔ چند دن ہوئے کلب میں کسی نے پیانو پر وہ دھن چھیڑ دی۔ یہ وہی دھن تھی جو اس رات پہاڑوں سے گھرے ہوئے اس باغ میں سنائی دے رہی تھی۔ جب پہلی مرتبہ میں نے تمہارے لب چوم لیے تھے۔ رات میں بل کھاتی ہوئی سڑک پر آ رہا تھا۔ یکایک سامنے کے اونچے پہاڑ کے پیچھے روشنی پھیل گئی اور بڑا سا چاند طلوع ہوا، سڑک چاندی کے تار کی طرح چمکنے لگی۔ مجھے وہ لمحات یاد آ گئے جب اسی طرح چاند طلوع ہو رہا تھا اور چمکتی ہوئی سڑک پر تم میرا انتظار کرتے کرتے چلی گئی تھیں۔

تم نے مجھے جسقدر مسرتیں دی ہیں اسی قدر ستایا بھی ہے، جہاں زندگی کی حسین ترین چیزوں سے تمہاری یادیں وابستہ ہیں وہاں زندگی کے تلخ ترین اور تاریک لمحات بھی تمہاری وجہ سے آئے تھے۔ شاید تمہاری فطرت ہی ایسی تھی کہ تم پر کیفیتیں طاری ہوتی تھیں، یہ کیفیتیں اس طرح بدلتی تھیں کہ تم بھی بدل جاتی تھیں۔ ایسے لمحات آتے تھے جب تم محبت کرتی تھیں اور ایسے لمحات بھی آتے تھے جب نفرت اجنبیت میں بدل جاتی تھی اور کبھی نفرت میں —— لیکن جب تم نے محبت کی ہے شدید طور پر کی ہے اسقدر شدت سے کی ہے کہ مجھ پر محبت کی بارش ہونے لگی۔ محبت نے مجھے محیط کر لیا —— اور وہ تمہاری شوخ مسکراہٹ، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے تمہارے روئیں روئیں میں زندگی سج گئی ہے۔ تمہارے چہرے سے زندگی کی کرنیں پھوٹتی تھیں، تم خود زندگی تھیں، سب سے پیارا تو وہ ننھا سا تل تھا جو تمہارے لبوں کے گوشے پر تھا۔ اس تل میں بلا کی دلکشی تھی۔ اور پھر وہ تمہارے لبوں کا عجیب سا تناؤ، جیسے ہر وقت مسکرا رہے ہوں۔ مدتوں تم نے میرے خیالات کو بسایا ہے۔ مدتوں تم میری کائنات پر چھائی رہی ہو، میں نے لق و دق صحراؤں میں ریت کے سنہرے ٹیلوں پر تمہارا نام لکھا ہے۔ میں نے سمندر کے کنارے سنگریزوں سے تمہارا نام لکھا ہے، اپنی جبینوں پر، نئی نئی گری ہوئی ملائم برف پر تمہارا نام لکھا ہے۔ میں نے جھیلوں میں تیرتے ہوئے کنول کے پھولوں کو اس طرح ترتیب دیا کہ تمہارا نام پڑھا جاتا تھا۔ میں نے لپکتے ہوئے شعلوں کی چنگاریوں سے تمہارا نام لکھا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اندھیری راتوں میں ستاروں سے تمہارا نام اس طرح لکھوں کہ آسمان جگمگا اٹھے —— آج تک میں نے تمہیں کوئی خط نہیں لکھا، کچھ دنوں سے میرا جی چاہ رہا ہے کہ تمہیں خط لکھوں، طویل اور بے معنی، نہ جانے میں اسے تمہیں بھیجوں گا بھی یا نہیں۔ اگر میں نے اسے لکھ کر پھاڑ دیا تو یہ جو اتنے پچھتاوے آ رہے ہیں ان میں ایک اور کا اضافہ ہو جائے گا۔

www.taemeernews.com

ممتاز مفتی

معظم پورہ

ویرانے کے وسیع پھیلاؤ میں ——— دور جلے ہوئے ٹنڈ منڈ درختوں کے جھنڈ کے پرے ایک اونچے مٹیالے ٹیلے پر نانک چندی اینٹوں کی دیواریں نظر آتی ہیں جن میں یہاں وہاں چار ایک سہ منزلہ چوبارے مغلیہ وقار سے کھڑے ہیں ان کے پرے پورہ کی جامع مسجد کے مینار استادہ ہیں اور مندر کا کلس سورج کی روشنی میں چمک رہا ہے۔ خانکوٹ کی طرف جاتے ہوئے عظمت آباد روڈ کے مختصر سے ریلوے سٹیشن سے شاید آپ نے کھڑکی سے سر نکال کر دور افق پر معظم پورہ کو دیکھا ہو۔

ویرانے سے ایک سہمی ہوئی گھبرائی ہوئی پکی سڑک گرتی پڑتی پورہ کی طرف بھاگی جاتی ہے جس پر مریل گھوڑے کھچا کھچ بھرے ہوئے ببو کاٹ کو کھینچنے کی کوشش میں ہانپتے رہتے ہیں۔ گاڑیبان بانس پر بیٹھ کر اونگھتے ہیں۔ اندر متشرع چہروں۔ محراب زدہ پیشانیوں اور متشکر نگاہوں والے جامہ دساں لوگ تنگیٔ جا کی تکلیف کے باوجود اطمینان کا غلاف اوڑھے ببو کاٹ کے ساتھ لڑھکتے چلے جاتے ہیں۔

پورہ کے قریب چھوٹی اینٹوں کی بوسیدہ چار دیواریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ جو آج تک پورہ کے ان تاریخی باغات کی یاد دلاتی ہیں۔ جن میں سوکھے کبڑے اور بوڑھے درخت کمر پر ہاتھ رکھے، خمیدہ ہیں اور ان پر مریل چیلیں چپ چاپ بیٹھی ہر آتے جاتے کو غور سے دیکھتی ہیں۔ باغات کے پاس ہی "پورہ" گھٹنوں کے بل کھڑا ہے۔ جیسے رکوع میں ہو۔ چار دیواری کے اندر ایک تنگ بازار ہے۔ جہاں دکاندار نہایت اطمینان اور فراغت سے بیٹھے اونگھتے ہیں۔ اونگھتے اونگھتے دفعتاً چونک کر کھانس بھی لیتے ہیں۔

پورہ کے بازار میں کوئی عورت گزرتی دکھائی نہیں دیتی۔ گویا قصبہ میں صرف مرد ہی

www.taemeernews.com

مرد ہوں۔ گزرے بھی، تو آنچل بار بار پاؤں میں پھنس جاتا ہے۔ پاؤں لڑکھڑا جاتے ہیں۔ جیسے بند ہوتی ہوئی ہوا میں کوئی نازک سی پتنگ ڈول رہی ہو۔

لیکن بل کھاتی ہوئی تنگ گلیوں میں عورتیں بے تکلفی سے گھومتی ہیں۔ ایک دوسری سے ہاتھ چلا چلا کر باتیں کرتی ہیں۔ کوئی، چھاتی تھام کر رہ جاتی ہے "ہائیں"۔ کوئی کھڑکی سے سر نکال کر کچھ پوچھتی ہے۔ ایک دہلیز پر آ بیٹھتی ہے۔ دوسری گلی میں چوکی بچھا لیتی ہے۔ نوجوان لڑکیاں دروازوں اور کھڑکیوں سے جھانکتی ہیں۔ گلی کی نکڑ پر محلے کے بچے کھیلتے پھدکتے ہیں۔ کبھی کوئی مرد گلی میں آجائے تو گھبرا کر یوں نکل جاتا ہے جیسے کٹا ہوا پتنگ زمین پر گر رہا ہو۔ اور واحد علی گلی میں آنکلتے ہیں تو نقشہ ہی بدل جاتا ہے۔ عورتیں دبک کر بیٹھ جاتی ہیں۔ نوجوان لڑکیاں کھڑکیوں سے سرک جاتی ہیں۔ بچے اور کتے پاؤں کی چاپ سنتے ہی منتشر ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ اب واحد علی گلی میں نہیں آتے۔ پھر بھی رات کے سناٹے میں وقار منزل سے واحد علی کی کھنکار گونجتی ہے تو روتے ہوئے بچے سہم کر ماؤں سے چمٹ جاتے ہیں۔ بھونکتے ہوئے کتے چپ چاپ کسی نالی پر جا لیٹتے ہیں۔ راہ چلتا فقیر دو منٹ کے لئے صدا دینا بھول جاتا ہے اور منزل کے اندر بھی نوکرانی کے ہاتھ سے کانچ کا گلاس گر کر ٹوٹ جاتا ہے تختی پر لکھتے ہوئے اعظم کا بازو کانپنے لگتا ہے۔ دوات الٹ جاتی ہے۔ ننھا وقار دفعتاً دودھ پینا بند کر دیتا ہے اور ہونٹ نکال کر ماں کی طرف دیکھتا ہے اور پھر مسکرا دیتا ہے جیسے وہ واحد علی کی کھنکار کی ماہیت سے واقف ہو۔ اور وحیدہ زیر لب ہنس دیتی ہے۔

لیکن یہ قصہ اس وقت کا ہے۔ جب وقار ابھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ جب وحیدہ محض جانتاں تھی اور اس نے زیر لب ہنسنا نہیں سیکھا تھا۔ جب واحد علی گلی میں سے آیا جایا کرتے تھے۔ اور آتے جاتے ہوئے بوڑھی عورتوں سے باتیں بھی کیا کرتے تھے۔ جب ان کی کھنکار سنکر اعظم کی دوات نہ الٹتی تھی۔ جب معظم پورہ معظم پورہ نہیں تھا۔ اور لوگ اسے موجپورہ کہا کرتے تھے۔

ان دنوں موجپورہ واقعی موج پر تھا گلیوں اور بازاروں میں "موج" کی ریں چلتی رہتی تھیں۔ عورتیں بازاروں میں بے تکلف آتی جاتی تھیں چلتے چلتے رک جاتیں "بھائی پھینٹ کس بھاؤ دوگے؟" بھائی اٹھ بیٹھتا "آؤ بہن! میرے پاس چھینٹوں کے نئے نمونے آئے ہیں۔ دیکھو تو پہلے پھر بھاؤ کی بات بھی ہو جائے گی"۔ صمد رسنار کی الماری کی طرف دیکھ کر کہتیں "اے ہے چچا بندوں کے یہ فیشن تو بالکل پرانے ہیں" اور چچا ہنس کر کہتا۔ "بی بی! نیا نو دن پرانا سو دن" مرد گلیوں میں کھڑے

www.taemeernews.com

ہو کر باتیں کرنے لگتے "بہن فاطماں! تو تو عید کا چاند ہو گئی؟" نائی جیواں ایک لڑکے کے رشتے کی بات چیت طے ہو گئی۔ بھئی ہمیں کب تک انتظار کرنا ہو گا۔ میں تو اب بڈھا ہو گیا!" گلی میں بیٹھی ہوئی عورتوں کو دیکھ کر مرد دروازے کی دہلیز پر جا بیٹھتے اور ان سے باتوں میں مصروف ہو جاتے۔ پھر ان کے قہقہوں سے گلی میں شور مچ جاتا۔ کھڑکیوں میں سے جوان لڑکیاں کھی کھی کرتیں۔ تنور پر کھڑی ہوئی مٹیاریں ہاتھ چلا چلا کر چچا صمدو کی باتوں کا جواب دیتیں۔ بچے شور مچاتے، کتے بھونکتے اور مرغیاں کڑ کڑ کرنے لگتیں۔ اور یہ شور واحد علی کی بیٹھک تک پہنچ جاتا۔ واحد علی مسکرا کر پوچھتے "بھئی، آج گلی میں کون پٹ رہا ہے۔ چچا صمدو!؟" وہ ہنستے۔ "چچا صمدو کو چپ کرانا آسان کام نہیں۔ سب سے نبٹ لیگا۔" وہ قہقہہ لگا کر کہتے۔ اور ان کا قہقہہ گلی میں گونجتا تو گلی کی عورتیں اور بھی بپھر جاتیں اور چچا صمدو پر برس پڑتیں ——— ہاں، ایک برس پہلے موج پورہ میں "موج" کی رویں رواں رواں تھیں۔ لیکن اب تو وہ معظم پور ہے۔ مرد کی چاپ پر عورتیں گلی میں سمٹ جاتی ہیں۔ چپ ہو جاتی ہیں۔ بازار سے عورتیں گزریں تو مرد کھانس کر منہ موڑ لیتے ہیں۔ واحد علی کی بیٹھک ویران رہتی ہے۔ اور ان کی کھنکار سن کر تنور والی کے ہاتھ کی سیخ کانپ جاتی ہے اور روٹی راکھ پر جا گرتی ہے۔ اور یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ موج پورہ معظم پور بن گیا اور جاناں کی گود میں قمار کھیلنے لگا۔ ان دنوں بھی پورہ میں واحد علی کو بڑی اہمیت دی جاتی۔ ان دنوں بھی لوگ ان کی باتوں کا احترام کرتے۔ پورہ بھر میں انہیں سب سے بڑا جانتے۔ لیکن ان دنوں تنور والی ان کی کھنکار سن کر ٹھٹکتی نہیں تھی۔ لوگ ان کی عزت تو کرتے تھے۔ مگر ان سے چھپتے یا گھبراتے نہیں تھے۔ کیسے گھبراتے؟ جب واحد علی انہیں دور سے ہی دیکھ کر "السلام علیکم" کہہ کر مزاج پرسی کرنے لگتے تھے۔ پاس بٹھا کر جملہ عزیزوں کی خیریت کی خبر پوچھتے تھے۔ اور دکھ درد میں ان کی مدد کرتے۔

مثلاً قائم علی کی بات لیجئے۔ حالانکہ وہ ایک معمولی کسان تھا۔ پھر بھی واحد علی گھنٹوں پاس بٹھا کر اسے تسلیاں دیا کرتے۔ "فکر نہ کرو قائم علی! دکھ کے دن بھی بیت ہی جاتے ہیں۔ خدا کا فضل شامل حال ہو۔ بس" لیکن قائم علی کو گویا اپنے دکھوں سے محبت تھی۔ وہ انہیں بچوں کی طرح پالتا پوستا رہتا تھا۔ ہر وقت گود میں لئے پھرتا۔ ہر کسی کو دکھاتا پھرتا۔ "یہ دیکھو بھائی! ایک مصیبت ہو تو کوئی بات بھی ہے۔ ہزاروں روگ ہیں۔ بھائی جی! کس کس کا رونا روؤں؟ گھر میں لڑکی جوان ہو رہی ہے، یہ بوجھ بھی میرے کندھوں پر پہاڑ بن کر پڑا ہوا ہے۔" "یہ کام بھی ہو ہی جائے گا۔" واحد علی کہتے "خدا بڑا مسبب الاسباب ہے"

www.taemeernews.com

ہر روز قائم علی اپنے کنوئیں سے آتے ہوئے واحد علی کے پاس بیٹھ جاتا اور فصل، مویشی یا پاکستان کا قصہ چھیڑ دیتا۔ پھر چلتے چلاتے یہ قصہ اس کی بیٹی تک جا پہنچتا۔ جو گھر میں بیٹھے بٹھائے جوان ہوئی جا رہی تھی۔ اور واحد علی ہر روز اُسے تسلیاں دیتے رہتے۔ پھر ایک دن چانتاں کی بات چھیڑتے ہوئے قائم علی کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ پچکے ہوئے گالوں پر دو قطرے ڈھلک آئے۔ "حوصلہ کرو۔ قائم علی!" واحد علی نے اُسے تھپکی دی "خدا مسبب الاسباب ہے"۔ مگر نہ جانے اس روز قائم علی کو کیا ہوا تھا بولا: "مسبب الاسباب ہوتا تو ہمارا یہ حال نہ ہوتا بھائی جی!" اور نہ جانے اس چھوٹے سے فقرے نے کیسی قیامت بپا کر دی۔ کہ یہ فقرہ واحد علی کی روح میں جا پھنسا۔ جسم میں سوئیاں بن کر چبھ گیا۔ اور چند ساعت کے لئے اسے اتنا شل کر دیا کہ وہ قائم علی کو تسلی بھی نہ دے سکے۔ دل ہی دل میں انہوں نے محسوس کیا جیسے خدا کی خدائی فنا ہوئی جا رہی ہے۔ ایمان کی کشتی ڈول رہی ہے۔ قائم علی تو یہ بات لکھ کر چلا گیا۔ لیکن واحد علی اس چھوٹے سے فقرے کے بھنور میں پھنس گئے۔ چاروں طرف سے ایک طوفان سا اُمڈ آیا۔ اور بیچ منجدھار میں جیسے وہ نوح کی کشتی لئے کھڑے رہ گئے۔ رات کے سناٹے میں چاروں طرف سے گھنا اندھیرا موجیں مارنے لگا۔ اور ان موجوں کے درمیان ایک چھوٹا سا چراغ جھلملانے لگا۔ "چراغ نہیں بجھے گا!" انہوں نے فیصلہ کر لیا اور پھر فوراً ہی دونوں ہاتھوں سے چراغ کی لو کو ڈھانپ لیا ——— دفعتاً طوفان رُک گیا۔ بادل پھٹ گئے۔ اندھیرا کافور ہو گیا۔ اور سامنے آسمان پر منور چاند ڈولنے لگا۔ "چانتاں!" ——— وہ مسکرا دیئے۔

اگلے روز جب پورہ کی بزرگ مائی جیواں، قائم علی کی بیوی کے پاس واحد علی کے سب سے بڑے بیٹے کبیر علی کے لئے چانتاں کے رشتے کا پیغام لے کر آئی تو قائم علی کی بیوی حیران رہ گئی۔ حیرانی کی بات تو تھی ہی؟ کہاں اتنے بڑے زمیندار کا لڑکا اور کہاں ایک معمولی کسان کی لونڈیا۔ خود مائی جیواں حیران تھی لیکن واحد علی کے اصرار پر اسے جانا ہی پڑا تھا۔ کیسے نہ جاتی۔ جب واحد علی نے صاف صاف کہہ دیا "مائی جیواں! خدا کے سامنے سب چھوٹے بڑے ایک ہوتے ہیں۔ خدا کے فضل سے وہ بھی مسلمان ہیں اور ہم بھی۔ پھر سوچ کس بات کی؟"

پورہ والوں نے جب اس انوکھے رشتے کی خبر سنی تو وہ دانتوں تلے انگلی داب کر رہ گئے۔ مانا کہ چانتاں "پورے" کی حسین ترین لڑکی تھی۔ لیکن حسن تو کوئی معتبر خصوصیت نہیں۔

www.taemeernews.com

مانا کہ قائم علی ایک شریف آدمی تھا۔ مگر زمیٰ شرافت کو کون خاطر میں لاتا ہے۔ مانا کہ واحد علی کا بڑا بیٹا کبیر علی بیمار رہتا تھا لیکن آخر وہ واحد علی کا بیٹا تھا۔ اور واحد علی پورہ کے سب سے بڑے زمیندار تھے۔ مانا کہ واحد علی اونچ نیچ کے قائل نہ تھے لیکن اونچ نیچ کا قائل نہ ہونا اور بات ہے۔ مگر اونچ نیچ کی اس قدر تحقیر کر دینا؟ —— یہ کھلی تحقیر! ؟ —— حیرانی کی بات تو تھی ہی۔

چاناں واحد علی کے گھر آئی تو واقعی اندھیرے میں نور کی ایک کرن چمک اٹھی۔ اس کرن سے سارا گھر منور ہو گیا۔ واحد علی کی بیوی کو مرے ہوئے دو سال ہو چکے تھے۔ مرنے سے پہلے بھی اس نے دو ایک سال چارپائی پر پڑے پڑے گذارے تھے۔ بیٹی کوئی تھی نہیں کہ گھر کو گھر بنائے رکھتی۔ اگرچہ تین تین بیٹے تھے۔ لیکن بیٹوں کے ہونے سے بھلا گھر بنا ہے کہیں؟ ہونے کو تو دو عورتیں بھی تھیں جو دودھ دوہتیں، لسی بلوتیں۔ کھانا پکاتیں۔ کبیر علی کی تیمارداری کرتیں۔ اعظم کو مدرسے بھیجتیں اور اس کے بڑے بھائی صغیر علی کی دیکھ بھال بھی کرتیں۔ لیکن وہ تو نوکرانیاں تھیں، عورتیں نہیں، جبھی تو گھر کے رکھ رکھاؤ کے باوجود وہ اسے گھر نہ بنا سکتی تھیں۔

لیکن ادھر چاناں آئی ادھر گھر میں رنگدار اور ریشمیں کپڑے جھلملانے لگے۔ چوڑیوں کی جھنکار سنائی دینے لگی۔ نازک بندے ہوا میں جھولنے لگے۔ خس اور چنبیلی کے عطر کی خوشبو پھیلتی گئی اور مہندی کی خوشبو کٹوروں سے نکل کر انگلیوں میں آ بسی۔ دیئے کی سیاہی طاق سے نکل کر آنکھوں میں چمکنے لگی۔ واحد علی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آنا شروع ہو گئی۔ کبیر علی کی مریض آنکھوں میں زندگی کی ہوس چمک بن کر لہرائی۔ اور یوں محسوس ہونے لگا۔ جیسے گھر میں عورت آ گئی ہے۔

کہتے ہیں زندگی کی ہوس چمک بن کر آنکھوں میں اس وقت لہراتی ہے۔ جب زندگی کا دامن ہاتھ سے چھوٹا جا رہا ہو۔ اور کبیر علی اس ذیل میں آتا تھا یا نہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ چاناں پر ہسٹیریا کے دورے پڑنے شروع ہو گئے تھے۔ اکثر کبیر علی کی طرف دیکھ کر وہ ٹھنڈی آہیں بھرتی اور پھر بھاگ کر چارپائی پر لیٹ جاتی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے چھت کی طرف دیکھتے دیکھتے بیہوش ہو جاتی۔

گھر کی اس آبادی پر واحد علی میں بھی چند ایک تبدیلیاں واقع ہو رہی تھیں۔ لیکن وہ تبدیلیاں اس قدر مبہم اور گہری تھیں کہ انہیں ایک بے نام اضطراب کے سوا اور کچھ محسوس نہ ہوتا تھا۔ کئی بار جب وہ اس بھرے پرے گھر میں داخل ہوتے تو فضا انہیں

www.taemeernews.com

محسوس ہوتا کہ وہ اکیلے ہیں۔ اور اتنے بڑے گھر میں یہ مختصر سی رونق بیحد تھوڑی ہے۔ چاناں کے آنے سے جو ایک چھوٹی سی آبادی پیدا ہوئی تھی۔ اس وسیع مکان کے ایک بہت بڑے حصے کو ویران کر گئی تھی۔ نہ جانے اس مبہم سے احساس کی وجہ سے یا کیوں؟ واحد علی نے مکان کے بند حصوں کو کھلوایا انہیں صاف کروایا تاکہ قابل رہائش ہو سکیں۔ اپنے وقت کا بڑا حصہ ان ویران کمروں میں بیٹھ کر گزارنا شروع کر دیا۔ شاید وہ انہیں آباد کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یا شاید اپنے دل کی ویرانی کے مبہم احساس کو جھٹلا رہے تھے۔ بہر حال انہوں نے اپنی بیٹھک میں بیٹھنا کم کر دیا۔ بیٹھک میں نہ بیٹھنے سے ان کا اضطراب اور بھی بڑھا۔ اور وہ گھر میں یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں پھرنے لگے۔

ایک دن وہ یونہی گھومتے گھامتے تہ خانے میں جا نکلے۔ اور ایک کونے میں پرانی کتابوں کے ڈھیر پڑے دیکھ کر چونکے یہ وہ قلمی کتابیں تھیں جو انہوں نے کبیر علی کو مطالعہ کے لئے دی تھیں۔ تاکہ وہ انہیں دیکھ کر معلوم کرے کہ ان میں سے کون کون سی کام کی ہیں۔

اگلے روز انہوں نے اپنی پڑھنے والی عینک صاف کی۔ قلمدان کو سنوارا اور چوبارے پر جا بیٹھے۔ لیکن انہیں وہاں بھی اطمینان حاصل نہ ہوا۔ وہ سنوارا ہوا قلمدان اور صاف کی ہوئی عینک انہیں اور بھی مضطرب کر رہے تھے۔ اسی اضطراب میں وہ نیچے اتر آئے۔ نحیف و نزار کبیر علی آنکھیں بند کئے بے سدھ پڑا تھا۔ دوسرے پلنگ پر چاناں لیٹی کالی چھت کی طرف گھور رہی تھی۔ جیسے اس بوسیدہ اور دھندلی چھت کے آئینے میں اپنا مستقبل دیکھ رہی ہو۔ "اعظم!" واحد علی نے آواز دی۔ چاناں چونک کر اٹھ بیٹھی۔ خوشبو کی ایک لپٹ سی آئی اور واحد علی نے منہ موڑ لیا۔ "اعظم! ذری لالٹین جلا کر میرے ساتھ تہ خانے تک چلو، وہاں کتابیں دیکھنی ہیں"۔ لیکن اس وسیع دالان میں ان کی آواز یوں کھو گئی۔ جیسے اُس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ جواب میں سناٹا پا کر انہوں نے منہ موڑے موڑے چاناں سے کہا۔ "بی بی! اعظم کہاں گیا ہے؟" چار ایک منٹ کی مسلسل خاموشی کے بعد دفعتاً انہوں نے منہ موڑ کر دیکھا تو چاناں لالٹین لئے پاس کھڑی تھی۔ وہ چونک پڑے۔ "اعظم نہیں ہے ــــ؟ ــــ وہ کمبخت ....." انہوں نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ "اچھا لالٹین بھی جلالی ہے!" اور یہ کہہ کر وہ اضطراری کیفیت میں تہ خانے کی طرف چلنے لگے۔

واپسی پر چاناں دھم سے آکر پلنگ پر گر پڑی۔ اس نے ایک حسرت بھری نگاہ کبیر پر ڈالی جو چارپائی پر آنکھیں بند کئے بے سدھ پڑا تھا۔ ایک موہوم سی آہ کے ساتھ وہ پھر اس کالی

چھت کو گھورنے لگی۔ پلنگ کے پاس پڑی ہوئی لالٹین جلتی ہی رہی۔ چولہے پر رکھی ہوئی ہنڈیا پک پک کر سڑنے لگی۔ صحن میں گڑا ہوا تنور سرخ ہوکر ٹھنڈا پڑ گیا۔ اور وہ جوں کی توں پڑی دھوئیں سے اٹی ہوئی چھت کی طرف تکتی رہی۔ تکتی رہی ——

چوبارے پر جاکر واحد علی نے عینک صاف کی۔ قلمی کتاب کو کھولا۔ اور پھر رکھ دیا۔ قلم کو سیاہی میں ڈبویا۔ ناخن پر اسے آزمایا اور قلمدان میں رکھ دیا۔ پھر سے کتاب اٹھالی۔ لیکن فوراً اسے رکھ کر عینک صاف کرنے لگے۔ پھر دفعتاً حقے کی طرف دیکھ کر مسکرائے "اہیم"۔ ان کی آواز گلی میں گونجی۔ اور وہ خود ہی چونک پڑے۔ انہوں نے محسوس کیا جیسے پورہ والے چاروں طرف گوش برآواز بیٹھے ہیں۔ پھر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ان جانے میں کھڑکی کے پٹ بند کر دیئے۔ پھر گھومتے گھامتے واپس آکر بیٹھ گئے "ایں!" وہ چونکے۔ قلمی کتاب کے سرورق پر معظم پورہ کا نام جلی قلم سے لکھا ہوا۔ انہوں نے جلدی جلدی ورق الٹا دوسرے ورق پر لکھا تھا۔ "حکایاتِ معظم پورہ مرتبہ عظمت علی راست قلم۔"

"اہیم۔ ہم۔ ہم" ان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ جیسے وہ اونچی کھنکار سے پورہ والوں سے انتقام لے رہے ہوں۔ پھر وہ کتاب کے مطالعہ میں کھو گئے۔

شام کے وقت وہ حقہ لے کر کبیر علی کے پاس آ بیٹھے کھنکھار کر گلا صاف کیا حقے کے دو کش لئے اور بولے "کبیرا! ہمیں اپنے خاندان کی تاریخ مل گئی۔ ہم صدیقی ہیں صدیقی اہیم —— !! ہمارے بزرگ شیخ عظمت علی سیدھے عرب سے یہاں آئے۔ اور اس شہر کی بنیاد ڈالی معظم پور اس کا نام رکھا۔ بعد کے جاہلوں نے اسے بگاڑ کر موجو پور کہنا شروع کر دیا۔ اہیم —— !!" بیچارہ کبیر علی آنکھیں بند کئے کراہ رہا تھا لیکن واحد علی اس کراہ سے الگ ہوکر معظم پور کی حکایات دہرائے جا رہے تھے۔

دالان سے نکل کر وہ حکائتیں بیٹھک میں جا پہنچیں۔ بیٹھک سے گلی میں اور گلی سے بازار میں۔ جنہیں سن کر تنور پر عورتیں جمع ہوگئیں۔ بازار میں مردوں کے ٹھٹ لگ گئے۔ گھر میں واحد علی کی کھنکار گونجنے لگی۔ اس کھنکار کا صوتی اثر کچھ ایسا تھا۔ جیسے حلق میں کوئی صدیقی، صدیقی !! کہہ رہا ہو۔ پورہ بھر میں صرف جاتاں ہی ایسی تھی۔ جو معظم پور کی حکایات سے متاثر نہ ہوئی۔ ویسے ہی پلنگ پر پڑے پڑے، دھوئیں کی کالک سے اٹی ہوئی چھت کو گھورتی رہی اور کبیر علی کی طرف دیکھ دیکھ کر آہیں بھرتی رہی۔

واحد علی" حکایات معظم پور" کی گوناگوں دلچسپیوں کے باوجود پریشان رہتے۔ ان کا اضطراب" اہیم" بن کر گونجتا۔ تو اپنی آواز سن کر وہ آپ ہی چونک اٹھتے چاروں

www.taemeernews.com

طرف دیکھتے ۔ اور پھر مطمئن دکھائی دینے کی کوشش کرتے ۔

پہلے وہ چھوٹے موٹے کاموں کے لئے اعظم کو آواز دیا کرتے تھے ۔لیکن چند دنوں سے یہ عجیب اتفاق ہو رہا تھا کہ جب بھی انہیں کوئی کام کروانا ہوتا اور اعظم موجود نہ ہوتا۔ تو وہ جاناں کو آواز دینے کے لئے مجبور ہو جاتے ۔ وہ اُسے بی بی کہا کرتے تھے ۔لیکن نہ جانے کیوں ؟ "بی —" کہنے کے بعد دفعتاً رک جاتے ۔ ادھر جاناں اُن کی آواز سُننے کے باوجود جوں کی توں پڑی رہتی حتیٰ کہ کبیر علی کروٹ بدل کر جاناں کی طرف غور سے دیکھنے لگتا ۔ اسی طرح کئی مرتبہ واحد علی کو بی — پر رک جاتے ہوئے اور جاناں کو جوں کی توں پڑے رہتے ہوئے دیکھ کر اُس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا اور نجانے کب تک وہ دیکھا کیا ، دیکھا کیا ۔

دوسرے دن اعظم نے جب جاناں کو حسب معمول بی بی کہہ کر پکارا تو واحد علی چونکے ۔ انہوں نے کتاب تخت پوش پر اُلٹی کر رکھ دی ۔ عینک اُتار کر صاف کی اور اعظم کو بلا کر کہنے لگے "اہیم ! اعظم ! تم بڑے خاندان کے لڑکے ہو تمہیں بی بی کہہ کر بلانا اچھا نہیں لگتا ۔ کہو بی بی جان — بی بی جاآن انہوں نے وضاحت سے سمجھانے کے لئے دہرایا ۔ پھر چند لمحوں کے بعد — وہ کھنکار کر کہنے لگے "بی — جان ذرا چلم میں آگ بھر دینا" یہ سنکر اعظم چونکا کیونکہ چلم میں آگ بھرنا تو اُسی کا فرض تھا ۔ ادھر مریض نے بھی کروٹ لی اور غور سے جاناں کی طرف دیکھا حتیٰ کہ جاناں اُٹھ کر آگ بھرنے پر مجبور ہو گئی ۔

اس کے بعد واحد علی کے گھر میں پے بہ پے تبدیلیاں آنی شروع ہو گئیں ۔ اُن کے "اہیم —" واضح اور پُرشور ہوتے گئے ۔ بات بات پر خاندانی وقار کو قائم رکھنے کی ہدایتیں دی جانے لگیں ۔ بیٹھک میں صدیقی خاندان کی رسومات بیان ہوتی رہیں ۔ بیٹھک میں بیٹھنا روز بروز منسوخ ہوتا گیا ۔ یوں بیٹھک میں بیٹھ کر عام لوگوں کی باتوں میں وقت ضائع کرنا خاندانی آدمیوں کو زیب نہیں دیتا ۔ مطالعہ ہی ایک اعلیٰ شغل ہے چنانچہ وہ چوبارے میں بیٹھ کر مطالعہ کیا کرتے ۔

چوبارے پر سے انہوں نے اُس کھڑکی کی طرف دیکھا جو اُس روز سے ویسے ہی بند پڑی تھی ۔ نہ جانے اُن پر کیا اثر ہوا بھاگے بھاگے نیچے آئے ۔ "کبیر علی ! یہ کھلے دروازے اور ننگی کھڑکیاں — ؟ بہت واہیات بات ہے — اس طرح رہنا صدیقیوں کا شیوہ نہیں — بی — جان ! " انہوں نے جاناں کو بلایا ۔" ان کھڑکیوں کے

www.taemeernews.com

لئے چقیں ہونی چاہئیں۔ اندر باہر کا بڑا دروازہ ہر وقت بند رہنا چاہئے۔ ہر آدمی منہ اُٹھائے اندر چلا آتا ہے۔ انسان کبھی کسی حالت میں بیٹھا ہوتا ہے کبھی کسی میں اپنے گھر ہی میں۔ اپنے گھر ہی میں آزادی نہ ملے تو گھر خاک ہوا۔ اور ہاں!۔ نوکرانیاں باہر مردانے میں کھانا پکایا کریں اور وہیں رہا کریں۔ وہ جگہ ویران پڑی ہے۔۔۔ فضول۔"
یہ سُنکر جاناں کے ہونٹوں میں ایک موہوم سی جنبش ہوئی۔ جیسے محسوس کرکے کبیر علی چونک اُٹھا اور پھر کھانسنے لگا۔

نوکرانیوں نے واحد منزل کے مردانے میں رہنا شروع کردیا گھر کے بڑے دروازے پر لکڑی کی بلی لگا دی گئی۔ کھڑکیوں پر چقیں لٹکنے لگیں۔ مریض کا کمرہ الگ کردیا گیا۔ اعظم اور صغیر کے لئے ایک علیحدہ کمرہ مخصوص کردیا گیا۔ اور بی بی جان کیلئے " لیکن وہ تو گھر کی مالکہ ہے۔ خاندان کا وقار اسی کے دم سے قائم ہے وہ جہاں جی چاہے رہے" واحد علی نے کبیر کو سمجھانے کی کوشش کی اور کبیر سوچ میں پڑ گیا۔ واحد علی سمجھاتے رہے اور وہ سوچتا رہا۔ آخر وہ تھک کر بولے " کیوں کبیر! کیا خاندانی عزت اور وقار کے لئے ہر قربانی دینی نہیں چاہیئے؟۔ میرا مطلب ہے۔" ہاں" وہ بولا۔ "خاندانی وقار" اور اُسے کھانسی کا طویل دورہ پڑ گیا۔

اگلے روز جب جاناں اُس کے کمرے میں گئی تو وہ چپ چاپ بے سُدھ سا پڑا ہوا تھا۔ پہلے تو جاناں اُسے بلاتی رہی۔ پھر پاس آکر دیکھا تو ایک چیخ نکل گئی۔ پل بھر میں سارا گھر اکھٹا ہو گیا۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا حکیم آئے مگر کبیر نے آنکھ نہ کھولی۔ پورے شہر میں چرچے ہونے لگے۔ گلی میں، بازار میں، ہر جگہ، ہر کسی کی زبان پر کبیر علی کا تذکرہ تھا۔ کوئی کبیر علی کی شرافت کی بات کرتا اور کوئی جاناں کی مصیبت کی۔ ایک نے کہا "خاندانی وقار کا بڑا خیال تھا بیچارے کو۔ اُس کی چارپائی کے پاس دیوار پر موٹے حروف میں "وقار" لکھا تھا۔" دوسرا بولا۔ کہتے ہیں غلطی سے مالش کی دوائی پی لی۔ تقدیر کا لکھا کون موڑ سکتا ہے۔" تو زینہ پر ایک آواز سنائی دی۔ لیکن اس وقت بیوی کہاں تھی۔ اپنے ہاتھ سے ہی پلاتی ورنہ۔"

واحد علی نے کبیر کی موت پر کوئی رسم نہ ہونے دی۔ حتیٰ کہ گلی محلے کی عورتوں کو بھی گھر میں نہ آنے دیا کیونکہ ایسی باتیں ایک صدیقی کے لئے شایانِ شان نہ تھیں۔ تقدیر کا لکھا پورا ہو چکا تھا۔ اب ماتم کرنا کفر تھا۔ البتہ سوگ کے دن بیت جانے پر انہوں نے چند ایک بزرگوں کو اکھٹا کیا اور کہا " کہ لڑکی کی عمر برباد کرنا اچھا نہیں۔ اور چونکہ اس گھر کا وقار اُسی سے قائم ہے، اس لئے اُسے گھر میں وہی پہلا مرتبہ حاصل رہے گا۔ ہمارا ارادہ

www.taemeernews.com

ہے کہ لڑکی کا نکاح چھوٹے لڑکے صغیر علی سے کر دیا جائے۔" اور محلے والوں نے سبحان اللہ سبحان اللہ کا شور مچا کر بات پکی کر دی۔ اگرچہ عملی طور پر اس کا طے ہونا بھی ممکن نہ تھا۔ کیونکہ جاناں پردے دنوں سے تھی۔ جاناں دو ایک دن تو چپ چاپ پڑی اُس کالی چھت کو گھورتی رہی پھر دفعتاً یوں اٹھ بیٹھی جیسے مدتوں سے کیچڑ میں پھنسی ہوئی ناؤ بہہ نکلی ہو۔ اُس کے پاؤں میں سبک روی پیدا ہو گئی۔ بندے ہوا میں جھولنے لگے۔ لباس سمٹ کر جسم کے ساتھ جا لگا اور خس کی خوشبو اُڑانے لگا۔ پھر جب اُس نے سُنا کہ اُس کا نکاح صغیر سے ہونے والا ہے۔ تو اُس کے ہونٹوں نے ایک شرارت بھری مسکراہٹ کو بھینچنے کی کوشش کی اور وہ گھر کے کام کاج میں کھو گئی۔ شام کو واحد علی نے گھر والوں کو اکٹھا کیا اور اعلان کر دیا کہ "آئندہ سے بی جان کا نام وحیدہ ہوگا۔ جاناں بھی کوئی نام ہے۔ صدیقی خاندان میں ایسے ویسے نام نہیں ہونے چاہئیں۔" لڑکا پیدا ہوا تو اس کا نام وقار علی رکھا گیا۔ اس سے بہتر نام اور کیا ہو سکتا تھا۔ خاص طور پر جب کبیر علی نے دیوار پر لکھ کر اشارتاً یہ بات یوں واضح کر دی تھی۔ جیسے یہ اس کی [illegible]۔ ادھر نکاح کے بارے میں صغیر علی کی ہچکچاہٹ روز بروز واضح ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ ایک دن باپ بیٹے میں تکرار بھی ہو گئی۔ "بے وقوف!" واحد علی چلائے "تمہیں خاندانی وقار کی بھی پروا نہیں۔" "آپ باقی باتوں میں خاندانی وقار کو خاطر میں کیوں نہیں لاتے؟" صغیر دبی آواز میں بولا۔ "باقی باتیں؟" واحد علی نے حیرت سے پوچھا۔ "ہاں!" وہ بولا "مجھے یہاں معظم پور میں نہیں رہنا چاہیئے۔" واحد علی کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ "ہمارے بزرگ عالم تھے اور میں دسویں پاس کر کے گھر بیٹھا ہوں۔" "اہم" واحد علی نے فاتحانہ انداز میں کھنکارا۔ "تو نکاح کے بعد تم تحصیل علم کے لئے چلے جاؤ۔ ہاں ہاں واقعی یہ بات خوب ہے خوب ہے" اور اس کے بعد پورے میں علم اور خاندانی وقار کا خوب خوب چرچا ہوا۔ جسے سن کر واحد علی کی کھنکار اور بھی بلند اور گہری ہو گئی۔ وحیدہ کے بھینچے ہوئے ہونٹ اور بھی متکلم ہو گئے۔ اور اس کی گود میں وقار نے مسکرانا سیکھ لیا۔ گھر کے لئے نئی چیزیں خریدی گئیں۔ صدر دروازے پر نئی بل لگا دی گئی۔ مکان کا نام واحد منزل کی بجائے وقار منزل رکھا گیا۔

جوں جوں واحد علی خاندانی وقار کا پرچار کرتے گئے۔ وحیدہ کی مسکراہٹ واضح ہوتی گئی۔ اُس کی چال میں لچک اور زیورات میں چمک پیدا ہوتی گئی۔ جوں جوں وحیدہ کی باتوں میں لوچ اور کپڑوں میں رنگ آتا گیا۔ واحد علی کا احساسِ وقار اور بھی بڑھتا

www.taemeernews.com

گیا۔" بی جاآن! کھڑکی میں کھڑا ہونا اچھا نہیں۔ ایسا کرنے سے ہماری عزت پر حرف آتا ہے۔ بی جاآن عورتوں کو گھر مت آنے دیا کرو۔ کہاں تم کہاں یہ" ان کی باتیں سن کر وحیدہ کی گود میں کھیلتا ہوا وقار ہنسنے لگتا۔ جیسے وہ ان کی ماہیت سے واقف ہو۔ "شیطان!" وہ چلاتے "ابھی سے ہماری باتوں پر ہنستا ہے۔ ابھی بچہ ہے نا خاندانی وقار کو نہیں سمجھتا"۔ "وقار۔ وقار" منڈیر پر بیٹھا ہوا کوا چیختا۔ "وقار۔ وقار" پرے کی مسجد کے مینار سے موذن کی آواز سنائی دیتی۔ "وقار وقار وقار وقار" پرے کی چکی چلاتی۔ احمد علی چونک اٹھتے اور ایک ساعت کے لئے واحد علی محسوس کرتے گویا وہ سب انہیں چڑا رہے ہوں۔ وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتے اور انہیں یوں لگتا جیسے چاروں جانب اک طوفان موجیں مار رہا ہو۔ اور اس طوفان کے درمیان وہ خود کیچڑ میں پھنسی ہوئی کشتی کو کھینچنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ "وقار وقار!" کشتی کے چپو کیچڑ سے ٹکرا کر آواز پیدا کرتے۔ چاروں طرف سے گھنا اندھیرا امڈا چلا آرہا تھا۔ اور درمیان میں ایک چھوٹا سا معطر چراغ جل رہا تھا۔ "چراغ نہیں بجھیگا!" انہوں نے دانت پیس کر کہا۔ اور دونوں ہاتھوں سے اُسے ڈھانپ لیا۔ "بی جاآن تم کھڑکی میں کھڑی نہ ہوا کرو۔ عورتوں سے نہ ملا کرو۔ تمہیں خاندانی وقار کا خیال رکھنا چاہئیے"۔ "ہی ہی ہی ہی۔ وقار ہنستا۔ اور وحیدہ مسکرا دیتی ۔

ہجوم

سیزر کے قتل کی خبر پا کر مشتعل ہجوم روم کے بازاروں میں سے گذر رہا تھا۔ ایک آدمی ہجوم کے سامنے سے گذرا۔

"تم کون ہو؟" ہجوم میں سے کوئی پکارا

"میرا نام سینا ہے" گذرنے والے نے جواب دیا

"اسے قتل کر دو۔ یہی غدار سینا ہے"۔ ہجوم میں سے ایک آدمی چلا اٹھا۔

"میں غدار سینا نہیں۔ شاعر سینا ہوں"۔

"یہ شاعر ہے۔ لیکن سینا کیوں ہے۔ اسے بھی قتل کر دو"۔

اور ہجوم گذرنے والے پر خونخوار درندے کی طرح جھپٹ پڑا۔

www.taemeernews.com

بشیر رومانی

سُورما

(فکر تونسوی نے ایک عجیب و غریب کتاب مرتب کی ہے "خد و خال"۔ اس میں ہندستان کے بیس ترقی پسند افسانہ نگاروں کے کیریکٹر اسکیچ شامل ہیں۔ اس میں فنکاروں کا فن نہیں۔ بلکہ شخصیت پیش کی گئی ہے۔ "سورما" اسی مجموعے کا ایک اسکیچ ہے)

ممتاز مفتی کے بارے میں کچھ کہنا آسان نہیں۔ آپ کسی اسکول میں چلے جائیں۔ جہاں وہ پڑھاتا رہا ہے۔ اور اس کے متعلق پوچھیں۔ تو ان کے شاگرد کہیں گے۔ "اُن کی باتیں؟ کیا بات ہے اُن کی باتوں کی مگر ان کا ڈنڈا ۔۔ توبہ ہے!!" اساتذہ مسکرا دیں گے۔ "ہاں یار تھا تو آدمی، مگر کچھ عجیب سا تھا۔" ہیڈ ماسٹر اطمینان بھرا سانس لیگا: "خیر اب تو یہاں سے چلا گیا چھوڑیئے اس بات کو۔" آل انڈیا ریڈیو کے کسی رکن سے پوچھیئے: "وہ شخص؟ خصوصیت تو خیر ۔۔ ویسے خوب آدمی ہے۔ اچھا ہی ہے۔ میرا مطلب ہے آپ سمجھتے ہی ہیں نا ۔۔" "نیا ادارہ" میں بات چھیڑیئے۔ ان کی آنکھوں میں چمک لہرا جائیگی: "ممتاز مفتی ۔۔ ممتاز مفتی، ممتاز مفتی ہی ہے، ہاں ذرا پیسوں کے معاملے میں ۔۔ لیکن خیر، حاجت مند کون نہیں۔" اس کے والد سے بات کیجیئے۔ ایک ساعت کے لئے وہ خاموش ہو جائیں گے۔ پھر حقّے کا ایک لمبا کش ساتھ لے کر کہیں گے ۔۔ "اب تو جو ہونا تھا۔ ہو چکا ۔۔ ہاں اگر وہ اتنا خود سر نہ ہوتا۔ اور عقل سے کام لے سکتا۔ تو اس کی زندگی سنور ہی جاتی۔" اس کی پہلی بیوی سے بات کی جاتی۔ تو وہ ہنس دیتی: "اچھا۔ تو آپ انہیں مرد سمجھتے ہیں؟" اور دوسری بیوی سے پوچھیئے۔ تو وہ ہونٹ پہ انگلی رکھ لے گی۔ "ان کی بات کر رہے ہیں آپ؟ ان کی کیا بات ہے!"

ممتاز مفتی بچپن اور سنجیدگی کا امتزاج ہے: چھوٹے قد کا منحنی آدمی ملبوترہ چہرہ، گدلی گدلی بیجان آنکھیں اور بڑا سا سر۔ بات کیجیئے۔ تو آپ حیران رہ جائیں گے: "ارے! یہ تو محض بچی حضوری ہے۔" پہل: "توبہ ہے ممتاز مفتی!" احساس برتری کی ایک لہر آپ کی رگ رگ میں دوڑ جائیگی۔ چھاتی قدرے باہر کو اینٹھ آئیگی۔

www.taemeernews.com

کسی موضوع پر چاہے وہ کتنا ہی مضحکہ خیز ہو۔ اس کی رائے دریافت کیجیے۔ تو نہایت خلوص اور دیانتداری سے آپ کی ہاں میں ہاں ملا دیگا۔ اس کی موجودگی میں کسی معاملے پر بحث کر لیجیے۔ چپکا بیٹھا سنتا رہے گا اس سے استفسار کیجیے۔ تو آپ کی ہنسی نکل جائیگی۔ کیونکہ وہ آپ کے اور آپ کے مخالف کے ساتھ بیک وقت اتفاق کر رہا ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ نکتۂ متنازعہ فیہ آپ کی حیرانی اور ہنسی کے درمیان کہیں کھو جائیگا۔ اگر آپ ذرا سنجیدہ قسم کے انسان واقع ہوئے ہیں۔ تو آپ کو غصہ آنے لگیگا۔ یا آپ اسے مشکوک نگاہ سے دیکھنے لگیں گے۔

ممتاز مفتی کو آپ اس روپ میں صرف اسی صورت میں دیکھیں گے۔ جبکہ آپ کی اس سے محض رسمی ملاقات ہو۔ لیکن اگر آپ اس کے دوست ہیں۔ پناہ بخدا۔ کاش کہ میں اور ممتاز مفتی محض شناسا ہوتے، دوست نہیں۔ جب میں اس سے پہلی مرتبہ ملا۔ تو وہ چارپائی پر بیٹھا طبلہ بجا رہا تھا۔ رسمی تعارف کے بعد اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا۔ "مزاج اچھے ہیں؟ تشریف رکھیے" اور پھر سے طبلہ بجانے میں منہمک ہو گیا۔ "یہ ہے ممتاز مفتی؟" میں نے سوچا۔ اب اکثر مجھے محسوس ہوتا ہے۔ کہ ممتاز مفتی شاید مجھ سے اس اَن کہے فقرے کا انتقام لے رہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ ان دونوں میں سے حقیقی ممتاز مفتی کونسا ہے۔ وہ جو کچھ سال پیشتر مجھ سے متعارف ہوا تھا۔ اور مہینوں محض واقف کار کی حیثیت سے ملتا رہا یا یہ جو اس وقت میرے پاس بیٹھا ہے۔ اور دوستی کا دم بھر رہا ہے۔

دوستی کی ابتدا میں وہ آپ کی شخصیت میں انوکھے گُن دیکھے گا۔ اور ان کا آپ سے بے تکلف اظہار کریگا ایسے انوکھے گُن جن کے وجود کا آپ کو وہم و گمان بھی نہ ہوگا آپ سمجھیں گے کہ وہ مذاق کر رہا ہے۔ اور آپ کو یقین نہیں آئیگا۔ لیکن اثر قبول کئے بغیر اس کی باتوں کے رنگین جال سے نکل جانا کچھ آسان کام نہیں۔ اس کی دلیل کا رنگ عجیب ہوتا ہے۔ "بے تکلفی، بے تکلفی اور سراسر بے تکلفی" اس کی گفتگو کی تین خصوصیات ہیں۔ بظاہر وہ آپ کی شخصیت کی کسی خامی کے بارے میں بات کریگا۔ لیکن بات کی تہ میں آپ کی شخصیت کی کسی انوکھی خوبی کیطرف اشارہ ہوگا۔ اور اس رنگین اشارہ کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ اس خوبی کے انوکھے پن اور منفرد نقطہ نگاہ کی شگفتگی کی وجہ سے آپ حیران کھڑے رہ جائیں گے۔ وہ نیا گُن نہ جانے کہاں سے چپکے چپکے آپ کی شخصیت میں ابھر آئے گا۔ کچھ دیر کے بعد آپ کو اپنے اندر اتنے نئے گُن محسوس ہونے لگیں گے۔ کہ آپ اپنے کردار کے انوکھے پن پر ششدر رہ جائیں گے۔

آپ یہ دیکھ کر متعجب ہوں گے۔ کہ آپ کوئی عجیب ترین شخصیت ہیں۔ چنانچہ آپ کے اندر ایک نیا کردار پیدا ہو جائیگا۔ جب یہ نیا کردار آپ کے معمولات پر چھا جائیگا۔ تو مفتی دفعتاً آپ کی کمزوریاں دکھانے لگیگا۔ آپ کی ہر بات کا تجزیہ کریگا۔ اور آپ کی شخصیت کے کھوکھلے پہلوؤں کو اس شدت سے ریزہ ریزہ کر دیگا۔ کہ نئی شخصیت استوار ہونا تو کجا آپ کی پہلی شخصیت بھی کچی دیوار کی طرح بیٹھتی ہوئی محسوس ہوگی۔ اور آپ کے اندر ایک بے پناہ اور لامحدود خلا پیدا ہو جائے گا۔ آپ اس امٹ خلا کو تجسس سے پُر کرنے کی کوشش کرینگے

www.taemeernews.com

مگر اس سے اُلجھنوں میں اضافہ ہو جائیگا۔ آپ چاہیں گے کہ اس کی پھینکی ہوئی کمند کو اتار پھینکیں۔ اسکی باتوں کو بے وقعت بنا دینے کی کوشش کریں۔ جی چاہے گا۔ کہ آپ اس سے کہیں دُور بھاگ جائیں۔ مگر آپ بے حس ہو چکے ہونگے آپ اس کی باتوں کو نہ سننے کی کوشش کریں گے۔ ان کا مذاق اڑانا چاہیں گے۔ مگر اس کی باتیں زبردستی آپ کے اندر قیام کر چکی ہونگی۔ آپ پر چھا چکی ہونگی۔ آپ بے حد مظلوم اور مجبور ہو جائیں گے۔ لیکن آپ کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہوگی۔ کہ اس کا یہ نیا رُخ آپ کو اور بھی متاثر کر دیگا۔ آپ کے دل میں اس کے لئے ایک خاص جگہ پیدا ہو جائیگی۔ اور آپ پھر اس کی طرف بھاگنا چاہیں گے۔ آپ کا جی چاہے گا۔ کہ آپ پر یہ ظلم ہوتا رہے۔ اور بھی۔ اور بھی۔

ممتاز مفتی ایک حالتیں بدلنے والا کیڑا ہے۔ میں گرگٹ کا لفظ جان بوجھ کر استعمال نہیں کرنا چاہتا۔ پہلے پہل تو وہ آپ کو محض ایک کویا سا نظر آتا ہے۔ پھر آپ محسوس کرتے ہیں۔ کہ وہ کیڑے کی طرح رینگ رہا ہے اور آنکھ کے جھپاکے میں آپ دیکھتے ہیں۔ کہ وہ ایک پھن کاڑھا ہوا سنپولیا بن کر آپ کے گرد منڈلا رہا ہے۔ اپنی عجیب کیفیتوں کی وجہ سے اس کے بارے میں لوگوں کے خیالات بہت مختلف اور دلچسپ ہیں۔

آپ مفتی سے اس کے اپنے بارے میں دریافت کریں۔ تو وہ کندھے سکوڑ کر کہیگا۔ "ات ؛ میں ؟ یعنی — میرا مطلب ہے۔ آپ میرے بارے میں پریشان کیوں ہوتے ہیں — ؟" لیکن اگر آپ اس کی ڈائری دیکھیں۔ تو آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ وہ اپنے بارے میں واقعی پریشان ہوتا رہا ہے۔ اس کی ڈائری کا ایک ورق ملاحظہ ہو۔

ملتان :-

"میں"

"سندباد جہازی کی طرح میرے کندھوں پر بچپن کا بڈھا سوار ہے۔ اور میں محسوس کرتا ہوں۔ کہ لوگ اس بھید سے واقف ہو چکے ہوں گے۔ اور مجھ پر ہنستے ہیں۔ مدت تک میں کوشاں رہا۔ کہ لوگ مجھے ایک سنجیدہ آدمی سمجھیں۔ اور مناسب اہمیت دیں۔ لیکن اس مسلسل کوشش کا صرف یہی نتیجہ ہوا۔ کہ میرے ماتھے پر ایک تیوری سی اُبھر آئی۔ اور اب میں اسے مٹانے کی ناکام کوشش میں لگا رہتا ہوں۔

میری طبیعت بے ہنگم، بے لگام اور بے صبر ہے۔ اس میں روانی نہیں نظم نہیں، ضبط نہیں۔ میری طبیعت میں بنیادی طور پر جو جذبہ کارفرما ہے۔ وہ جھجک اور کمتری ہے۔ مجھ میں باقاعدہ چلنے کی ہمت نہیں۔ ہاں کبھی کبھی بک کر بے تحاشا دوڑ پڑتا ہوں۔

میری شخصیت پر عورت کا عنصر وضاحت کے ساتھ غالب ہے۔

اگر میرا ذہن ایک پکی سڑک ہے تو دل ایک اُلجھی ہوئی پگڈنڈی، دونوں میں کوئی مناسبت نہیں جس کی وجہ سے میری طبیعت میں توازن نہیں۔ ربط نہیں سکون نہیں۔ ہر گھڑی ایک کشمکش سی رہتی ہے۔

میں بے حد ڈرپوک ہوں اور بسا اوقات اس خوف سے کہ میرا پول نہ کھل جائے۔ احمقانہ دلیری کے کام کر دکھاتا ہوں۔ میں خدا سے ڈرتا ہوں۔ اور اسی لئے اس کی شان میں گستاخی کرنے سے مجھے تسکین ملتی ہے۔ دل ہی دل

www.taemeernews.com

دنیا سے انتہائی خائف ہوں۔ اور اس بات پر مجھے اپنے اوپر بڑا غصہ آتا ہے۔ چنانچہ میں قطعی بے پرواہ ہوں کہ دنیاداری کو اختیار کرنا ایک عظیم گناہ سمجھتا ہوں۔ بلندیوں سے اس قدر ڈرتا ہوں کہ اگر مجھے کسی اونچی چٹان پر بٹھا دیا جائے۔ تو میں اس ڈر سے بچنے کے لئے کہ گر نہ پڑوں۔ اپنے آپ کو نیچے گرا دوں گا۔ عورت سے ڈرتا ہوں، اور اس کی طرف کھچا جاتا ہوں عشق ہو جائے، تو محبوب کو ملنے کی بجائے میری خواہش ہوتی ہے۔ کہ اپنے آپ کو فنا کر دوں۔ میری محبت کی گاڑی شک اور کمتری کے پہیوں پر چلتی ہے۔ مجرب کے نقاب کا ہر تار مجھے ابھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مجھے کنواری لڑکیوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کسی شبار کی ایک مستغنی نظر پر دوشیزگی، نوخیزی، معصومیت اور الھڑپن تج دینے کو تیار ہوں۔ مجھے بدمعاش عورت سے عشق ہے۔

میرا ذہن قومی، مذہبی، خاندانی اور رسمی تعصبات سے خالی ہے۔ میں عزت اور خودداری کے جذبات سے قطعی کورا ہوں۔"

ممتاز مفتی

اگرچہ آج کا ممتاز مفتی کل کے ممتاز مفتی سے مختلف ہے۔ لیکن بنیادی طور پر بالکل وہی ہے۔ بچپن میں وہ سوتیلی ماؤں کے زیر پرورش رہا۔ چنانچہ اس نے عمر کا پہلا حصہ اس غصے کے خلاف جہاد کرنے میں گذارا جو اس میں کثرت ازدواج کے خلاف پیدا ہو گیا تھا۔ اس ماحول میں بچپن گذارنے کی وجہ سے اس کی طبیعت میں ڈر اور غصہ پیدا ہو گیا تھا۔ اور ان دونوں جذبوں پر اس کی شخصیت کی بنیاد رکھی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ وہ بیحد شرمیلا اور چپ چاپ ہو گیا۔ جس سے اس کی کالج کی زندگی برباد ہوئی۔ یہ زمانہ اس نے الیعدی ماتمی اور پیڈ بہادر کی خاموش فلمیں دیکھ کر، سینے سگریٹ پی کر، مونگ پھلی کھا کر اور کالج سے بھاگ کر گذارا۔ زندگی کا دوسرا حصہ اس نے ایک عورت کے اثر سے آزاد ہونے کی ناکام کوشش میں کاٹا۔ اور زندگی کی تیسری منزل افلاس کے خلاف لڑنے میں بسر کی۔ کیونکہ اسے بیتالیس روپے کی حقیر رقم میں آٹھ پیٹ پالنے پڑتے تھے۔ اور اب وہ زندگی میں پہلی بار مطمئن ہے۔

ممتاز مفتی مجلسی آدمی نہیں۔ وہ کسی کو ملنے سے بہت ہچکچاتا ہے۔ اسے گھر بیٹھے رہنے کا بیحد شوق ہے۔ اگر آپ اسے کچھ کتابیں، چائے، پان، کچھ کھانے کو، کبھی کبھار کوئی آدمی بات کرنے کو یا ایک ریڈیو سیٹ دے کر ایک جگہ مقید کر دیں۔ تو اسے بہت دیر تک پتہ ہی نہ چلیگا۔ کہ وہ مقید ہے۔ اس کے برعکس اگر اسے کسی ایسی جگہ رکھیں۔ جہاں بہت سے آدمی اور ہنگامے ہوں۔ تو وہ گھبرا کر کہیں بھاگ جائیگا۔

گھر کا شوقین ہونے کے باوجود وہ فرمانبردار خاوند اور گھریلو مرد نہیں۔

ممتاز مفتی وقت کے احساس سے قطعی آزاد ہے۔ اس کا کلاک کبھی ٹھیک وقت نہیں دیتا۔ کہا جاتا ہے کہ مشینری ہمیشہ اپنے چلانے والے کی ذہنیت کے مطابق خصوصیات پیدا کر لیتی ہے۔ بہت ہوا۔ کسی نے اس کے کلاک میں کوک بھر دی۔ تو عموماً صبح دس بجے سوئیاں تین پر ہونگی۔ اور گھنٹہ چھ بجائیگا۔ اگر کبھی ایسا ہو جائے کہ صبح دس بجے سوئیاں ٹھیک دس پر ہی ہوں۔ تو آپ یقین رکھیں۔ کہ گھڑی پر رات کے دس بج رہے ہیں صبح کے نہیں۔

www.taemeernews.com

مقولہ ہے۔ کہ شہر اس مقام کو کہتے ہیں۔ جہاں لوگوں کو روپے کی قیمت کا اندازہ نہ رہے۔ اس لحاظ سے ممتاز مفتی مستقل طور پر شہر میں رہتا ہے۔ اسے فضول خرچی میں بڑی تسکین ملتی ہے۔ خصوصاً جب اس کا ہاتھ تنگ ہو۔ تو تسکین کی خواہش اور بھی تیز ہو جاتی ہے۔ زندگی بھر قرض ہی اس کی پونجی رہی ہے لیکن تعجب ہے وہ کہیں نہ کہیں سے ادھار کا انتظام کر ہی لیتا ہے۔ آپ نے کیسا ہی عزم کیا ہو۔ کہ آپ اسے کچھ نہ دیں گے مگر وہ آپ سے مانگے گا ہی کچھ ایسے انداز میں کہ آپ اپنے سارے ارادوں کو یکسر بھول جائیں گے۔ خوش قسمتی سے اس میں خودداری نام کو بھی نہیں۔ اور اسی سے وہ اپنی سدا بہار غربت اور بدنامی کے قبیح نتائج سے بچا ہوا ہے۔

وہ خودداری کو ایک بہت بڑی خوبی سمجھتا ہے۔ مگر اس کا خیال ہے۔ کہ خودداری کا نہ ہونا بھی ایک بہت بڑی خوبی ہے۔

دفتر جاتے ہوئے اسے اکثر خیال آتا ہے۔ کہ چپڑاسیوں کو سلام کرنے کی عادت اچھی نہیں۔ اسے اپنی اس کمزوری پر غصہ آنے لگتا ہے۔ اور وہ فیصلہ کر لیتا ہے۔ کہ آج چپڑاسیوں کو سلام نہیں کریگا۔ ہاں ان کے سلام کے جواب میں صرف سر ہلا دیگا۔ جیسا کہ ایک خوددار آدمی کو کرنا چاہیئے۔ لیکن موقعہ آنے پر اس کا ہاتھ خود بخود اٹھ جائیگا۔ "آداب عرض!"

اگر اس کا افسر اس سے کہے۔ "دیکھئے صاحب! آپ نہیں سمجھتے" تو سوچے سمجھے بغیر اس کے منہ سے نکل جائیگا۔ "جی ہاں۔ جی ہاں"۔ پھر ملاقات کے بعد دفعتاً اسے احساس ہوگا۔ کہ چاہے وہ افسر ہے۔ لیکن اسے یہ نہیں کہنا چاہیئے تھا۔ "میں نہیں سمجھتا۔ میں؟"

وہ اپنی حماقتوں کا اعلانیہ اظہار کرنے سے ذرا نہیں گھبراتا۔ بلکہ اسے اپنی کئی ایک حماقتوں پر ناز ہے وہ دوستی محبت ایثار اور قربانی کو حماقتیں سمجھتا ہے۔ اور عام آدمی کو عزت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کے خیال میں عوام ذہین آدمیوں سے بہتر مخلوق ہیں۔ اس کے نقطۂ نظر کے مطابق ذہنی قابلیت حاصل ہونے سے انسانیت کی جبلی کم ہو جاتی ہے۔ اس لئے وہ علم کو انحراف سمجھتا ہے۔ اور جذبہ کو صراطِ مستقیم۔ اس کی رائے میں زندگی کی تمام تر دلچسپی، رنگینی اور خوشی عوام کے دم قدم کا نتیجہ ہے۔

ممتاز مفتی حتی الوسع جھوٹ نہیں بولتا۔ مگر یہ خوبی عمدہ اخلاق کا نتیجہ نہیں۔ کیونکہ اس کے نزدیک جھوٹ یا سچ بولنے کا عمدہ اخلاق سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کا خیال ہے۔ کہ جھوٹ بولنے کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب لوگوں کا ڈر غالب ہو۔ یا یہ خوف ہو کہ مخاطب میں سچائی برداشت کرنے کی ہمت نہیں۔ چنانچہ ممتاز مفتی محض آپ کے جذبات اور احساسات کے احترام اور اخلاق کی خاطر جھوٹ بولنا گوارا کریگا اور جھوٹ بھی کہ آپ کی ذات پر بہت بڑا احسان کریگا۔ چونکہ ابتداءً وہ لوگوں سے از حد خائف نہ تھا۔ اس لئے اپنی جان بچانے کے لئے جھوٹ بولنے سے نہیں ہچکچاتا تھا۔ مگر اب وہ جان گیا ہے۔ کہ جھٹ سے سچ بول دینا لوگوں کو

www.taemeernews.com

دھوکہ دینے کا کامیاب ترین ذریعہ ہے۔ اس میں رازداری کی اہلیت بیشک ہے۔ مگر وہ اس اہلیت کو استعمال کرنا پسند نہیں کرتا۔ آپ اُسے کسی بات کے راز رکھنے کی تاکید کر دیں۔ وہ بات اس کے سر پر سوار ہو جائیگی دل پر بوجھ سا بن جائیگی حتیٰ کہ وہ راز فاش کر دینے پر مجبور ہو جائیگا۔ تاکہ اسے سکون مل سکے۔ اگر یہ بات آپ کے ناموس کے متعلق ہے۔ اور اس کا راز میں رہنا ضروری ہے۔ تو وہ کسی کو اعلانیہ تو نہیں بتائیگا۔ مگر چھپا کر بھی نہیں رکھ سکیگا۔ اس لئے وہ اسے یکسر بھول جائیگا۔ تاکہ اسے چھپانے کی زحمت سے چھوٹ جائے وہ ذہنی الجھنوں سے بہت ڈرتا ہے۔ اگر اسے بتایا جائے۔ کہ وہ نوکری سے برخاست کر دیا گیا ہے۔ تو وہ ایک لمحے کیلئے پریشان ہو جائیگا۔ مگر فوراً ہی اپنے آپ کو اس مشکل کے لئے تیار کر لیگا۔ اور اس طرح اپنی زندگی سے الجھن اور غم کو مٹا دیگا۔ تھوڑے ہی وقفے میں وہ اس تبدیلی کے لئے اس قدر تیار ہو چکا ہوگا۔ کہ اگر دوبارہ اطلاع پہنچے کہ وہ بحال کر دیا گیا ہے۔ تو وہ پریشان ہو جائیگا۔ اور اسے اپنی نئی سکیموں کے ضائع چلے جانے کا بہت دکھ ہوگا۔

اس کی طبیعت کی افتاد ہی کچھ ایسی ہے۔ کہ وہ بڑے سے بڑے حادثے پر بھی سناٹے میں نہیں آتا۔ عزیز ترین دوست کی موت پر بھی اسے دھکا نہیں پہنچتا۔ ایسی خبر سن کر وہ خالی الذہن ہو جائیگا۔ اور اس کے برتاؤ سے مترشح ہوگا۔ کہ وہ غمزدہ نہیں۔ بلکہ کھویا کھویا سا ہے۔ پھر دھیرے دھیرے غم اس کے احساسات میں سرایت کر جائیگا قطرہ قطرہ ہو کر۔ اچانک اور فوری خوشی پر بھی اس کا طبعی توازن قائم رہتا ہے۔ کیونکہ اس نے اپنے گرد تسکین و اطمینان کا ایک خول سا بنا رکھا ہے۔

وہ زیادہ بلند امیدیں اور توقعات استوار نہیں کرتا۔ تاکہ پوری نہ ہونے پر اسے دکھ نہ پہنچے۔ کوئی مسرور کن توقع ہو تو وہ اسے بھلا دیگا۔ بھول نہ سکے تو زیادہ اہمیت نہیں دیگا۔ اور دل ہی دل میں امید رکھے چلا جائیگا۔ کہ وہ توقع پوری ہو کر اسے ایک اچانک اور خوشگوار تعجب بخشے۔ اور اگر وہ پوری نہ ہو تو مایوسی کے صدمے سے اپنے آپ کو محفوظ کر لے۔

اسے سپنے دیکھنے کی عادت ہے۔ عام طور پر جب اسے سائیکل پر کہیں دور جانا ہو۔ تو رستے کی تکان سے بچنے کے لئے کسی سپنے میں کھو جائیگا۔ جوانی کے زمانے میں وہ کرائیڈن سے کراچی تک ہوائی تیز رفتاری کا ریکارڈ قائم کیا کرتا تھا۔ جب وہ ہوا بازی سے سیر ہو گیا۔ تو دنیا کا مشہور کرکٹ باؤلر بن گیا۔ اور بسا اوقات ایم سی سی کی ساری کی ساری ٹیم تینتیس رنز میں آؤٹ کر دی۔ یہ گیند پھینکنے کا شغل بھی کچھ زیادہ دیر تک دلچسپ نہ رہ سکا۔ اس لئے اس نے دیپک راگ کی صحیح بندش کھوج نکالی۔ وہ محفل میں اس راگ کا الاپ لیا کرتا۔ دیپک کی جلتی ہوئی تانوں سے اہل محفل کے دل سلگ سلگ جاتے۔ بتیاں جل جل اٹھتیں اور لوگ حیرانی سے بت کے بت بنے تکتے رہتے۔ آج کل اس کے خواب بین الاقوامیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس نے ایسی عجیب شعاعیں ایجاد کر رکھی ہیں جس کی مدد سے وہ بادلوں کو پھٹنے سے روک سکتا ہے۔ اور ان شعاعوں کی

www.taemeernews.com

علاوہ ازیں وہ آج کل دنیا کے امن کو محفوظ کر رہا ہے۔ مگر ان میدانوں میں اس نے کبھی روپے اور حکومت کے حصول کا پروگرام نہیں بنایا۔ اگرچہ اسے یہ بھی پسند ہے۔ کہ خرچ کرنے کے لئے اسے روپیہ مل جائے لیکن اگر اس کے پاس بہت سارا روپیہ آ جاتے۔ تو اس کی زندگی کا آدھا لطف ختم ہو جائیگا۔ آج کل اس کی صرف یہی آرزو ہے کہ اس کے پاس ایک ریڈیو سیٹ ہو۔ کار یا بنگلے کا مالک ہونے کی خواہش اس میں کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ اپنے آپ کو بڑا آدمی یا حاکم تصور کرنا اسے قطعی پسند نہیں۔ چند ایک امیرانہ چیزیں حاصل ہو جائیں۔ تو اسے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ بشرطیکہ اس کی موجودہ حالت جوں کی توں رہے۔ اس کی موجودہ زندگی بے پروائی اور مفلسی کا امتزاج ہے۔ عمر بھر اس کے سامان میں ایک چٹائی ایک بستر ایک ٹرنک اور دو ایک کرسیاں شامل رہیں۔ اس کے گھر اور کمرہ کی سب سے بڑی خصوصیت بے ترتیبی ہے۔

وہ صبح سویرے ہی اٹھ بیٹھتا ہے۔ اور اس جگہ سے اٹھ کر جہاں سویا ہوا تھا کسی اور جگہ پر جا کر پھر سو جاتا ہے۔ اور پھر چائے دانی کی کھنک سنے بغیر آنکھیں نہیں کھولتا۔ کیونکہ چائے پینے کی اسے لت ہے۔ حلق میں پہلا پیالہ انڈیلنے کے بعد اس کے اردگرد کی دنیا بیدار ہونے لگتی ہے۔ تا آنکہ چیزوں کی ماہیت کا تناسب پوری طرح قائم ہو جاتا ہے۔ وہ دن میں دو بار چائے کو پانی کی طرح ٹھنڈا کر کے پیتا ہے۔

مسٹر انگ چائے پی کر اسے بار بار پیشاب کرنے کی عادت پیدا ہو گئی ہے۔ اس شکایت سے رہ جانے کو ایک دفعہ اس نے ایک مشہور و معروف ہومیوپیتھک ڈاکٹر سے ملنے کے لئے وقت مقرر کیا۔ نوکریں بیان کرتے ہوئے اس نے ڈاکٹر کو بتایا۔ کہ بیماری اس قدر پرانی ہے کہ مجھے اس کی ابتدا کی ماہیت سے متعلق کچھ یاد نہیں رہا۔ اور اب وہ اس کا اس قدر عادی ہو گیا ہے۔ کہ اپنے آپ کو اس کے بغیر تصور ہی نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر جو بیک وقت معالج، فلسفی اور درویش تھا۔ یہ سن کر خوب ہنسا۔ اور کہنے لگا۔ کہ پھر علاج کی ضرورت ہی کیا ہے۔ مفتی ڈاکٹر کی بات سے اس قدر متاثر اور محظوظ ہوا۔ کہ دوائی لئے بغیر ہی لوٹ آیا۔ اس دن کے بعد اس نے کبھی بھول کر بھی علاج کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

اس کی زندگی کا زیادہ وقت چیزیں ڈھونڈنے میں گذرتا ہے۔ مثلاً پنسل بنانے کے لئے وہ چاقو کی تلاش کریگا اور اس تلاش کے دوران میں قطعی بھول جائیگا۔ کہ وہ کیا تلاش کر رہا ہے۔ بفرض محال چاقو اس کے ہاتھ آ جائے۔ تو اس کی پنسل گم ہو جائیگی۔ اور وہ اس پنسل کو ڈھونڈنے میں کھو جائیگا۔ جوان جانے میں اس نے کان پر اٹکا لی تھی۔ گھر میں اسے ننگے پاؤں ان دھلے منہ اور بالوں کے گچھوں کے گچھے بکھرائے پریشان پھرتے ہوئے دیکھ کر نہ جانے کیوں آپ کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو جائیگا۔ ممکن ہے کہ آپ اس سے بغلگیر ہو کر رو دیں۔ کام کرنے بیٹھتا ہے۔ تو اس کا سارا وقت ادھر ادھر کی عملی ضروریات کو پورا کرنے میں کٹتا ہے۔ اور کام ایک ضمنی چیز ہو کر رہ جاتا ہے۔ چند ہی سطریں لکھ کر وہ پانی کا ایک گلاس پیتا ہے۔ اور پھر پان کھاتا ہے۔ پھر پیشاب کرتا ہے اور پھر پانی پیتا ہے۔ اس طرح وہ ایک گھنٹے میں بیس سطریں لکھتا ہے

www.taemeernews.com

چار گلاس پانی پیتا ہے۔ دو پان چباتا ہے۔ دو دفعہ پیشاب کرتا ہے۔ اکثر دو ایک سگریٹ بھی پی لے۔ تو مضائقہ نہیں سمجھتا۔ اس کے باوجود اگر اس کی بیوی اس چارپائی پر کٹے ہوئے شخص سے جو ہر وقت اس سے پانی، پان، سگریٹ ایسی ہی چیزیں مانگتا رہتا ہے۔ تعلق قائم رکھنا چاہتی ہے۔ تو تعجب کا مقام ہے۔ مگر اس کے علاوہ اسکی بیوی کو اس سے کوئی شکایت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ممتاز مفتی ایک اچھا خاوند ہے۔ لیکن ٹھہرئیے یہ بات ذرا وضاحت طلب ہے۔

ممتاز مفتی ایک ایسا بچہ ہے۔ جو یہ پسند نہیں کرتا۔ کہ اسے کوئی بچہ سمجھے۔ دل ہی دل میں وہ چاہتا ہے۔ کہ اس کی بیوی اس کی دیکھ بھال کرے۔ اور اسے مناسب وقت پر مناسب کام کرنے پر مائل کرے۔ لیکن یہ سب کچھ اس انداز سے ہو۔ کہ اسے معلوم نہ ہو۔ کہ اس کی دیکھ بھال کی جا رہی ہے اگر اسے شک پڑ جائے۔ کہ اس سے ایک بچے کا سا سلوک کیا جا رہا ہے۔ تو اس میں سویا ہوا مرد بیدار ہو جائیگا۔ اور اپنی تحقیر کے خلاف جہاد کرے گا۔ کیونکہ کسی دوسرے کی مرضی پر چلنا اسے قطعاً گوارا نہیں۔ اس کے برعکس اگر اس کی بیوی اس سے مردوں کا سا سلوک کرے۔ اور بےڈر کر رہے۔ تو وہ اسے جاہل نکمی اور بےعقل سمجھنے لگیگا۔ اسے گھریلو جھگڑوں سے اس قدر نفرت ہے۔ کہ بسا اوقات وہ جھگڑے کے خطرے کو روکنے کے لئے اپنی بیوی سے جھگڑا چھیڑ دیتا ہے۔

ممتاز مفتی نے زندگی میں دو بار محبت کی۔ پہلی دفعہ جب وہ محض ایک نکما لڑکا تھا۔ اور اسے اپنا کوئی بہتر مصرف سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اس کے گرد ایک بیگانہ اور بےپرواہ دنیا بکھری پڑی تھی۔ ایک ایسی دنیا جس میں نہ تو اس کی کوئی حیثیت تھی نہ وقعت۔ اپنی اہمیت ثابت کرنے کے لئے اس نے یہ روگ لگا لیا۔ اس کی پہلی محبت کی نوعیت ہی کچھ ایسی تھی۔ کہ وہ تعمیری نہ ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اس کا انداز محبت بذات خود تخریبی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ عمر بھر کے لئے اس کے ماتھے پہ بدنامی کا ٹیکہ لگ گیا۔ اس کے ذہن میں ایک دائمی کشمکش کی داغ بیل پڑ گئی۔ محبت کے لئے وہ اپنے اقربا کے ساتھ ساتھ اپنے آپ سے بھی برسرِ پیکار رہا۔ وہ اپنی محبوبہ سے بیک وقت جنونانہ محبت اور نفرت محسوس کرتا تھا۔ اس کی دوسری محبت درحقیقت اپنی پہلی محبت سے چھٹکارا پانے کی ایک شدید کوشش تھی۔ اس کوشش میں وہ بہت حد تک کامیاب ہو گیا۔ لیکن حالات سازگار نہ ہوتے۔ اور وہ اپنے آپ کو آزاد کرانے کی کوئی صورت نہ پاکر اتفاقاً پھر سے اسی پہلے جھمیلے میں جا پھنسا۔ تعجب کی بات یہ نہیں۔ کہ وہ شدید ذہنی کرب اور رسوائی میں کیسے زندگی گذار سکا۔ بلکہ یہ کہ وہ ان مشکلات کے باوجود جیتا رہا — اور آج ان جھمیلوں سے ذہنی طور پر آزاد ہو چکا ہے۔

اس کی روزانہ زندگی میں سستی کا جذبہ بے حد کارفرما ہے۔ وہ اپنی کاہلی اور ناکارہ پن کو جانتا اور اعلانیہ تسلیم بھی کرتا ہے۔ وہ سارا دن کچھ نہ کچھ کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ مگر شام تک مجموعی طور پر کچھ بھی نہیں کر پاتا۔ جب ضروری کام کرنا ہو۔ تو اس وقت اس کا دل ایک ایکٹ کے ڈرامے پڑھنے کے لئے مچل جائیگا۔ عین اس وقت جب اسے نفسیاتی مقالہ لکھنا ہو۔ تو راگ کی کتاب لے بیٹھے گا۔ جب کہانی لکھنے کی اشد ضرورت درپیش

ہو۔ تو نفسیات پڑھنے لگیگا۔ بچپن عمر ہی سے اسے راگ سے عشق ہے۔ اس شوق کو پورا کرنے کے لئے وہ ایک مقامی میوزک کالج میں داخل بھی ہوا۔ لیکن انہی دنوں کالج میں ایک مدراسی آنے جانے لگ گیا۔ جو راگ کا دیوانہ تھا۔ اتفاقاً وہ مدراسی ہندوستانی نہیں سمجھتا تھا۔ اور راگ ماسٹر انگریزی سے بے بہرہ تھا۔ چنانچہ ان دونوں کی ترجمانی کرنے کا فرض ممتاز مفتی کو ادا کرنا پڑا۔ وہ راگ کا دیوانہ؛ گانے کی دھن راگ ماسٹر سے سیکھ لیتا۔ اور پھر ممتاز مفتی سے گانے کے بول انگریزی ترجمہ کرا کے عجیب مضحکہ خیز انداز میں گانا شروع کردیتا۔ بلیسے سٹ ڈاؤن اِن دا ٹرین کو انٹ لی۔ آر آئی دل۔ گویا اے سلیپ۔ بلیتے — اس دلچسپ راگ شکشا میں مفتی کو اس قدر مزا آنے لگا کہ خود کچھ سیکھنے کی بات پسِ پشت پڑ گئی۔ بعدہٗ اس نے راگ کا غائر مطالعہ بھی کیا۔ اور سروں کے نوعیات، ٹمپرڈ سکیل — آروہی امروہی سبھی معلومات حاصل کر لیں۔ اور اب وہ راگ کو پورے طور پر سمجھتا ہے۔ آپ صرف اسے اتنا بتادیں۔ کہ ؟ گایا جا رہا ہے۔ پھر وہ فوراً اسے پہچان لیگا۔ اور معاً اس کی وکرچال اور جذبات پیدا کرنے والے آتار چڑھاؤ سے محظوظ ہونے لگیگا۔ نہ سمجھے تو بھی وہ راگ سے بےحد متاثر ہوتا ہے۔ کچھ دن راگ سننے کے بعد اس کے دل میں شدید جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ وہ کچھ لکھے یا گائے۔ راگ سے اسے تسکین ملتی ہے۔ ایسی تسکین جو اس میں ایک تعمیری اضطراب پیدا کرتی ہے۔

ممتاز مفتی نے اپنے گرد وپیش کی ہر ایک چیز میں ایک عجیب سی دو رُخی کو شدت سے محسوس کیا۔ وہ اس بات کو جان کر حیران ہوا۔ کہ آدمی کے دل میں بیک وقت مختلف اور متضاد خواہشات اور رجحانات موجود ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ فطرت کی عجیب ترین چیز سے بھی عجیب تر ہے۔ اس نے محسوس کیا۔ کہ اردو ادب اس حیران کن صفت رنگی سے قطعاً ناواقف ہے۔ اردو ادب نے نفسِ لاشعور کی آرزوؤں کو ابھی نہیں پہچانا۔ محبت کو محض محبت کے سوا کچھ نہیں سمجھا۔ اور یہ سب کچھ دیکھ کر اس کے دل میں لکھنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ ممتاز مفتی زیادہ تر داستادسکی، لونگ ایڈلر، برٹ رینڈ رسل اور فرائڈ کی تحریروں سے متاثر ہوا۔ کہانیوں میں نفسِ لاشعور کی ڈھکی چھپی باتوں کا اظہار کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس لئے ممتاز مفتی کو آج تک اپنی تحریروں کے متعلق یہ یقین پیدا نہیں ہوا۔ کہ وہ اِن اَن کہی باتوں کا اظہار کامیابی سے کر سکا ہے یا نہیں پھر بھی اسے تسکین ہے کہ وہ قاری کی توجہ کامیابی سے اس طرف مبذول کر سکا ہے:

ہر قسم کی فلمی تحریر کہانی مکالمے گیت وسنیریو کے لئے مشہور فلم نگاروں وبلند پایہ ادیبوں — کے ادارے

سکرین رائٹر سنڈیکیٹ

۳۲ کیونز روڈ لاہور ــــــــــ کا تعاون حاصل کیجیے

www.taemeernews.com

جائزے

امریکہ کی تجارتی تجویزیں اور ہندوستان

بین الاقوامی تجارت کو فروغ دینے کے لئے امریکہ نے دنیا کے سامنے جو تجارتی تجویزیں پیش کی ہیں اُن کی آڑ میں دراصل یہ خواہش کام کر رہی ہے کہ کمزور ملکوں کی معاشی پستی سے فائدہ اُٹھا کر اُن کو امریکی مال اور اشیاء سے بھر دیا جائے ۔ یہ حقیقت اب پورے طور پر منظر عام پر آچکی ہے ۔ ہندوستان میں امریکی تجویزوں سے جو ردِ عمل ظاہر ہوا ہے ۔ وہ اسی حقیقت کے احساس پر مبنی ہے ۔ وہ ردِ عمل تجارت اور مصنوعات کی ذیلی کمیٹی کی مدلل اور مفصل رپورٹ کی شکل اختیار کر چکا ہے ۔ اس مسئلے پر ہندوستان کے تمام معاشیین بالکل متفق اور یک رائے ہیں اور سب کا یہ مشترکہ فیصلہ ہے کہ امریکی تجویزیں بعینہٖ نہیں قبول کی جا سکتیں ۔ ان میں کافی ردوبدل کی ضرورت ہے ۔ ہندوستان اپنی مخصوص معاشی صورت حال کے پیش نظر اس ردوبدل سے کسی حالت میں بھی دستبردار نہیں ہو سکتا ۔

ہم یہ ضرور محسوس کرتے ہیں کہ بین الاقوامی تجارت کو جلد از جلد فروغ دینے کی ضرورت ہے ۔ اور جنگ سے پہلے بین الاقوامی تجارت پر جو پابندیاں عائد تھیں ۔ اُن کو دوبارہ اُسی شکل میں نافذ کرنا غلط اور خطرناک ہے ۔ ہندوستان حتی المقدور اُن پابندیوں سے باز رہنے کی کوشش کرے گا ۔ مختلف ملکوں کے درمیان اشیا اور مال کی آزادانہ آمدورفت ایک خاص لحاظ سے ہندوستان کے لئے مفید ہے ورنہ ہندوستان اپنی معاشی توسیع و ترقی کے پروگرام پر عمل پیرا نہیں ہو سکے گا ۔ لیکن اس حقیقت کو نظر انداز کر دینا سخت غلطی ہے کہ اس وقت تمام سرمایہ دار ملکوں کی معاشی پوزیشن اور حیثیت یکساں اور ہموار نہیں ہے اور ان کے درمیان صنعتی قوت پیدائش کا زبردست فرق پایا جاتا ہے ۔ ایسی صورت حال میں امریکی تجویزوں سے صرف ایک ہی نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے ۔ اور وہ یہ کہ امریکہ اور برطانیہ جیسے ترقی یافتہ صنعتی ملکوں کے سامنے کمزور اور پچھڑے ہوئے ملکوں کی قوت پیدائش ہتھیار ڈال دے ۔ امریکی اشیاء صرف ہندوستان اور نوآبادیات کے بازاروں میں بھر جائیں اور ہماری صنعتی ترقی کا گلا گھونٹ دیا جائے ۔ اگر امریکی تجویزوں کے بانیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ بین الاقوامی

www.taemeernews.com

تجارت کو فروغ دے کر پچھڑے ہوئے ملکوں کو بھی ترقی کا راستہ دکھانا چاہتے ہیں تو پھر انہیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ پچھڑے ہوئے ملکوں کے لئے امریکی اور برطانوی اشیائے صرف (Consumer Goods) کی درآمد پر کوٹا بٹھانا اُن پر مقداری پابندیاں عائد کرنا اور محصولات کے ذریعے اُن کے سیلاب کو روکنا ضروری ہے۔ ذیلی کمیٹی نے امریکی تجارتی تجویزوں پر جو فیصلہ دیا ہے اُس میں اسی چیز پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ یہ محصولات، تعدادی پابندیاں اور کوٹے محض ضرورت کے مطابق ہوں گے۔ اور عارضی تاکہ جب ہندوستان کی صنعتی قوت پیدائش بیرونی دنیا سے مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائے تو انہیں خیرباد کہہ دیا جائے۔

ان تجویزوں کی نوعیت اور مقاصد کا واضح طور پر اندازہ لگانے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے عالمگیر معاشی پس منظر پر بھی ہم ایک نظر ڈال لیں۔

۱۹۱۹ء سے پہلے دنیا میں کم و بیش آزاد تجارت کا رواج تھا؛ لیکن سرمایہ دارانہ نظام کا تجارتی چکر ۱۹۲۹ء کے بعد سے جس طرح گردش کرنے لگا۔ اُس سے آزاد تجارت کے تار و پود بکھر گئے۔ ساری دنیا میں معاشی بحران رونما ہوا۔ قوت خریداری کی عدم موجودگی میں مال کی پیدائش رکنے لگی۔ بیکاری عام ہو گئی جس نے قوت خریداری پر اور بھی کاری ضرب لگائی۔ اس کا اثر بین الاقوامی تجارت پر پڑنا لازمی تھا۔ تمام سامراجی ملکوں نے اپنے اپنے مقبوضات اور نوآبادیات کو صرف اپنے مال کے لئے مخصوص کر لیا۔ غیر ملکی مال پر محصولات عائد کئے گئے۔ کروڑگیری کی دیواریں کھڑی کر دی گئیں۔ غیر ملکی مال پر کوٹا بٹھا دیا گیا۔ برطانیہ اس سلسلے میں سب سے آگے آگے تھا۔ بین الاقوامی تجارت کے اس طرح تباہ و برباد ہو جانے کی وجہ سے سب سے زیادہ نقصان امریکہ کو پہنچا۔ امریکی قوت پیدائش تمام سرمایہ دار ملکوں میں سب سے اعلیٰ سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے آزاد مقابلہ اور آزاد تجارت کی صورت میں امریکہ تمام ملکوں کو معاشی لحاظ سے شکست دے سکتا ہے اور اُن کو اپنے مال سے بھر سکتا ہے۔ لیکن اب جب کہ ہر ملک نے غیر ملکی مال کے خلاف دیواریں حائل کر دی تھیں۔ امریکہ کو لازمی طور پر بہت نقصان برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔ اس صورت حال کو ختم کرنے کے لئے امریکہ نے الگ الگ ملکوں سے دو طرفہ تجارتی عہدنامے کرنے شروع کئے۔ اس طرح اُس نے یورپ کے ملکوں سے اور دنیا کے دوسرے ملکوں سے اپنے مال پر پابندیاں اور محصولات کو کم کرانے کی کوشش کی لیکن یہ طریقہ کچھ بہت کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ اسی عرصے میں اٹلی، جرمنی اور جاپان میں فاشی جماعتوں نے اپنی طاقت بہت مضبوط کر لی۔ اور ان ملکوں کی سیاسی باگ ڈور ہاتھ میں لے کر دنیا کو تیزی کے ساتھ جنگ اور تباہی کی طرف دھکیلنا شروع کیا۔ معاشی بحران کا نتیجہ جب پرولتاری انقلاب کی شکل میں ظاہر نہ ہوا تو پھر فاشی نظام کا قیام ایک لازمی امر تھا۔ فاشسٹ طاقتوں کے عروج نے آزاد

 www.taemeernews.com

تجارت کے امکانات اور بھی ختم کر دیئے۔ ستمبر ۱۹۳۹ء میں عالمگیر جنگ چھڑ گئی۔ اور عالمگیر معیشت نے ایک نئی منزل میں قدم رکھا۔ جنگ کے دوران میں امریکہ کی قوت پیدائش دوسرے ملکوں کے مقابلے میں، خاص کر برطانیہ کے مقابلے میں اور بھی زیادہ ہو گئی۔ امریکہ نے اپنی معاشی طاقت اور زبردست فوجی حیثیت سے فائدہ اٹھا کر برطانیہ سے یہ وعدے کرا لیے کہ جنگ کے بعد آزاد مقابلے اور آزاد تجارت کو جاری کرنے کے کام میں وہ پورا پورا تعاون کرے گا۔ ۱۲ر اگست ۱۹۴۱ء کا چرچل اور روزولٹ کا متحدہ اعلان اور ۲۳ر فروری کا برطانوی امریکی معاہدہ اس سلسلے کی دو اہم ترین کڑیاں ہیں۔ مؤخر الذکر معاہدے کی دفعہ سات میں صاف طور پر درج ہے کہ جنگ کے بعد بین الاقوامی تجارت میں کسی ملک کے ساتھ امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں پچھڑے ہوئے ملکوں میں امریکی مال کے سیلاب کو روکنے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔ تجارتی محصولات کو خیرباد کہہ دینے کے بھی وہی معنی نہیں نکلتے۔ امریکہ کی موجودہ تجویزیں دو طرفہ تجارتی عہد ناموں سے اس لحاظ سے مختلف ہیں کہ ان میں دو ملکوں کے درمیان نہیں بلکہ بہت سے ملکوں کے درمیان تجارتی پابندیوں کے اٹھانے کی اسکیم ہے۔ یہ ہے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی تجارتی تجویزوں کا پس منظر۔ اب ہم ہندوستان کے مخصوص نقطۂ نظر سے ان تجویزوں پر ایک نظر ڈالیں گے۔

ہندوستان کے لئے ضروری ہے کہ جب وہ اپنی تجارتی پالیسی کا تعین کرنے بیٹھے تو دو باتوں کا خیال رکھے۔ (۱) ہندوستان میں عنقریب معاشی تعمیر و توسیع کا پروگرام عمل میں آنے والا ہے اس لئے اس سے پیدا ہونے والی ضروریات کے مطابق ہی کسی تجارتی پالیسی کی تشکیل ہونی چاہیئے۔ (۲) ہندوستان کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ دوسرے ملکوں کے ساتھ اشتراک عمل کے ذریعے عالمگیر تجارت کو فروغ دینے اور بے روزگاری کا قلع قمع کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن ہندوستان اپنے مؤخر الذکر فرض سے اس وقت تک سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ جب تک پہلی شرط پوری نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں ہندوستان اپنی معاشی توسیع و ترقی کرنے کے بعد ہی عالمگیر تجارت اور عالمگیر روزگار کو فروغ دے سکتا ہے۔ لیکن کیا امریکی تجویزیں ہندوستان کی اس ضرورت کو تسلیم نہیں کرتیں اور آزاد تجارت کے بہانے اسے اپنا بازار بنانا چاہتی ہیں۔ ہندوستان چونکہ معاشی لحاظ سے امریکہ کا ہمسر نہیں ہے۔ اس لئے آزاد تجارت سے وہ گھاٹے میں رہے گا۔ در اصل یہ تجویزیں امریکہ اور برطانیہ جیسے ترقی یافتہ ملکوں کی ضرورت کو تسلیم کرتی ہیں اور انہیں کے لئے موزوں بھی ہیں۔ ہندوستان جیسے پچھڑے ہوئے ملک کے لئے نہیں جسے ابھی اپنی صنعتوں کے تحفظ کے لئے غیر ملکی مال کی درآمد پر پابندیاں عائد کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ یہ ضرور ہے کہ یہ پابندیاں ویسی نہیں ہوں گی۔ جیسی دو جنگ عالمگیر جنگوں سے پہلے تھیں۔ یہ پابندیاں صرف تعمیری مقاصد کے تحت اور وقتیہ

www.taemeernews.com

کے مطابق لگائی جائیں گی اور ضرورت کے ختم ہونے کے فوراً ہی بعد ہٹا بھی دی جائیں گی۔ پھر یہ پابندیاں صرف اشیائے صرف کی درآمد پر لگائی جائیں گی۔ جہاں تک اشیائے اصل (Capital Goods) یعنی مشینوں اور کلوں کا تعلق ہے۔ ہندوستان کو اُن کی سخت ضرورت ہے اور وہ امریکہ، برطانیہ اور دوسرے ملکوں سے ضرور درآمد کی جائیں گی۔

امریکی تجویزیں سراسر منفیت پر مبنی ہیں۔ یعنی وہ محض ممنوعات کا پلندہ ہیں۔ عالمگیر تجارت اور روزگار کو آگے بڑھانے کے لئے یہ تجویزیں "یہ نہ کرو اور وہ نہ کرو" سے آگے نہیں جاتیں۔ وہ ہمارے سامنے کوئی مثبت چیز پیش نہیں کرتیں۔ یعنی وہ یہ نہیں بتاتیں کہ عالمگیر خوشحالی پیدا کرنے کے لئے یہ کرو اور وہ کرو۔ موخرالذکر چیز کا تقاضا تھا کہ ترقی یافتہ ملکوں کو یہ بتایا جاتا کہ وہ عالمگیر روزگار کو فروغ دینے کے لئے پچھڑے ہوئے ملکوں کی مدد اور اعانت کریں۔ ان کو اشیائے اصل مہیا کریں تاکہ ان کی اپنی تجارت ترقی کرے اور پچھڑے ہوئے ملکوں کی بڑھتی ہوئی معیشت کے مطابق خود اپنی معیشت میں ردوبدل کریں۔ ان تمام باتوں کو امریکی تجارتی تجویزیں بالکل نظرانداز کر دیتی ہیں۔ حالانکہ ان کے بغیر نہ تو عالمگیر تجارت ترقی کر سکتی ہے اور نہ عالمگیر روزگار کی اضافہ ہو سکتی ہے۔ اگر ان مثبت چیزوں کو عمل میں لائے بغیر امریکی تجویزیں مان لی جائیں تو آپ جانتے ہیں کیا نتیجہ برآمد ہوگا؟ کچا مال پیدا کرنے والے ملک ہمیشہ کچا مال پیدا کرتے رہیں گے اور وہاں صنعتی ترقی کبھی نہ ہو سکے گی اور صنعتی لحاظ سے جو ملک ترقی یافتہ ہیں وہ ہمیشہ اُن کا استحصال کرتے رہیں گے۔ کیا عالمگیر روزگار پیدا کرنے کی یہی صورت ہے؟

لیکن دوسری طرف اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بین اقوامی تجارت کی توسیع و ترقی خود ہندوستان کے حق میں مفید ہے۔ اور وہ عالمگیر تجارتی کانفرنس میں ضرور حصہ لیگا۔ اس سلسلے میں تین باتیں بہت اہم ہیں۔ (۱) ہندوستان اس وقت مقروض نہیں بلکہ قرض خواہ ملک ہے۔ عالمگیر تجارتی کانفرنس میں شرکت کرکے ہندوستان اپنا نقطۂ نظر دنیا کے سامنے پیش کر سکتا ہے اور قرضے کی وصولی پر زور ڈال سکتا ہے۔ پھر بین اقوامی تجارت ہی کے فروغ سے ہندوستان کا قرضہ وصول بھی ہو سکے گا۔ (۲) بین اقوامی تجارت کی ترقی اس لئے بھی اہم ہے کہ ہندوستان کو اس وقت کلوں اور مشینوں کی سخت ضرورت ہے۔ جب بین الاقوامی تجارت ترقی کرے گی۔ تب ہی ہندوستان ایک ملک میں اپنا مال فروخت کرکے دوسرے ملک سے کلیں اور مشینیں خرید سکے گا۔ (۳) خود ہندوستان میں تجارت اور روزگار کی حالت بہتر نہیں بنائی جا سکتی جب تک دنیا کے دوسرے ملکوں میں خوشحالی نہ ہو اور موخرالذکر بین اقوامی تجارت کی توسیع و ترقی ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔

غرض اوپر جس صورت حال کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ اُس سے دو باتیں پیدا ہوتی ہیں۔

www.taemeernews.com

ہندوستان عالمگیر تجارت کی ترقی کو آگے بڑھانے کی کوشش کرے گا اور اس سلسلے میں دوسرے ملکوں سے تعاون اور اشتراک عمل سے بھی کام لے گا۔ تاکہ دنیا سے بے کاری اور بے روزگاری دور ہو۔ (۲) لیکن ہندوستان اپنی ضرورت کے مطابق اور اپنی صنعتی ترتیبوں کی خاطر خاص خاص مرتبوں کے لحاظ سے محصولات کی پابندی، کروڑگیری اور مقداری پابندیوں سے ضرور کام لیگا۔ تاکہ ہندوستان میں انہیں اشیا کی درآمد ہو جن کی ضرورت ہے اور ان اشیا کی درآمد بند ہو جن سے یہاں کی صنعتی ترقی کے رک جانے یا سست رفتار ہو جانے کا خطرہ ہے۔ ان دو بظاہر متضاد باتوں میں دراصل کوئی تضاد یا اختلاف نہیں ہے۔

طفیل احمد

سویٹ یونین کا نیا پنج سالہ پلین

بالشویک انقلاب کے بعد سویٹ یونین میں رجعت پسندوں اور انقلابیوں میں جو لڑائی ہوئی۔ اس نے ملک کو کافی نقصان پہنچایا۔ انقلاب پسندوں کی کامیابی اس نقصان کی تلافی کی فکر میں تھی کہ سویٹ یونین کو قحط کے بھوت نے آن دبوچا سارے ملک کی معاشی حالت بگڑنے لگی۔ اس موقعہ پر بالشویکوں کے لیڈر لینن نے نئی معاشی پالیسی اختیار کی لینن نے ذاتی ملکیت اور ذاتی منافع کی کسی حد تک اجازت دے دی۔ چنانچہ ن م پ کے ماتحت بہت سے کسان دوسرے کسانوں سے زیادہ دولت کمانے لگے تاجر اور چھوٹے چھوٹے کاریگر بھی ہاتھ رنگنے لگے ۱۹۲۴ء میں لینن کی موت کے بعد سٹالین نے اس صورت حالات کو ختم کرنے کا تہیہ کر لیا۔ چنانچہ ۱۹۲۸ء میں پہلا پنج سالہ پلین تیار کیا گیا۔ اس منصوبے کو کامیاب بنانے کے لئے سویٹ یونین کے لوگوں نے ان تھک ہمت کا ثبوت دیا۔ دوسرا پنج سالہ پلین ۱۹۳۲ء میں شروع کیا گیا ۱۹۳۸ء میں تیسرے پنج سالہ پلین کا آغاز ہوا۔ ان پلانوں نے سویٹ یونین کی پیداوار میں حیرت انگیز اضافہ کر دیا۔

	۱۹۲۷	۱۹۳۸
کوئلہ	۳۵ ملیون ٹن	۱۴۰ ملیون ٹن
فولاد	۳ ملیون ٹن	۱۸ ملیون ٹن
تیل	۱۱ ملیون ٹن	۳۰ ملیون ٹن
سیمنٹ	۱۱ ملیون ٹن	۴۶ ملیون ٹن
موٹر	×	ایک لاکھ ستر ہزار (گاڑیاں)

www.taemeernews.com

زرعی پیداوار میں ۱۹۱۳ء کی نسبت ایک سو اٹھارہ فی صدی اضافہ ہوا۔ سوویٹ یونین میں تیسرے پنج سالہ پلین پر عمل ہو رہا تھا کہ جرمنی نے اس پر حملہ کر دیا۔ سوویٹ یونین کو چار سال تک حملہ آوروں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس اثنا میں سوویٹ یونین کا جو نقصان ہوا اس کا اندازہ ستر لاکھ جانوں کے اتلاف، تقریباً سات کھرب روبل، ڈیڑھ ہزار شہروں اور ستر دیہات کی تباہی کی صورت میں لگایا جا سکتا ہے۔ صنعت و حرفت کی تباہی واضح اور عیاں ہے۔ بہر حال سوویٹ یونین نے جس بہادری کے ساتھ حملہ آوروں کو شکست دی اسی ہمت کے ساتھ سوویٹ یونین اپنی تعمیر نو میں مصروف ہو گئی۔ سوویٹ یونین کا چوتھا پنج سالہ پلین (۱۹۴۶ء۔ ۱۹۵۰ء) یہ ہے۔ کہ سوویٹ یونین کو جنگ سے پہلے کی اکانومی پر جلد از جلد پہنچا دیا جائے جنگ کے زمانے میں سوویٹ یونین کے مغربی رقبوں کو بہت زیادہ تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ ان رقبوں میں ایک سال کے اندر اندر سابق نقصانات کی کافی تلافی کی جا رہی ہے۔ نئے پلین کے پیش نظر یہ بھی ہے۔ کہ ۱۹۴۸ء تک سوویٹ یونین کے مغربی رقبوں کی انڈسٹری کو جنگ سے پہلے کی سطح تک پہنچا دیا جائے۔ اس پلین کا دوسرا منشا یہ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ ۱۹۵۰ء میں سوویٹ یونین کی صنعتی پیداوار ۱۹۴۰ء کی نسبت اڑتالیس فی صد زیادہ ہو۔ اسی طرح اس پلین کے ذریعہ زرعی پیداوار کو ۱۹۴۰ء کی نسبت ۲۷ فی صد بڑھانا ہے۔ سوویٹ یونین کے نئے پنج سالہ پلین کا مقصد محض جنگ سے پہلے کی اکانومی کو بحال کرنا نہیں بلکہ اس میں اضافہ کرنا ہے۔ قیمتوں میں کمی، اجرتوں میں اضافہ اور معیار زندگی میں بلندی — اس پلین کے نتائج ہوں گے

باری

فلموں میں نفسیاتی زاویہ

قصہ گوئی ایک پرانا فن ہے۔ جس کی اصل غایت انتقال محسوسات ہے یعنی کسی کے دل کی کیفیت کو ایسے انداز میں بیان کرنا کہ سامعین یوں محسوس کریں جیسے وہ آپ بیتی ہو۔ یا جیسے اُس خارجی واقعہ سے انہیں براہ راست گہرا جذباتی تعلق ہو یا کچھ وقت کے لئے وہ اپنی شخصیت کو معطل کر کے اُسے کہانی کے کسی کردار کی شخصیت میں منتقل کر سکیں۔

فنون لطیفہ کا مقصد ہمارے دلوں کو جذبات لطیفہ سے سیراب رکھنا ہے۔ اور ضمنی طور پر دوسروں کے جذبات سے آشنا کرنا بھی۔ ہمارا نفسیاتی نظام کچھ ازلی اور فطری طور پر ایسا ہے کہ ہم دوسروں کے جذبات کو براہ راست محسوس نہیں کر سکتے۔ دوسروں کے جذبات کو جاننے کے لئے ہمیں محض قیاس سے کام لینا پڑتا ہے۔ افراد کے درمیان قیاس کی اونچی لمبی دیواریں حائل ہیں اور ہر فرد اپنی 'میں' کے کوئیں میں غوطے کھا رہا ہے۔ اور اس گہما گہمی میں رہنے کے باوجود

www.taemeernews.com

قطعی طور پر تنہا ہے حتیٰ کہ فرد اپنے عزیز و اقارب کے دکھ سکھ سے بھی بیگانہ ہے چنانچہ افراد کے درمیان محبت اور ہمدردی کا رابطہ پیدا کرنے کے لئے فنونِ لطیفہ ہی واحد ذریعہ ہیں۔ اور اسی لئے ان کی اہمیت سائنس، فلسفہ اور دیگر علوم سے کہیں زیادہ ہے۔ فنونِ لطیفہ میں کہانی کہنے کے فن کی فوقیت کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس کی اپیل بلا واسطہ پر زور اور ہمہ گیر ہے

قدیم و منع کا قصہ گو جہاں بھی بیٹھ جاتا تھا اس کے ارد گرد عورتوں بچوں اور بوڑھوں کا جمگھٹا لگ جاتا۔ قصہ سنانے کے دوران میں بچہ یہ بھول جاتا کہ وہاں پاس ہی مٹھائی کی دکان ہے عورت کو احساس رہتا کہ وہ گاؤں کی گوری ہے۔ بوڑھا موت کے ڈر سے بے نیاز ہو جاتا۔ اس لمحے وہ سب قصہ گو کے ہاتھ کی کٹھ پتلیاں بن جاتے۔ اور ان کے محسوسات قصہ گو کے فنی اشاروں کے مطابق بنتے بگڑتے اسی بات میں قصہ گو کے فن کا کمال مضمر تھا۔

سامعین کے جذبات پر قدرت حاصل کرنے کیلئے یعنی اپنے کرداروں کے محسوسات کو اس بزم میں نشر کرنے کے لئے قصہ گو کو صرف چند محدود ذریعے حاصل تھے یعنی مناسب لفظوں کا چناؤ، مناسب توقف و تعطل، صوتی اتار چڑھاؤ اور ان ذرائع کے اظہار کی مدد سے وہ سامعین کے دل میں جذبات پیدا کرتا انہیں ابھارتا اور کچھ دیر کے لئے قیام عطا کرتا۔

افسانہ گو کی طرح افسانہ نویس کو یہ تمام ذرائع اظہار حاصل نہیں۔ اسے صرف الفاظ اور ان کے صوتی اثرات پر اکتفا کرنا پڑتا ہے لیکن فلمی افسانہ پیش کرنے کیلئے ذرائع اظہار کی ایک دنیا کھلی پڑی ہے کیونکہ متکلم اور متحرک تصاویر دیکھنے والے کے سامنے فریب سماعت اور فریب نظر کا ایسا جال بن سکتی ہیں کہ اس پر حقیقت کا گمان ہونے لگے۔ بہر حال یہ امر مسلمہ ہے۔ کہ کہانی چاہے الفاظ کے ذریعے کہی جائے یا تصاویر کے ذریعے اس کی بنیادی غایت انتقال محسوسات ہی ہے۔

اگر آج تک کوئی پروڈیوسر اچھی کہانی پیش نہیں کر سکتا تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اسے اس بات کا احساس نہیں کہ اس کی پیشکش کا مقصد انتقال محسوسات ہے۔ وہ اس بنیادی مدعا کو نظر انداز کر کے ضمنی فروعات میں پھنس جاتا ہے۔ بڑے بڑے سیٹ تیار کرواتا ہے۔ حسین چہرے تلاش کرتا ہے۔ کرداروں سے ہیجان انگیز حرکات کا مطالبہ کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تصویر کا بنیادی مقصد پس پشت پڑ جاتا اور مرکزی خیال فوت ہو جاتا ہے۔ وہ تماشائیوں کے دل میں جذبات پیدا نہیں کر سکتی۔ بے چارہ پروڈیوسر تصویر کی ناکامی کی اس صحیح وجہ کو نہیں سمجھ سکتا۔ کہ وہ بنیادی مقصد سے انحراف کر رہا ہے۔ وہ سمجھتا ہے۔ کہ اس کی وجہ محنت اور توجہ کی کمی میں مضمر ہے چنانچہ اگلی پیشکش کو کامیاب بنانے کے لئے وہ از سر نو ضمنیات میں کھو جاتا ہے اور یہ چکر یونہی چلتا رہتا ہے۔

آج کل کے نئے پروڈیوسر کی بات چھوڑیئے وہ تو فلمی بیوپار میں صرف اس لئے آشامل ہوا

www.taemeernews.com

کہ اُسے معطر گودمیں بیٹھ کر بیوپار کرنے کا شوق ہے ۔ اسے اس تجارت سے اس لئے دلچسپی ہے کہ اس میں تجارت کے ساتھ ساتھ جذباتی ہیجان بھی پیدا ہوتا رہتا ہے ۔

سمجھدار پروڈیوسر بھی اس نقطے کو نہیں پا سکا۔ کہ اس کا کام صرف کہانی پیش کرنا نہیں بلکہ کہانی کو ایسے انداز سے پیش کرنا بھی ہے کہ وہ تماشائیوں کے محسوسات کا جزو بن جانے تماشائی اُسے دیکھیں نہیں بلکہ سہتیں کرداروں کے جذبہ کے مقابلہ میں عظیم الشان سیٹ، اینو ہی مناظر اور جنسی اشتعال پیدا کرنے والے سین محض ضمنی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اسی صورت میں اہم ہو سکتے ہیں جب وہ کرداروں کے جذبات کو تقویت دینے اور قیام بخشنے میں ممد و معاون ثابت ہوں۔ ایسے ضمنی اثرات صرف اسی صورت میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ جب وہ تماشائیوں کے دل میں کردار کے جذبہ کے تاثرات کو اپنا لینے کی قبولیت یا صلاحیت پیدا کریں اُس مرکزی نقش کے لئے مناسب پس منظر پیدا کریں یا اُس مجسمہ کیلئے پائے ستون بنیں۔ کسی کے دل میں کسی اثر کے لئے قبولیت پیدا کرنا اور پھر وہ اثر پیش نہ کرنا ایک ایسے وعدے کے مترادف ہے جو نبھایا نہ جائے۔ پس منظر تو بنا دیا جائے لیکن اُسے زندگی بخش نقش سے محروم رکھا جائے یا ڈائس تو استوار کر دیا جائے لیکن اس پر مجسمہ نصب نہ کیا جائے۔ عظیم الشان سیٹ اور اینو ہی مناظر مغربی آرکسٹرا کے مصداق ہوتے ہیں جس میں بیک وقت سینکڑوں ساز بجتے ہیں ہندوستانی پروڈیوسر کو ان سے کام لینے کا شوق تو ہوتا ہے۔ مگر وہ اس بات کا شعور نہیں رکھتا کہ سازوں کی کثرت کے باوجود مغربی آرکسٹرا سامعین کے دل پر ایک واحد اثر پیدا کرتا ہے ۔

مغربی آرکسٹرا کی فنی عظمت کے روبرو سرِ تسلیم خم کرنے کے باوجود اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ ایک ہندوستانی ایک بھدے سے اکتارے پر ایک بھولا سا گیت گا کر آرکسٹرا کے بھڑکیلے اثر سے کہیں گہرا اثر پیدا کر سکتا ہے ۔ مثال کے طور پر ڈائرکٹر محبوب اپنی پیشکش ہمایوں میں باغات اور محلات کے نظر فریب مناظر پر اصراف کے باوجود وہ بات پیدا نہ کر سکا جو ڈائرکٹر شوکت زینت میں محض سادگی اور جذبہ کی مدد سے پیدا کرنے میں کامیاب ہوا۔ زینت کی کمزوریوں سے قطع نظر۔ اسکی وجہ محض یہ تھی کہ اوّل تو ہمایوں میں کوئی کردار ایسا نہ تھا جس کے جذبات کی رفعت مناظر کے بھڑکیلے پن پر حاوی ہو سکتی ہو۔ اور اگر تھا بھی تو اس کے جذبات ایسے انداز سے پیش نہ کئے گئے کہ وہ تماشائیوں کے دل میں زبردست گونج پیدا کرتے ۔

کسی کہانی میں چاہے وہ فلمی ہو یا ادبی جزو کو کل سے زیادہ اہمیت دینا یا ضمنیات کو اتنا جمکانا کہ بنیادی چیز کی طرف راغب کرنے کے بجائے وہ تماشائیوں کی توجہ کو اس سے منحرف

کرے اچھے نتائج پیدا نہیں کرسکتا۔

آپ کسی بچے کو کہانی سنائیے۔"ایک تھا دیو" اچھا" وہ شوق سے پوچھے گا۔ اگرچہ وہ دل میں خوب سمجھتا ہے۔ کہ دیو دیو کوئی نہیں یہ تو محض قصّہ ہے لیکن اگر آپ اُسے کہیں کہ ہمارے گھر میں ایک دیو رہا کرتا تھا۔ ہمارے گھر میں ؟ وہ چونک اٹھیگا۔ پھر صرف اتنی سی تبدیلی پر بچہ قطعی بھول جائے گا کہ آپ اُسے کہانی سنا رہے ہیں۔ اور کہانی وہ ہے جو صرف سنائی جاتی ہے۔ آپ کی کہانی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بات دیو کی تھی اور دیو ہی کی رہی۔ صرف ہمارے گھر کی کلی ٹانک کر آپ نے بچے کا زاویہ نگاہ بدل دیا ہے۔ پروڈیوسر کو یہ سمجھنا چاہئیے کہ اُسے کہانی ہی پیش نہیں کرنا بلکہ تماشائیوں کے نقطہ نظر کو یوں بدلنا ہے۔ کہ وہ اُسے اپنا لیں اور دیکھنے کی جگہ اُسے بیتنا شروع کر دیں کہ اُسے کہانی کو اس زاویہ نظر سے پیش کرنا ہے جو تماشائیوں پر مناسب نفسی کیفیت طاری کرے ایسا زاویہ نظر جو نفسیاتی ہو۔

چونکہ تماشائی فلمی مناظر کو اُسی زاویے سے دیکھتے ہیں جس زاویے سے اُسے کیمرے نے دیکھا ہو اس لئے نفسیاتی زاویے قائم کرنا کیمرے پر منحصر ہے۔ کسی سین کو فلمانے سے پیشتر اس بات کا تعین ضروری ہوتا ہے کہ تماشائی کے دل پر کیا اثر پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر اس اصول پر عمل نہ کیا جائے تو فلم کی حیثیت محض خارجی منظر بندی کی رہ جاتی ہے۔ خارجی منظر بندی سے پروڈیوسر یا ڈائرکٹر تماشائیوں کے جذبات پر قادر نہیں رہ سکتا۔ اور اگر وہ تماشائی کے جذبات پر قدرت نہیں رکھتا تو اُسے فلمی کہانی پیش کرنے کا کوئی حق نہیں۔

مثال کے طور پر اگر آپ کسی کردار کو بلندی سے گرتے ہوئے دکھانا چاہتے ہیں۔ اس منظر کی تصویر بندی سے پہلے لازم ہے کہ آپ اس بات کا تعین کرلیں کہ آپ کو تماشائی کے دل میں گرنے والے سے ہمدردی کا جذبہ پیدا کرنا ہے یا گرانے والے سے۔ اگر آپ گرنے والے سے ہمدردی پیدا کرنا چاہتے ہیں تو یہ لازم ہوگا کہ ایسے زاویہ سے فلمایا جائے کہ نمائش کے وقت تماشائی اُسے دیکھ کر ایسے محسوس کرے جیسے وہ خود گر رہا ہے۔ یہ اثر پیدا کرنے کے لئے کیمرے کے زاویہ کو گرتے ہوئے آدمی کی نگاہ سے منطبق کرنا پڑے گا۔ یا تو قریب سے قریب تر آتی ہوئی زمین کو دکھلایا جائے گا اور یا منڈیر دل اور چھجوں کو یوں دور ہٹتے ہوئے کہ تماشائی کے ذہن کو جھٹکا لگے۔ اس کے برعکس اگر تماشائی میں گرانے والے سے ہمدردی پیدا کرنا مقصود ہے تو گرنے کی تفصیلات دکھانے کی بجائے گرانے والے کے چہرے پر ہول اور ندامت دکھانا ہی کافی ہوگا۔

ایسے ہی اگر اس شخص کے احساسات کو تماشائی کے دل میں منتقل کرنا ہو۔ جو خودکشی کرنے کیلئے ریل کی لائن پر لیٹ گیا ہو۔ تو عام پروڈیوسر جذباتی تسلسل پیدا کرنے کے لئے گاڑی کو آتے ہوئے بار بار

www.taemeernews.com

دکھاتا ہے۔ اور پھر مخصوص مقام پر اُسے یوں پیش کرتا ہے۔ کہ اس منظر کی حیثیت محض خارجی رہ جاتی ہے اس طرح جذباتی تعلق کی حیثیت بھی بے معنی ہو جاتی ہے اگر پروڈیوسر یا ڈائرکٹر گاڑی کو اس زاویہ نگاہ سے دکھلائے جس سے خودکشی کرنے والا اُسے آتے ہوئے دیکھتا ہے تو لازمی طور پر تماشائی یہ محسوس کرے گا کہ وہ خود گاڑی تلے کچلا جانے والا ہے۔ اس طرح گرنے والے یا کچلے جانے والے کو واضح طور پر دکھانے کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ کیونکہ انہیں دکھائے بغیر تماشائی کو گرنے اور گاڑی تلے کچلے جانے کا احساس دلایا جا سکتا ہے۔ یہ اختصار تصویر بندی کے لئے بے حد اہم ہے۔

فلمی کہانیوں میں آپ نے کئی بار قتل کے سین دیکھے ہیں ایسے مناظر دیکھ کر ہم محسوس کرتے ہیں جیسے اخبار میں قتل کی واردات پڑھ رہے ہیں یعنی اُن کا اثر براہ راست ہمارے جذبات پر نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ڈائرکٹر تماشائیوں کا زاویہ نظر مقتول کے زاویہ نظر سے منطبق کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔

نفسیاتی زاویہ نظر کو نظر انداز کرنے سے تصویر کی فنی حیثیت ہی پر اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ بااوقات تماشائیوں کے اخلاق پر بھی اس کا بُرا اثر پڑتا ہے۔ فرض کیجئے ڈائرکٹر ایک منظر پیش کر رہا ہے جس میں ایک بدمعاش کردار بُری نیت سے آدھی رات کے وقت کسی پاکیزہ لڑکی کے کمرے میں داخل ہوتا ہے ایسی حالت میں لازم ہے کہ بدمعاش کے شہوانی جذبہ کے بجائے لڑکی کی دہشت کو نشر کیا جائے تاکہ تماشائیوں اس قبیح حرکت کے خلاف جذبۂ نفرت پیدا ہو۔ لیکن ایسے عام طور پر آپ کے سامنے پردہ سیمیں پر بدمعاش آنکھڑا ہوتا ہے آنکھوں میں شہوانیت کی چمک اور ہونٹوں پر غنڈوں کی سی مسکراہٹ ہوتی ہے۔ یہ منظر دیکھ کر ہال میں بیٹھی ہوئی عورتیں یوں محسوس کرتی ہیں۔ جیسے وہ اُن کی طرف بڑھ رہا ہو۔ ان کے جسم میں ایک کپکپی سی دوڑ جاتی ہے۔ مانا کہ شعوری طور پر وہ اس قبیح حرکت کے خلاف احتجاج کی کیفیت محسوس کریں گی۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کپکپی اپنے عقب میں لذت کی ہلکی سی رو چھوڑ جائیگی چوری چوری ان کے دل میں آرزو پیدا ہو گی۔ کہ ان کی زندگی میں بھی کبھی ایسے حالات پیدا ہوں، اس کے برعکس اگر بدمعاش کو منظر سے خارج کر دیا جائے۔ اور صرف لڑکی کے تاثرات کو تصویر بند کیا جائے تو تماشائیوں کے دل میں واضح طور پر نفرت کا ایسا جذبہ پیدا ہو گا۔ جسے جنسیات شہوانیت سے قطعی تعلق نہیں۔ اس کے علاوہ منظر عریانی کے خدشے سے بھی پاک ہو جائیگا۔ ایسے مناظر پیش کرتے وقت تماشائی اختصار اور پاکیزگی کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔۔۔ نفسیاتی زاویہ نہ صرف تاثر بلکہ اختصار اور پاکیزگی بھی پیدا کرتا ہے

ممتاز مفتی

www.taemeernews.com

دو ناول

گذشتہ دنوں ہمارے اردو ادب میں دو ضخیم اور قابلِ قدر ناولوں کا اضافہ ہوا۔ ادب کے ترقی پسند دور میں ان ناولوں کی اشاعت اس لئے بھی اہم ہے کہ ان میں انسانی زندگی کو براہِ راست دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے ان میں پہلا ناول ہے عصمت چغتائی کا۔

ٹیڑھی لکیر جسے ترقی پسند اشاعتی ادارے مکتبہ اردو نے شائع کیا ہے — پانسو صفحات کا یہ ناول ایک انوکھے اور منفرد کردار "شمن" کے گرد گھومتا ہے۔ یہ ٹیڑھا بینگا کردار ایک متوسط مسلمان خاندان کی پیداوار ہے۔ اور جس کے متعلق بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس کردار کے پردے میں مصنفہ ہی کی غیر مستقیم آپ بیتی سنائی جا رہی ہے۔ خود اپنے ہی ذہنی اور جسمانی عوامل کی روداد نے ناول میں بے جان تصنع اور من گھڑت ماحول کو داخل ہونے سے بیشتر روکے رکھا۔ اگرچہ بعض مقامات پر جب اسے "ادب برائے ادب" کی راہوں سے گزرنا پڑا ہے تو یہ تصنع ذرا واضح ہو گیا ہے اور اپنے مکلف لبادے کی غمازی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ شاید وہاں مصنفہ کی اس آئیڈیالوجی کا تسلط ہے۔ جو اس کی فنی تشکیل میں ایک لازمہ کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

"شمن" کی زندگی میں گرد و پیش کے مختلف اور متعدد کرداروں کا داخلہ اور پھر خارجہ بڑی سیمابی رفتار سے ہوا ہے۔ اور "شمن" کے فطری ٹیڑھے پن اور زندگی کو ایک منفرد ڈھب سے دیکھنے اور اپنے انفرادی عمل کا ناقوس پھونکنے کی وجہ سے ان کرداروں میں سے کسی کو بھی استقامت نصیب نہیں ہو سکی۔ پہلی منزل میں "شمن" کے دائرہ حیات میں مخصوص سماج زدہ عورتوں، کڑھتے بسورتے بچوں اور رسمی لڑکیوں کا عمل دخل ہوتا ہے۔ جنہیں وہ اپنے تنفر کے تازیانے لگا لگا کر اپنے وجود کی اہمیت کا احساس دلاتی، انہیں چڑاتی، انہیں اپنی غیر معمولی ذہانت کی چوٹیں لگاتی، اپنی شعوری اور غیر معمولی برتری سے مرعوب کرتی۔ اور پھر ان سب کو اپنے دامن سے جھٹکتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہے — یہ سلوک وہ ناول کے دوسرے منازل میں شامل ہونے والے مرد کرداروں، شوخ و شنگ ماحول زدہ لڑکیوں، ترقی پسند گرد ویل سینگ کا کنول، انقلابی دہشت پسندوں، پروگریسو ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ بھی روا رکھتی ہے۔ اگرچہ ان میں بعض کرداروں کی جابرانہ انفرادیت شمن کے ٹیڑھے پن پر بھی حاوی ہو جاتی ہے۔ اور یہ اس لئے کہ شمن کی غیر مستقیم شخصیت میں شدتِ احساس بھی پوری پامردی کے ساتھ شامل ہو چکی تھی۔ اور یہی شدتِ احساس اس کی دبی دبائی کمزوریوں (ان میں جنسی ناسازی بھی شامل ہے) اور فطری انسانی درد مشترک کو بیدار رکھا کر کے اس کی آمری ذہنیت کو شکست دیتی رہی۔ انتخار، ایلیا، اسٹیل اور مائے صاحب — ان سبھی کرداروں نے شمن کو کسی نہ کسی پہلو سے دبوچ لیا۔ اس طرح کہ اس کی زندگی میں بچے ہوئے ٹیڑھے پن، اس کی فطرت کا جزو بنکر بنی ہوئی سنگینی اور سختی کو پگھلا اور پگھلا دیا۔ اپنی در پردہ کمزوریوں کی واضح شکست اور نتیجتاً ندامت سے بچنے کے لئے اس نے تسلیم

www.taemeernews.com

شکست کا جو یہ اختیار کیا۔ اگرچہ تسلیمِ شکست کے بعد پیدا ہونے والی جھنجھلاہٹ اسے کڑھاتی اور جھنجھوڑتی ضرور رہی اپنی زندگی میں داخل ہونے والے کرداروں کے نفسی تجزیے کرنے میں عصمت چغتائی نے سحر اور طلسم کی سی کیفیت پیدا کر دی۔ جہاں جہاں اس کا وار چلا ہے۔ وہ اپنی مخصوص بیباک نگاری، اپنے مخصوص لب و لہجہ، اپنی مخصوص قوتِ زبان و بیان، اور اپنے مخصوص نفسیاتی اسلوب کے سارے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر نکلی ہے۔ ہر نیا کردار اور اس کا نیا نفسی تجزیہ، شمن کی زندگی میں نفرت، برتری اور انفرادیت کے جراثیم کی نشو و نما کرتا اور انہیں پالتا پوستا چلا گیا ہے۔ اس کے محسوسات میں نئے نئے رنگ بھرتا چلا گیا ہے۔ اس کے مشاہدات میں غم، شوق، محبت، نفرت، جنس اور جسم کے نت نئے پہلوؤں کا اضافہ کرتا چلا گیا ہے۔۔۔۔ اور یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ کہ جب شمن کی زندگی میں پہلا مرد کردار "رشید" شامل ہوا۔ تو اپنی جنسی ناہمواری کے باعث شمن کی کشتی ڈولنے لگی۔ اگرچہ جب اسے جنسی ناہمواری میں گرفتار دوسرے مردوں سے دوچار ہونا پڑا۔ تو اس کا یہ لجلجا پن، تنفر اور حقارت میں بدل گیا۔ کیونکہ شاید اسے ایسے مردوں میں دو جنس کے اشتراک کی جھلک نظر آ جاتی ہے۔ برخلاف اس کے "بنیل" کے جسمانی اقدامات سے وہ خوفناک حد تک متاثر ہوئی۔ اور یہاں الیما سے غیر شعوری رشک کی بنا پر اس میں مامتا نے جنم لیا۔ وہ مامتا، جو الیما پہ ٹھونس دی گئی تھی، لیکن شمن کی زندگی میں صرف ایک نامختتم حسرت کی شکل ہی کارفرما تھی۔ اور پھر جس حسرت کی تکمیل اس نے "ٹیلر" کے توسط سے کی۔ ٹیلر جو اس کی زندگی میں آسمان سے ٹپک پڑا معلوم ہوتا ہے۔ یعنی اسی طرح جیسے وہ اسی تکمیل ہی کے لئے اس کی زندگی میں در آیا۔ اور اپنے مشن میں کامیاب ہو کر امریکہ چلا گیا۔ امریکہ اور ہندوستان کا یہ گٹھ جوڑ غیر اتفاقی تو نہیں کہا جا سکتا ہے۔ لیکن ناول کے داخلی اور ترتیبی تقاضے اس حادثاتی اقدام کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ضرور دکھائی دیتے ہیں۔

اس ناول کے بعض ٹکڑے تو ہمارے اردو ادب کی تاریخ میں ایک مثالی اور اہم حیثیت کے حامل ہیں۔ عصمت زندگی کے جن جن مخصوص مراحل میں اپنے مخصوص تجربے کرتے ہوئے گزری ہے۔ وہاں اس کی تندی اور تیزی میں ایک اچھوتا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ علی الخصوص کالج اور سکول کی زندگی کے ماحولی تجزیے اور نفسی تنقیدیں، الیما کے حرامی بچے سے پہلی ملاقات اور پھر الیما کے منتقمانہ تاثرات کی تصویریں وغیرہ ۔۔ اپنے ناول میں عصمت نے اپنے دل میں لیے رہنے والے اس جذبہ کی بھی متواتر تسکین کی ہے۔ جو لاشعوری طور پر مرد سماج سے متعلق ہے۔ ہم اس جذبے کو صحت مند کہیں یا نہ کہیں۔ کیونکہ ہمارے جدید ہندوستان کی بیدار نسوانیت کا احتجاج ابھی عبوری فضا میں ہے۔ اور روایتی مخاصمت ختم نہیں ہوئی۔ لیکن با ایں ہمہ عصمت کا انداز سکون یابی فنکارانہ ضرور ہے۔ اگرچہ جسم کی پرورش کی بات اور ہے۔

سیاسی بحثوں، جنگ کے تذکروں اور سوشل تحریکوں کو عصمت نے اپنے خاص انفرادی زاویے کی عینک سے دیکھا ہے۔ اور چونکہ اس کے ذہن پر کسی "سیاسی ازم" کا بھوت مسلط نہیں ہے۔ اس لئے اس نے ایک پیغمبرانہ فنکاری اور بے نیازانہ عروج پر جا کر جانچ پرکھ کی ہے۔ ان موضوعات پر اس کے تاثرات ان حلقوں کو مایوس کریں گے جو

www.taemeernews.com

اقتصادی اور سیاسی بحث کو نظری جذباتیت میں محصور کرنے کے قائل ہیں۔ اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ عصمت ان عدم بنیادی صداقتوں کی حد تک ہمدردی کا سلوک کرتی ہے۔ یہ سلوک 'بوٹن' کا دانہ ہے۔ یہ سلوک پر خلوص سے بھرا ہوا ہے — یہ سیاسی مباحث "شیلہ" والے حصے میں تجربات کے افلاس کی چغلی کھاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ کیونکہ پلاٹ اور تجربے کے پھولوں پر خزاں آنے کے بعد سیاسی بحثیں، خشک، بے رنگ و باد اور تکنیکی جھاڑیوں میں الجھ کر رہ جاتی ہیں اور اس طرح عصمت "نادلیت" کے حلقہ سے نکل کر قعرِ تصور کا آسرا لے لیتی ہے۔

شروع سے آخر تک "جسم اور جنس" اس ناول کی ہیئت ترکیبی میں کارفرما ہے ہیں۔ "جسم" عصمت کا محبوب موضوع ہے۔ بلکہ یوں کہئے۔ کہ جسم کے شدید ترین اور گوناگوں تجربات نے ہی اسے فن کی مشعل عطا کی۔ یہ تجربات تلخ بھی ہیں تیز بھی، شیریں بھی، طنزیہ بھی، دلچسپ بھی، مخلصانہ بھی، مریضانہ بھی اور صحت مند بھی — اور تجربات کا یہ تنوع درحقیقت ہماری سماج ہی کا دیرینہ اور مسلمہ تنوع ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ وہ شمن کے روپ میں ان تجربات کی قائل بھی ہے اور ناقائل بھی۔ ایک خاص معیار کے مطابق وہ تجربات کو سختی سے ڈانٹتی بھی ہے۔ انہیں ایک استاد کی طرح جھڑکتی بھی ہے۔ اگرچہ سماجی بچل سے اسے لاگ بھی ہے اور لگاؤ بھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ دھوکہ نہیں دیتی۔

زندگی کو تلخ و شیریں تجربات کی بساط پر گھمانے پھرانے کے بعد شمن کی کیفیت ایک ہارے ہوئے جواری کی سی ہو جاتی ہے۔ وہ بساطِ حیات پر اپنے مہروں کو پٹے، لڑھکتے اور سرنگوں حالت میں دیکھتی ہے۔ تو انتقام کا ایک اور جبیں جمل لیتی ہے۔ یعنی وہ اپنے آپ کو تصنعات میں بھینچ سکیڑ لیتی ہے۔ ایک خالصتاً مصنوعی زندگی گزارنے پر تل جاتی ہے۔ اور ایسا کرتے ہوئے وہ گویا اس گہری اور ابدی حقیقت سے پردہ اٹھاتی ہے۔ کہ زندگی کے منفرد پیمانے ہمیشہ غیر مطمئن اور پھڑکتے تڑپتے نخچیر کی سی حیثیت میں رہتے ہیں۔ یہ اور بات ہے۔ کہ وہ اپنے انتقام کو خوشی، بہادری، حسن محبوبیت اور اطمینان کا روپ دے دیں۔ اور ہر رنگ میں صبح تک چلتے رہیں۔ لیکن نتیجہ معلوم۔

عصمت کا یہ ناول خوبیوں سے خالی نہیں۔ کمزوریوں سے محفوظ نہیں۔ لیکن ہمارے جدید ناولی دور کے لئے نشانِ راہ کا حکم رکھتا ہے۔ ایسا نشانِ راہ جس کے اشاروں پر تعمیری، افادی اور لافانی ناول تخلیق کئے جا سکتے ہیں۔ شدید ترین انفرادیت کے خول میں اجتماعی احساسات کی پھڑپھڑاہٹ، پرواز کے لئے واضح پیغام ہے۔

اور ڈان بہتا رہا

مائیخل شولوخوف کا یہ ناول جسے مکتبہ جدید لاہور نے اردو کا جامہ پہنا کر ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ روسی ادب میں ایک ممتاز ترین ناول کا مرتبہ حاصل کر چکا ہے۔ یہ ناول دریائے ڈان کے ساحل کی ایک کاسک بستی "تتارسک" سے شروع ہوتا ہے۔ اور کاسک قبیلے کی دیہی طرزِ بود و ماند اور جنگجو عسکری فطرت کے ڈانڈے پہلی جنگ عظیم سے ملاتا ہوا، زار کی استبدادی حکومت پر روس کے سرخ انقلاب کے شعلے لہراتا ہوا، بالشویکی انقلابیوں کو پامردی کے ساتھ شہنشاہ پرست قوتوں کے ہاتھوں اذیت، تشدد، قتل و غارت اور خانہ جنگی کا نشانہ بناتا ہوا ختم ہوتا ہے۔

ناول پڑھتے پڑھتے یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے ہم ہندوستان ہی کے کسی سرحدی قبیلے کی داستان پڑھ رہے

www.taemeernews.com

ہیں۔ وہی جفا کوشی، وہی بے تکلف گرد و پیش، وہی گندم کے مانوس کھیت، گھوڑے، جھونپڑے، وہی اخلاقی اور روایتی نظریے، وہی فلسفۂ حسن و عشق، وہی گائے بیل بچھڑے، بھیڑ بکری اور دودھ دہی سے اٹھتے ہوئے شیریں نغمے، وہی صبحیں، وہی شامیں، وہی ازدواجی مسائل اور معیار — جیسے مشرق کی روح ایک لمبے تار کی طرح کھچ کر ڈان کے کناروں تک اپنا صور پھونکتی چلی گئی ہے۔

شولوخوف کا یہ ناول روسی تاریخ سے ایک بہت عظیم اور اہم ترین باب کو دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ انقلاب سے پہلے کی کاسک زندگی کے تجزیے اور ان کی ماحولی تصویریں، ان کی مسکراہٹیں، قہقہے، آنسو، کراہیں، رقابتیں اور نفرتیں، مصنف کے عمیق، سچے اور وسیع مشاہدے کا ثبوت دیتی ہیں۔ اس کے بعد شہنشاہیت زار کی جنگ عظیم میں شمولیت پر کاسک زندگی کی پلٹتی ہوئی کیفیتیں، میدان جنگ کے لرزہ خیز اور دلدوز مناظر، دوران جنگ ہی میں بالشویکی عناصر کی نمود اور پرداخت اور اشتراکی رفقا کی خفیہ اور جانبازانہ سرگرمیاں، کاسک جیسے وحشی، اجڈ لیکن بہادر قبیلے کے نوجوانوں میں انقلابی روح پھونکنے کے انداز نہایت چابکدستی، خلوص اور دیانت کے ساتھ دکھائے گئے ہیں۔ جابر زار کی حکومت کا تختہ الٹ جانے کے بعد کا حصہ ناول کا عروج، اثر انگیز اور اہم حصہ ہے۔ کیونکہ یہ وہ دور تھا جب کہ انقلابی قوتوں کے سامنے اندرونی دشواریاں پہاڑ بن کر حائل ہو گئی تھیں۔ صدیوں تک زار شاہی تلے کچلی جاتی ہوئی کاسک قوم، جبر و استبداد سے غیر شعوری طور پر مانوس ہو چکی تھی۔ ان کے اذہان، عمل کی حد تک شہنشاہیت سے سمجھوتہ کر چکے تھے۔ اس لئے وہ انقلاب کے شعلوں کو قبول کرنے سے بھڑکتے تھے۔ بالشویکی نظام انہیں کسی نامحسوس خطرے کا پیش خیمہ دکھائی دے رہا تھا۔ متضاد دور کی اس چکی میں سرخ انقلابیوں کو پے بہ پے قربانیاں دینی پڑ رہی تھیں۔ ان کی یہ قربانیاں ایک فرسودہ اور گلی سڑی قوم کے بطن سے ایک نئی، تازہ اور خوشحال قوم کو جنم دے رہی تھیں۔ رسمی دیوانوں کی اٹل اور وحشیانہ دیواریں، انقلاب دشمن لیڈروں کی سرکشی اور ان کے اندر دم توڑتی ہوئی زہریلی شاہ پسندی اور ان سب کے ساتھ ساتھ نئے نئے کاسک انقلابیوں کے اوہام و شکوک — ایسی ان گنت رکاوٹوں کے درمیان انقلابی قوتوں کا سیلاب اپنی قیمتی اور لافانی قربانیاں دیتا ہوا بڑھتا چڑھتا رہا۔ متواتر، مسلسل اپنے پیارے دیرینہ اور مانوس ساتھی ڈان کی طرح بہتا رہا۔ بہتا رہا۔ بہتا رہا —

شولوخوف کا فن اپنے کرداروں، اپنی پہاڑیوں، اپنے جنگلوں، اپنے دیہات، اپنے شہروں اور اپنے کاسکوں کا مشتاق اور ماہر شکاری کی طرح احاطہ کر لیتا ہے۔ شاعر بن کر، داستان گو بن کر، مصور بن کر، انقلابی بن کر اور سب سے زیادہ ایک کاسک بن کر — ایک جدید ترین اشتراکی کاسک جسے سوویت طرز نظام کی ہمہ گیری میں اپنی تاریخ عزیز ہے اور آزاد عوام کی آزاد کاسک ریاست عزیز ہے۔ مخالف اور موافق لوگوں کا تجزیہ کرتے ہوئے جہاں اس نے کمال دیانت کا ثبوت دیا ہے۔ وہاں اس نے اپنے اس محبوب نصب العین کو کسی مقام پر بھی فراموش نہیں کیا۔ کہ تہذیبی ارتقا کا دھارا، اشتراکی تصور حیات کی جانب مڑ کر ہی زندگی کو خوبصورت مستقبل تک لے جا سکتا ہے۔

www.taemeernews.com

ادارۂ مکتبہ جدید شکریہ کا مستحق ہے جس نے یہ ناول پیش کر کے ہمارے اردو ادب میں ایک مثالی اضافہ کیا ہے اور آنے والے عوامی انقلاب کے لئے ذہنی تعاون کی ترتیب و تشکیل کا فرض سرانجام دیا ہے۔

جناب مخمور جالندھری نے ترجمہ کرتے ہوئے جیسے کارک قبیلے اور مائیخل شولوخوف کے دلوں کو جا کر ٹٹول لیا ہے۔ چونکہ ماحولی مدح میں مشرقیت تھی۔ اس لئے الفاظ اور محاورات کے انتخاب میں مخمور صاحب کی صحیح اور پوری توجہ کارفرما رہی۔

فکر تونسوی

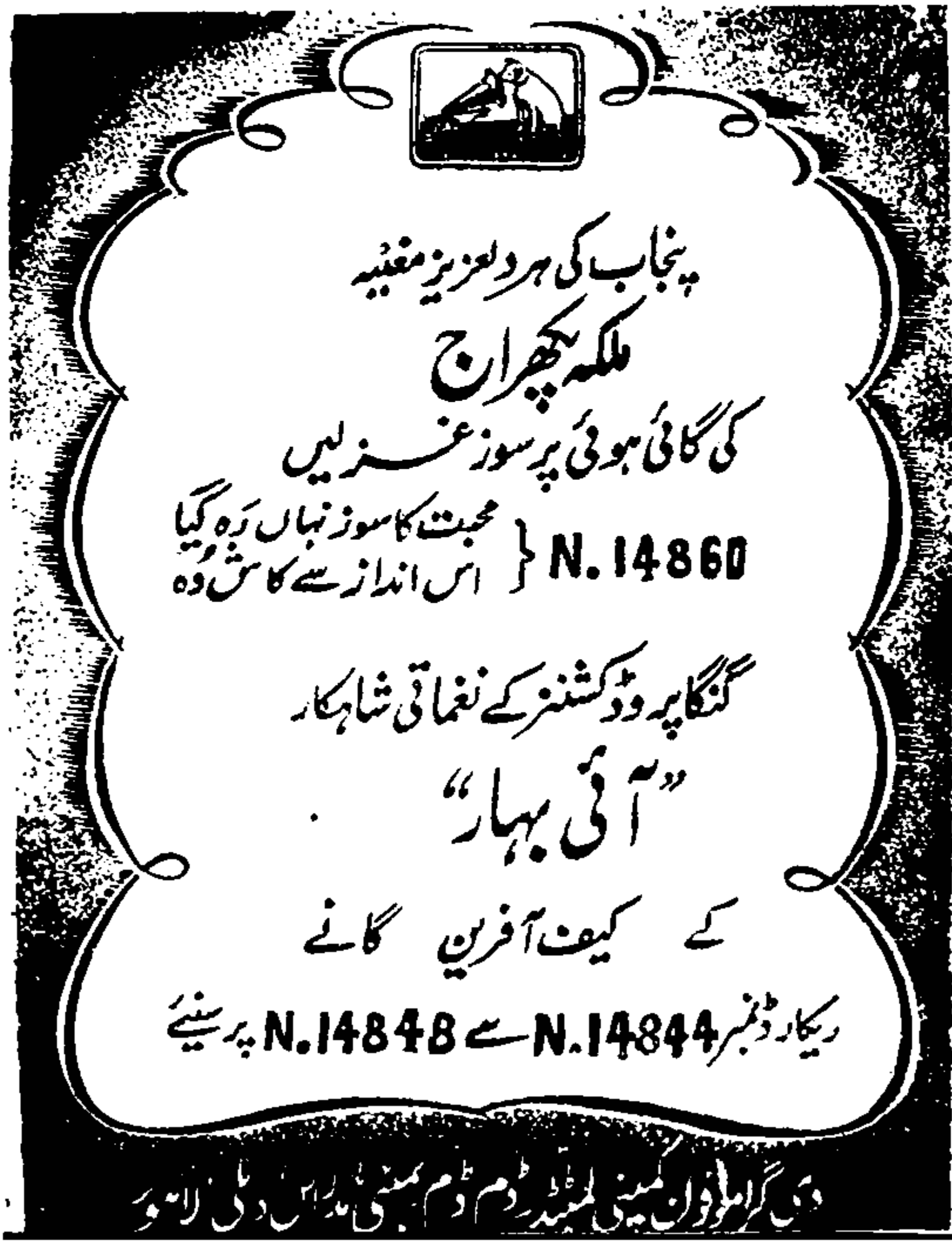

www.taemeernews.com

اُردو کے نوجوان صاحبِ طرز شاعر

احمد ندیم قاسمی

کی دس برس کی نظموں اور غزلوں کا

ضخیم انتخاب

جلال و جمال

نئی اُردو شاعری میں ایک نئی چونکا دینے والی آواز، ایک اچھوتے اور دلآویز اندازِ بیان اور ایک جمیل اور جامع اسلوبِ نگارش کا مرقع ہے۔ ندیم دورِ جدید کے حقائق سے پوری طرح شناسا ہونے کے باوجود اس عظیم حقیقت کو کبھی نہیں بھولتا کہ شاعر دربارِ جمالیات کی صدرِ اعظم ہے۔ وہ ایک حساس اور خودنگر شاعر ہے، وہ ذات اور کائنات کے ازلی و ابدی رابطے کا عرفان رکھتا ہے۔ ہیئت کے لحاظ سے اُس نے قدیم و جدید کا ایک خوشگوار امتزاج اپنایا ہے اور موضوع کے ضمن میں وہ متنوع حیثیت کا مالک ہے۔ ایک کسان شاعر، ایک رومانی شاعر، ایک فلسفی شاعر، کہ دو سالہ محنتوں کا نچوڑ پڑھیے، اور اردو شاعری کے عروج اور بلندی کو سراہیے۔

(زیرِ طبع)

کرشن چندر

اپنے فن کے پردے پر چند اور تصویریں اُبھارتا ہے

ہندوستان کا محبوب، منفرد، مجتہد اور مسلمہ فن کار

کرشن چندر

تین غنڈے

پیش کرتا ہے

اور اس میں ہندوستانی سماج کی نئی ذہنی تحریکوں، نئے فکری ہنگاموں، نئے دکھوں اور غموں، نئی چیخوں اور کراہوں اور نئی تہذیبی کروٹوں کو اپنے فن کے مخصوص لب و لہجہ میں بیان کرتا ہے ___ وہ مخصوص لب و لہجہ جو آپ کی روح میں رچ چکا ہے

(زیرِ طبع)

نیا ادارہ لاہور

www.taemeernews.com

سویرا

- ہندوستان کے ترقی پسند فنکاروں کا نمائندہ اور تخلیقی آرٹ پیش کرتا ہے
- فلم، ادب، آرٹ اور معاشی مسائل کا نئے انداز سے تجزیہ کرتا ہے
- ماضی، حال اور مستقبل میں ایک ادبی تسلسل قائم کرتا ہے
- اشاعتی حسن کے تخلیقی پہلوؤں کا پیش رو ہے
- انسانی ارتقا پر بہترین مطالعے پیش کرتا ہے

☆

- سیاست، سائنس، فلسفہ اور نفسیات پر مثالی اور افادی کتابیں پیش کرتا ہے
- جدید تر حسن طباعت کے پختہ کار اور باسلیقہ ماہرین پر مشتمل ہے
- ہندوستان کی ذہنی ترقی میں سنگ میل کا مرتبہ رکھتا ہے
- بلند پایہ، معیاری اور تاریخ ساز تصانیف پیش کرتا ہے
- خلاق، مستند اور مسلمہ ادیبوں کا ممتاز ادارہ ہے

نیا ادارہ

مطبوعہ رپن پریس، لاہور